اُردُو

سہ ماہی

اردو

جلد ۴۸ شمارہ ۱، ۲

سنہ ۱۹۷۲ء

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی - ۱

مجلسِ ادارت

جناب اختر حسین (ہلال پاکستان)، صدر

ڈاکٹر ممتاز حسن

ڈاکٹر نذیر احمد

جناب سید حسام الدین راشدی

پروفیسر سید وقار عظیم

ادارہ تحریر: جمیل الدین عالی مشفق خواجہ

طابع: انجمن پریس لارنس روڈ، کراچی

ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی

قیمت سالانہ: پندرہ روپے

قیمت فی پرچہ: چار روپے

شمارہ بابت: جنوری تا جون ۱۹۶۲ء

فہرست

استاد کمال الدین بہزاد	عبدالرحمٰن چغتائی	۱
واجد علی شاہ (۲)	مرزا علی اظہر برلاس	۶۹
عندلیب شادانی	نظیر صدیقی	۱۱۳
اردو ادب اکیسویں صدی میں	سید محمد تقی	۱۵۱
اردو کے ان پڑھ شاعر (۳)	مرزا فدا علی خنجر	۱۵۷

مسلسل مضامین

شاہانِ اودھ کے کتب خانے	ترجمہ و مرتبہ: محمد اکرام چغتائی	۳۴-۱۷
گلِ رعنا		
عکس نسخۂ سید وصی احمد بلگرامی	مرتبہ: سید قدرت نقوی	۶۲-۸۸
سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں	مزمل لیسین	۳۲-۶۴

مجموعی صفحات: ۳۰۰

○

سرورق

عمل بہزاد

استاد کمال الدین بہزاد

عبد الرحمن چغتائی

"استاد بہزاد کو معمر اور صاحب ریش چہرے بنانے میں جو کمال حاصل ہے وہ اس کے جوان سال چہروں میں نظر نہیں آتا۔ برعکس اس کے شاہ مظفر جوان سال چہرے بنانے میں کمال رکھتا ہے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی ورنہ اسے شہرتِ دوام حاصل ہوتی۔ اس کی شہرت کا آفتاب ابھی طلوع ہی ہوا تھا کہ ظالم موت نے اس کو آلیا۔"

جس طرح استاد بہزاد کو اپنے فن کی رو سے ایک غیر فانی مقام حاصل ہے۔ بابر کے ان الفاظ کو اسی صورت شہرتِ دوام نصیب ہے۔ آل تیمور کا یہ ہونہار فرزند ایک سربراہ مملکت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نڈر سپہ سالار بھی تھا۔ علما فضلا اور فن کاروں کی موجودگی کے باعث اس کا دربار بھی سلطان حسین مرزا اور شاہ طہماسپ کے درباروں سے کسی صورت کم نہ تھا۔ زندگی کے جان لیوا لمحات اور مہمات کے دوران بھی روح کی بالیدگی اور تسکین کی خاطر جمالیاتی اور روحانی تقاضوں سے ہم کنار نظر آتا ہے۔ کبھی باغات لگانے میں اور کبھی ان کی طرح بندی کرنے میں مصروف ہے تو کبھی قلعے اور محلات کی تعمیرات سے متعلق مہندس اور معماروں کو ہدایات دے رہا ہے۔ کبھی شاعروں اور موسیقاروں کے جھرمٹ میں دریاؤں اور چشموں کے کنارے بیٹھا مجالس قائم کرنے میں پیش پیش ہے۔ کبھی محاذ جنگ پر احکامات جاری کرتا نظر آتا ہے۔ وہ ایک جید عالم اور مورخ بھی تھا۔ صاحب نظر، ہنر پرور، ہنر شناس اور نقاد بھی تھا۔ شاعر بے مثل تھا۔ ترکی اور فارسی دونوں میں شعر کہتا تھا۔ فن انشا میں طرز خاص کا موجد تھا۔ علم فقہ پر اس نے ایک معرکہ آرا کتاب لکھی ہے خوش خطی اور موسیقی میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ مصوری اور نقاشی میں بھی دست رس تھی۔ تزک بابری اس کی خود نوشت سوانح عمری موجود ہے جس کا شمار آج بھی دنیا کی بہترین علمی ادبی اور تاریخی کتابوں

میں ہوتا ہے، اس وقت کے تہذیب و تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات و اطوار، رسم و رواج اور بود و باش پر بہترین تنقید کی ہے۔ وہ اکیس سال کی عمر میں کابل فتح کر کے تخت پر متمکن ہوا۔ جب ہندوستان فتح کیا ہے تو یہاں کے علوم و فنون، صنعت و حرفت، قوانین اور طرز حکومت وغیرہ کا حال اس خوبی سے لکھا ہے کہ آج تک کوئی مورخ اور سیاح بھی بیان نہیں کر سکا۔

بہزاد ایرانی مصوری میں ایک مستند روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایرانی مصوری کی تاریخ لکھتے اور بیان کرتے وقت اس کے نام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ایرانی مصوری کی تاریخ بہزاد کے نام کے بغیر مکمل کہی جا سکتی ہے۔ قبل از اسلام ساسانیوں کی شاہانہ سرپرستی کی بدولت فنون لطیفہ اور ہر قسم کی صنعت و حرفت درجہ کمال کو پہنچ چکی تھی لیکن جب ایران میں اسلام کا دور دورہ ہوا تو ایرانی فنون پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اسلامی دور میں ایران میں صنعت و حرفت اور علوم و فنون نے جو ترقی کی ہے وہ آگے چل کر ایک مستقل صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ امویوں اور عباسیوں کے زمانے میں جو تصویریں محلات اور مسجدوں میں بنائی گئی ہیں وہ شاندار مستقل فن کی صورت میں تھیں۔ خاص طور پر اموی خلیفہ ولید کا قصر عمدہ تصویروں سے مزین تھا۔ شام میں قصر الحائر الغربی کے کھنڈروں میں آبی رنگوں میں بنی ہوئی تصاویر پائی گئی ہیں۔ عباسی عہد میں ایرانی اثرات کا ثبوت ہمیں سامرا میں ایک محل کی تصویروں میں بھی ملتا ہے۔ اگرچہ ان میں ساسانی اثرات موجود ہیں۔ مگر محل کا چوبی کام خالص اسلامی طرز کا ہے اور نیشاپور میں جو تصاویر دریافت ہوئی ہیں ان میں عباسی اثرات نمایاں طور پر واضح ہیں۔

ساسانی، عباسی، منگول، غزنوی اور ایلخانی سب سلطنتیں اپنے اپنے دور میں بڑی حد تک مصوری میں دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ امیر تیمور صاحب قران جو خود ایلخانی حکمرانوں کا جانشین تھا اس نے فتوحات کے ساتھ ساتھ علوم و فنون اور صنعت و حرفت پر خاص توجہ دی جب اس نے تبریز اور بغداد کو فتح کیا تو علما، فضلا اور ماہرین علوم و فنون کو اکٹھا کر کے اپنے دارالحکومت سمرقند لے گیا۔ تیمور کے عہد اور سمرقند اسکول کی کوئی ایسی کتاب نہیں ملتی جس کا ذکر مصوری کے تحت مستقل طور پر کیا جا سکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس دور میں ایک مصور شاہنامے کے کچھ اوراق آج بھی مختلف عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ یہ شاہنامہ کبھی مسٹر N. DENOTTE کی ملکیت رہا ہے۔ شاہنامے کے علاوہ تیمور کے زمانے کی ایک اور خاص مصور کتاب خواجو کرمانی کا دیوان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسے بغداد اسکول کے مصوروں کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

امیر تیمور کے بعد اس کے لائق فرزند اور جانشین شاہ رخ مرزا کا دور آتا ہے جس نے دارالحکومت سمرقند سے تبدیل کر کے ہرات کو پایہ تخت بنایا تھا۔ شاہ رخ کے عہد سے ایرانی مصوری کا اصل دور شروع ہوتا ہے۔ شاہ رخ مرزا کے ہونہار اور لائق فائق فرزند بایسنقر مرزا کی سرپرستی میں باقاعدہ کتاب خانے اور نگار خانے قائم ہوئے۔ مرزا شاہ رخ کے نگار خانے میں بے شمار نقاش، خطاط، مصور، صحاف، خوشنویس اور تذہیب نگار کام کرتے تھے۔ استاد خلیل مرزا شاہ رخی، میر شاہی سبزواری، استاد روح اللہ میرک نقاش خراسانی، استاد پیر سید احمد تبریزی، استاد منصور، شاہ مظفر کے والد اور استاد مولانا ولی کا نام خاص طور سے ملتا ہے۔ ان کے علاوہ حاجی بابا جو طراحی اور نقاشی میں یگانۂ روزگار تھے اور ان کے بھائی شیخ احمد باکمال مصوروں میں شامل تھے۔ استاد حاجی بابا ہاتھ سے دائرہ اور نیم دائرہ اس خوبی سے کھینچتے تھے کہ پرکار کے مانند ہوتا تھا۔ کیا مجال جو اس میں بال برابر بھی فرق ہو۔ ان کے علاوہ بایسنقر کے تصویر خانے سے مولانا جنید، استاد حسام الدین اور کئی دیگر باکمال مصور اور خطاط وابستہ تھے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا بایسنقر کے زمانے میں مصوروں کی توجہ اور ذہانت اس رزمیہ داستان شاہ نامہ کو مصور کرنے ہی پر مرکوز رہی چنانچہ وہ شاہ نامہ جو شہزادہ محمد کی نسبت سے مشہور ہے، اسی عہد کی پیداوار ہے۔

ہرات کے علاوہ اس زمانے میں تیموری دبستان مصوری کو شیراز میں بھی عروج حاصل تھا۔ جہاں شاہ رخ کے دوسرے بیٹے سلطان ابراہیم مرزا کی حکومت تھی۔ اس دور میں شاہ نامہ اور خمسۂ نظامی کے مصور نسخے بھی تیار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سعدی کی گلستان، بوستان اور دیگر متصوفانہ مثنویات کو مصور کیا گیا ہے۔

امیر تیمور گورگان، شاہ رخ مرزا، بایسنقر مرزا، سلطان ابراہیم مرزا اور الغ بیگ اور ابوسعید مرزا کے بعد جب سلطنت مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی خاندان تیمور کے ہونہار لائق فائق فرزند ابوالغازی سلطان حسین مرزا ابن منصور بن بایقرا کے ہاتھوں میں آئی ہے تو ایرانی مصوری کا زریں عہد شروع ہوا ہے۔ سلطان حسین مرزا محض ایک جری سپاہی یا دلیر فوجی ہی نہ تھا، وہ عالم فاضل علم دوست اور معارف پرور سلطان بھی تھا۔ بے نظیر صاحبِ فراست، قابلِ ستائش مدبر اور دانشمند بھی تھا۔ عدل گستر، رعیت پرور، اخلاق حمیدہ اور اطوار پسندیدہ کا پیکر تھا۔ خود صاحبِ دیوان شاعر اور ادیب تھا۔ اس کے عہد میں علما، فضلا کے علاوہ کئی ہزار طالب علم تعلیم و تدریس میں مصروف تھے۔ ان سب کو بادشاہ کی طرف سے وظائف اور امداد ملتی تھی۔ سلطان حسین مرزا سلطان الغ بیگ کا پروردہ تھا۔ اس کے

فرزند عبداللطیف کی موت کے بعد سلطان ابوسعید مرزا بن سلطان محمد بن میراں شاہ نے اس کو قید کر لیا تھا لیکن یہ قید سے فرار ہو کر ابوالقاسم بابر مرزا سے جا ملا اور پھر ۸۶۲ھ ہجری میں گورگان کے پایۂ تخت استرآباد پر قابض ہو گیا۔ جہاں سے ایک سال بعد سلطان ابوسعید مرزا نے گورگان، استرآباد، مازندران کو دوبارہ فتح کر کے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ اس نے ۱۰ رمضان المبارک ۸۷۳ھ ہجری کو باقاعدہ تاج پوشی کر کے دربار منعقد کیا اور ابوالغازی سلطان حسین مرزا کے لقب سے ملقب ہوا۔ سلطان حسین مرزا نے ۴۰ سال تک حکمرانی کی ہے، اس کا عہد ایک طویل ترین عہد حکومت ہے جس کو امن و امان کا عہد کہا جاتا ہے۔ اس نے ستر سال کی عمر پائی اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۲ - ۹۱۱ ہجری کو انتقال کیا۔

سلطان حسین مرزا کا عہد جو امن و امان کا عہد تھا اور اس دربار کو جو اعلیٰ، ادبی اہمیت حاصل تھی، اس کا باعث اس کا وزیر باتدبیر نظام الدولہ بن میر علی شیر نوائی تھا۔ جو علما، فضلا، خطاطوں، مصوروں، نقاش، صحافوں اور تذہیب نگاروں کا مربی و سرپرست تھا۔ میر علی شیر نوائی کی زندگی علم دوستی، معارف پروری کی غیر فانی مثال ہے اور امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ علم دوست مردم شناس، معارف نواز، بے مثال فہم و فراست کا مالک، میر علی شیر نوائی خود یگانۂ روزگار تھا۔ سلطان اور وزیر کی رفاقت ہی سے دربار ہرات کو شہرت، عزت اور امتیاز حاصل تھا میر علی شیر نوائی سلطان حسین مرزا کا بچپن کا ساتھی اور ہم عصر تھا۔ دونوں ہم مکتب، ہم خیال، ایک ساتھ پڑھے اور بڑھے تھے۔ دونوں کے اشتراک سے دربار کی رونق اور توقیر قائم تھی۔ مہرداری، امارت اور وزارت پر میر علی شیر تا دمِ زیست فائز رہا۔ اس کا زمانہ باعث صد افتخار ہے۔ وہ لیاقت، شرافت، اوصاف حمیدہ شفقت اور رفاقت کا مجسمہ تھا۔ سخاوت اور تواضع اس کا فطری خاصہ تھا۔ اس کی ہنر پروری اور سرپرستی کے باعث سیکڑوں علما، فضلا، مصور، خطاط اور تذہیب نگار اور دوسرے صنّاع دور دراز سے آکر دربار ہرات میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ خود علم و فضل کا بحر بیکراں تھا۔ اسے ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ شعر اور نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ ترکی میں نوائی اور فارسی میں فانی تخلص کرتا تھا۔ شعر اور نثر میں کئی کتابوں کا مصنف ہوا ہے۔ "مسلمان پینٹنگ" میں موسیو بلوشے نے ایک ایسا عکس شائع کیا ہے جس پر اس کی ۲۹ تصنیفات کے نام مرقوم ہیں۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد ترکی میں اس جیسی کسی نے شاعری نہیں کی۔ فارسی میں دیوان حافظ کا جواب لکھا تھا۔ تحفۃ بحر الابرار

خواجہ خسرو کے بعد اس جیسا کسی نے نہیں کہا۔ ترکی میں تین دیوان اور فارسی میں ایک دیوان موجود ہے تذکرۃ الاولیا بھی ترکی میں لکھا تھا۔ اس کی کتاب مجالس النفائس اس کے عہد کے شعرا، فضلا اور فن کاروں کا تذکرہ ہے۔ تمام علما، فضلا جو علم و فضل کے آفتاب تھے میر علی شیر کے ہم عصر اور ہم مکتب تھے۔ ان میں بیشتر دربار سے منسلک تھے متعدد شاعر اور تاریخ داں تھے۔ مورخ اور مبصر تھے۔ حسین واعظ کاشفی جنھوں نے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ کیا ہے، اخوند میر مشہور تاریخ حبیب السیر کے مولف، دولت شاہ سمرقندی تذکرۃ شعرا کے مصنف، مولانا جامی افضل ترین شاعر تھے۔ ان کے علاوہ مولانا سیفی، مولانا آصفی، مولانا ہلالی مولانا قرامی شیرازی اور مولانا قبولی جیسے لاتعداد شعرا سب میر علی شیر نوائی کے پروردہ تھے۔ اس زمانے کی نقاشی۔ تصویرکشی۔ تعمیر سازی۔ کاشی گری۔ میناکاری۔ کتاب سازی۔ خطاطی۔ قالین سازی۔ موسیقی غرض تمام علوم و فنون اور صنعت و حرفت پر نظر ڈالی جائے تو ہر ایک صنعت میر علی شیر نوائی کی نوازشات اور التفات شاہانہ کی مرہون منت معلوم ہو گی۔ بہزاد، آقا میرک، شاہ مظفر، قاسم علی، سلطان محمد ملا یوسف، مقصود، مولانا درویش کے علاوہ مولانا شمس، مولانا سلطان علی مشہدی، مولانا جعفر تبریزی سلطان محمد نور، سلطان محمد خنداں، علی الکاتب، مجنون، مولانا یاری، استاد قل محمد نقاش، مولانا عبدالصمد رنگ کار، مولانا شیر علی خطاط کے باعث یہ عہد انتہائی عروج پر تھا۔

مرزا شاہ رخ، بایسنقر مرزا، الغ بیگ، سلطان ابو سعید اور سلطان حسین مرزا کی ہنر پروری اور سرپرستی کی بدولت ہرات سال ہا سال تک علوم و فنون اور ثقافت کا مرکز رہا۔ اس میں سلطان حسین مرزا نے ۴۰ سال مستقل اور پرامن حکومت کی ہے۔ سلطان حسین مرزا اور اس کے وزیر باتدبیر میر علی شیر نوائی کی سرپرستی اور قدردانی کی بنا پر ہرات بغداد، قرطبہ، قاہرہ اور دوسرے اسلامی مراکز کا ہم پلہ بن گیا تھا۔ نظام الملک طوسی، جعفر برمکی، اسمٰعیل بن عباد، رشید الدین فضل اللہ، ابوالفضل اور خواجہ محمود گاواں جیسے نامور وزرائے اسلام کی مانند میر علی شیر نوائی کا نام بھی تہذیب و تمدن اور کارہائے نمایاں سے زندۂ جاوید ہے۔

بابر جو خود بھی ترکی اور فارسی کا شاعر تھا، مصنف اور مورخ بھی تھا، سلطان حسین مرزا کے خصائل اور عادات پر ہمیشہ نکتہ سنج رہا ہے، لیکن اس کے دور حکومت کو ایک درخشاں دور حکومت اور شاندار عہد سے منسوب کرتا ہے اور ان تمام اسباب کو سلطان حسین مرزا کے وزیر میر علی شیر نوائی کی حکمت

عملی معارف پروری، دریا دلی اور سرپرستی کا سبب قرار دیتا ہے۔ اس نے میر علی شیر نوائی کی علمی ادبی استعداد کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔ وہ میر علی شیر نوائی کو تمام خراسان کے علما، فضلا، شعرا اور مصنفین سے بلند تر سمجھتا ہے۔ اس کو بہترین موسیقی دان اور ماہر شطرنج گردانتا ہے۔ بابر لکھتا ہے "تمام خراسان میں علی شیر کا اس قدر احترام اور عزت ہے کہ لوگ پروانہ وار اس پر نثار ہیں۔ وہ عظمت اور قابلیت کی بنا پر دنیائے علم و ادب میں ایک واحد شخصیت ہے۔ اس کی قدر دانی اور سرپرستی کی بنا پر ہرات میں بے شمار ادیب، شاعر، مورخ، انشا پرداز، خطاط اور مصور، مہندس، حساب دان، شطرنج باز، موسیقی نواز، پہلوان، تذہیب نگار اور کمانی گر غرض ہر صنعت و حرفت اور ہر نوع کے باکمال لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ اس کے دور وزارت میں کسی قسم کی خواجگی یا دربازی خلش کو دخل نہیں۔ اس کا عہد ہر خدشے اور دار و گیر سے پاک ہے"۔

مولانا جامی، اخوندمیر، سلطان حسین مرزا اور میر علی شیر نوائی اور بہزاد ہمعصر ہوتے ہیں۔ یہ سب ایک ساتھ پلے اور ابھرے تھے۔ مولانا اخوندمیر کے بیان کے مطابق بہزاد ابتدا ہی سے دربار ہرات سے منسلک رہا ہے۔ سلطان حسین مرزا کے دربار سے پیشتر سلطان ابوسعید مرزا کے دربار سے وابستہ تھا۔ کیونکہ اس کے استاد روح اللہ میرک نقاش خراسانی اور پیر سید احمد تبریزی بایسنغر کے بعد سلطان ابوسعید مرزا کے دربار سے منسلک ہوئے تھے۔ جب سلطان حسین مرزا کی وفات کے بعد اس کی اولاد کی نالائقی اور نااہلی کے سبب حکومت جاتی رہی اور ہرات پر شیبک خاں (شیبانی خاں) کا قبضہ ہوا تو بہزاد، سلطان علی مشہدی اور دیگر تمام خطاط اور فن کار شیبانی خاں کی سرپرستی سے سرفراز ہوئے اور جب پھر شاہ اسمٰعیل صفوی نے شیبانی خان پر فتح پائی تو تمام علما، فضلا اور فن کار جن میں اخوندمیر، استاد بہزاد، سلطان علی مشہدی جیسے یگانہ روزگار شامل ہیں، شاہ اسمٰعیل کے سایۂ عاطفت میں تبریز میں منتقل ہو گئے۔ مولانا اخوندمیر نے اپنے انشائیے میں بہزاد کی تعریف میں لکھا ہے:

نقاشِ ازل کشاد چون چہرہ مہر
آراست مرقعی ز اوراق سپہر
تصویر در آں نمود خیر نگ و قلم
چندیں صنم جلوہ گر روشن چہر

اخوندمیر نے استاد بہزاد کو نادر العصر، یگانۂ روزگار، بے عدیل، بے نظیر، صورت ساز، چہرہ کشا، نقاش اور مصور کہا ہے۔ اور اس کے فن کو حیرت افزائے زمانہ قرار دیا ہے۔ اس کی رائے میں بہزاد کی مہارت فن اور کمال کے آگے مانی کی شہرت جو زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی تھی ماند پڑ گئی ہے اور گزشتہ مصوروں کے شاہ کار گرد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے نزدیک اس کے معجز نما قلم کی باریکی، نازکی اور پرکاری تمام مصوروں کے فن پر سبقت لے گئی ہے۔ اس کی دانست میں بہزاد کی ہنروری اور کارکردگی نے کردار اور اشکال میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ اخوندمیر نے لکھا ہے:

مانی قلم خجستہ آثار — نیکو شیم حمیدہ اطوار
استاد ہنروران عالم — در فن ہنروری مسلّم
بہزاد یگانۂ زمانہ — مانی بہ زبان او فسانہ
لطف قلمش ز اوستادی — جاں دادہ بصورت جمادی
در وقت طبع موشگافست — ویں حرف نہ از سر گزافست
تکمیل مہارتش درایں فن — باور اگرت بیاید از من
بکشای نظر ز روی انصاف — بنگر صور بدیع اوصاف
کآراست جمال ایں صحایف — افزود کمال ایں طرایف
در صورت خط و حسن تصویر — زینسان ورقی نیافت تحریر

مولانا اخوندمیر کے علاوہ گلستان ہنر میں قاضی احمد کا یہ بیان بھی قابل پذیرائی ہے کہ اگر مانی بہزاد کے زمانے میں ہوتا تو وہ بھی بہزاد کی نقالی کرتا۔

ڈاکٹر مارٹن پہلا مغربی مصنف ہے جس نے دیانتداری اور خلوص سے مسلمانوں کی مصوری اور فنون لطیفہ پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ اس نے مسلمانوں کی مصوری پر ایک جامع اور مبسوط کتاب لکھی ہے۔ اس کی تصنیف سے مسلمانوں کی مصوری کے وہ رجحانات اور تقاضے ابھر آتے ہیں جو مسلمان مصوروں نے اپنے فن پاروں اور شاہ کاروں میں اپنی اپنی انفرادیت اور کمال فن سے انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹر مارٹن نے دنیا بھر کے مبصرین اور ناقدین کو مسلمانوں کی مصوری کے اوصاف اور کمال سے روشناس ہونے کی دعوت دی ہے۔ اس نے ایرانی اور مغل مصوری

پر ناقدانہ طور پر غور و خوض کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے فنی اور جمالیاتی نظریوں سے کماحقہٗ بہرہ مند ہوا ہے۔ اس نے اپنی جامع تصنیف میں استاد بہزاد کے صحیح مقام کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے استاد بہزاد کے شاگردوں اور اس کے ہم عصر فنکاروں پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس کی تصنیف میں ان مرقع جات اور تصاویر پر جو استاد بہزاد سے منسوب یا بہزاد کے عہد سے متعلق ہیں، قابل قدر تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ یہ ڈاکٹر مارٹن کی بے لاگ تنقید اور تبصرے کا نتیجہ ہے کہ مستشرقین دیگر دنیا کی مصوری کے پھلنے پھولنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مصوری کو نظر انداز نہیں کر سکے اور وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ استاد بہزاد اور دیگر ایرانی مصوروں کا کیا مقام ہے۔ موسیو بلوشے' ڈاکٹر آرنلڈ' ڈاکٹر کونل' ڈاکٹر بنیون' مسٹر ڈائمنڈ' مسٹر ولکسن اور بیسل گرے جیسے مستشرقین اور نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ استاد بہزاد نے ایرانی مصوری کو جو عظمت اور توقیر بخشی ہے اور جو صحیح مقام اور ہم آہنگی عطا کی وہ اسی کا حصہ ہے۔ استاد بہزاد کی مصوری' ایرانی اور اسلامی قدروں کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔

مغربی مستشرقین میں سے کوئی ہو اس کی تحریر کا مرکزی خیال ایک ہی ہوتا ہے چنانچہ پہلے نے جو کچھ کہا ہوتا ہے دوسرا اور تیسرا بھی وہی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی صورت مشرقی مصوری خصوصیت سے مسلمانوں کی مصوری کو یورپین اثرات کا مرہون منت ثابت کیا جائے۔ لیکن ڈاکٹر مارٹن واحد مبصر ہے جس نے ایک بار بھی کوشش نہیں کی کہ مسلمانوں کی مصوری کو یورپین مصوری کی خوشہ چیں یا نقل ثابت کیا جائے۔ ذہنی طور پر یورپین مصنفین کو اسلام کے اس عروج سے تلخی بغض ہے جب وہ بحر و بر پر' شرق اور غرب' شمال اور جنوب پر قابض تھا۔

محمود غزنوی ہو یا چنگیز' تیمور ہو یا سلطان حسین مرزا' بابر ہو یا بہزاد۔ جہانگیر ہو یا اورنگ زیب تاج محل ہو یا جامع مسجد۔ ان سب کے متعلق ایک قسم کی ذہنی خلش پیدا کرنا ان لوگوں کی سرشت میں داخل ہے۔ یہ خلفشار اس قدر کثرت سے پھیلایا گیا ہے کہ ذہین سے ذہین دماغ بھی اس کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ استاد بہزاد سے متعلق جس قدر بھی مواد ملتا ہے اس میں جگہ جگہ اختلافات موجود ہیں۔ مسلمانوں کے علوم و فنون کو کبھی رومن' کبھی یونانی' کبھی بازنطینی' کبھی ساسانی اور کبھی چینی اثرات خوشہ چیں ثابت کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ فاتح قوموں کے نظریات فاتحانہ ہوتے ہیں اور ان پر ان کی

مملکت اور حکمت کی چھاپ ہوتی ہے اور یہ نظریات مشترکہ نظام حیات، مساوات اور تعمیر ملت کے عملی اسباب ہوتے ہیں ــــ بہزاد کی شخصیت اور اس کی فن کارانہ عظمت کا اعتراف کچھ اس لیے بھی کیا جاتا ہے کہ اس کی شخصیت اس کے سرپرستوں کی مدح سرائی اور شان امارت کے بیان میں دب کر رہ جاتی ہے۔ ان بیانات سے اکثر اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اگر سلطان حسین مرزا، شاہ اسمٰعیل صفوی، میر علی شیر نوائی اور شاہ طہماسپ اس کی سرپرستی نہ کرتے تو بہزاد بہزاد نہ ہوتا لیکن اگر آج ریمبراں، ریفائل اور لینارڈو ڈیونچی کا نام ان کے شاہ کاروں کے باعث زندہ ہے تو بہزاد کا نام بھی اس کے فن پاروں سے تابندہ ہے۔ بہزاد کے کمال فن سے اس کے سرپرستوں کی شخصیت اور عظمت قائم ہے یہ حقیقت ہے کہ مشرق والوں کو ان کی فنی عظمت اور فن پاروں سے روشناس کرانے میں مغرب کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے فن کاروں سے متعلق جو کچھ دنیا تک پہنچا ہے وہ ان ہی مغربی نقادوں اور مبصروں کی تحقیق اور کاوشوں کا نتیجہ ہے اور ہم اس بات کے لیے ان کے ممنون احسان ہیں۔ چنانچہ بہزاد سے متعلق انگریز، جرمن، فرانسیسی اور امریکی محققین میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس کا نام فخر سے نہ لیا جا سکے۔

بہزاد کو سلطان حسین مرزا اور اس کے وزیر باتدبیر میر علی شیر نوائی کی محبت اور رفاقت لڑکپن ہی سے حاصل تھی۔ جوانی میں ہنر پروری سرپرستی اور نظر التفات میسر آ گئی تھی۔ وہ فن کی منزلیں طے کرتا ہوا عمر کے آخری ایام تک فن کے عروج اور کمال سے ہم کنار رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اٹلی میں دور احیا کے مبصروں نے مصوری کو بام عروج پر پہنچا رکھا تھا۔ ان میں ریفائل پیش پیش تھا۔ ڈاکٹر مارٹن نے بہزاد کو مشرق کا ریفائل کہا ہے اور اس کو پندرھویں صدی کے اطالوی اور جرمن استادوں کے دوش بدوش کھڑا ہونے کی عزت بخشی ہے۔ ریفائل بھی شاہ مظفر کی مانند بھرپور جوانی میں اپنے استاد کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا۔ یورپین نقادوں کا خیال ہے اگر ریفائل کا استاد ریفائل کی زندگی میں فوت ہو جاتا تو اس کے فن پاروں کی کچھ اور نوعیت ہوتی کیونکہ ریفائل کا استاد اس کی موت کے بعد طویل مدت تک زندہ رہا مگر وہ کوئی ایسا شاہ کار نہیں چھوڑ سکا جو اسے اپنے شاگرد پر فوقیت حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔ ریفائل کی بین الاقوامی شہرت اور اس کی فنی داستان اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ وہ مرد فن اگر اپنے استاد کی عمر کے لگ بھگ زندگی پاتا تو مصور ہونے کی حیثیت میں وہ اپنے مذہب

اور عقائد کی خدمت کرنے کے علاوہ دنیائے مصوری کو لاتعداد غیرفانی شاہکار دے جاتا۔

جوان مرگی کے باوجود ریفائل نے اپنا فنی سرمایہ بہت بڑی تعداد میں چھوڑا ہے۔ برعکس اس کے بہزاد کا فنی سرمایہ چند مصور کتب اور چند متفرق تصاویر تک محدود ہے، مگر اس کی شہرت اور عظمت اور انفرادیت ریفائل سے کسی صورت کم نہیں۔ ریفائل کا فن اٹھارھویں صدی تک مذہبی آرٹ کے مداحوں اور اس کا اتباع کرنے والوں پر بہت بڑی طرح اثر انداز رہا ہے۔ مگر بہزاد کا فن اور اس کی طرز نگارش صدیوں تک ایران اور ہندوستان کے فن پر اور لوگوں پر سایہ فگن رہے ہیں۔ بابر سے لے کر اورنگ زیب تک ہر دور اور ہر سلطنت میں اس کی طرز نگارش کا اتباع اور سرپرستی ہوتی رہی ہے۔ سلطان اور وزیر، امیر اور غریب ہر ایک بہزاد کی تصاویر کو حاصل کرتے میں ایک عزت اور فخر محسوس کرتا رہا ہے۔ اگرچہ مشہور فرانسیسی مصور انگرے کی مقبولیت کا راز ریفائل زدہ ہونے میں مضمر ہے مگر انیسویں صدی میں فن مطلق اور فن محض کے موجدوں نے ریفائل اور اس کے ہم عصر مصوروں کے فن اور ان کی مقبولیت اور تقدس کو کم کرنے میں کسی قسم کا دریغ نہیں کیا۔ ان فرانسیسی فن کاروں کا آرٹ ریفائل اور اس دور کے تمام فن کاروں کے خلاف ایک ردّ عمل تھا اور ایک فنی جہاد تھا۔ تجریدی مصوروں کو اپنے اس جہاد میں پوری پوری فتح حاصل ہوئی ہے۔ وہ مذہبی مصوری کی اہمیت اور قدر و قیمت کم کرنے میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی ذہانت اور جرأت سے مذہبی مصوری کو ختم کر دیا ہے۔ اب ریفائل اور کسی دوسرے مذہبی آرٹسٹ کی تقلید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دور احیاء کے مصوروں میں بیشتر مصور ایسے ہیں جن کی مصوری میں خد و خال، لباس اور بناوٹ کی رو سے مشرقیت پوری طرح اجاگر ہے اور یہ اس لیے بھی ہے کہ ان کا پس منظر انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت تھا۔ عیسائیت کا منبع مشرق ہے اور مرکزی خیال، صاحب انجیل اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم خود مشرقی تھے۔ اور ان کا زمانہ، ماحول، افراد اور کردار تمام کے تمام مشرقی تھے۔ ان کا رشتہ ازل سے مشرق سے استوار تھا۔ ان کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، چال، ڈھال لباس غرض ہر چیز مشرقی تھی۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ مغرب نے مشرق کا دشمن ازلی ہوتے ہوئے ایک مشرقی کو اپنا پیغمبر، راہبر اور نجات دہندہ اور خدا تسلیم کر رکھا ہے۔

جیسا کہ تاریخ بتلاتی ہے ریفائل اور بہزاد ایک دوسرے کے ہم عصر تھے اور یہ محض عصری رشتہ تھا۔ دونوں میں جغرافیائی فاصلے کی رو سے بہت بڑی مدفاصل موجود تھی اور پھر نظریۂ فن اور طرز نگارش مختلف تھی۔ طریقۂ کار مختلف تھا۔ عقاید مختلف تھے۔ مذہب الگ الگ تھے۔ باوجود ان تمام باتوں کے دونوں کی مقبولیت اور شہرت قابل رشک ہے۔ دونوں کو سلطانان وقت کی سرپرستی اور رفاقت حاصل تھی۔ عقاید اور مذہب کو نظر انداز کرتے ہوئے بہزاد اور ریفائل کے فن کو سمجھنے کے لیے مطالعہ اور ذوق نظر کی ضرورت ہے۔ اس بات کا اندازہ کرنے کی ضرورت ہے کہ انھوں نے اپنے شعور اور فنی انہماک سے اپنی تہذیبی قدروں کو کیا کچھ دیا ہے۔ پندرھویں صدی میں مشرق و مغرب کے جمالیاتی نظریوں کو اور فن کو ہیئت اور مواد کی رو سے ایک ترازو میں تولا جا سکتا ہے مگر بعض تنقید نگاروں نے ریفائل اور بہزاد کے فنی شعور کو ناپنے کی بے سود کوشش کی ہے۔ بہزاد کے اکثر شاہکار ریفائل کی اکثر تصویروں کے چہرے اور ہاتھ کی لمبائی اور چوڑائی سے بھی چھوٹے ہیں جن دیواروں پر ریفائل کی تصاویر آویزاں ہیں اگر وہاں استاد بہزاد کا کوئی شاہکار آویزاں کر دیا جائے تو وہ خوش اعتقادی اور فن کاری کی عظمت سے ناپا جا سکتا ہے نہ کہ سائنز کی رو سے۔

دور احیا کے مصوروں نے شبیہ سازی کو اس درجہ عروج پر پہنچا دیا تھا کہ خواہ مخواہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ ان کی شبیہیں زندہ جاوید نظر آتی ہیں۔ منہ بولتی جان معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے فرد اور افراد کے فرق کو ایک اسلوب بخشا ہے۔ ان مصوروں کو عورت کا رنگ روپ، خدوخال بانکپن اور نزاکت مصور کرنے میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ان میں اس قدر کمال موجود ہے کہ اچھی شبیہ انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر کردار اپنے کردار سے پہچانا جاتا ہے اور پھر ہر آرٹسٹ کے لیے ایک مونا لیزا ہی نہ تھی، ان کے لیے کئی چہرے انتخاب کے منتظر نظر آتے ہیں۔ شبیہ نگاری کی صنف کو سنوارنے اور ایشیا تک پہنچانے میں مغربی مصوروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام، ان کی والدہ ماجدہ، ان کے حواریین کی سیکڑوں نہیں ہزاروں شبیہیں بنا ڈالی ہوں گی۔ ہر آرٹسٹ نے مقدس چہروں کے بنانے میں بھی کسی قسم کا دریغ نہیں کیا۔ لیکن لیونارڈو ڈونچی۔ ڈیورر ریفائل اور بال بین، روبن اور ریمبراں نے زندہ کرداروں کی شبیہیں بنانے میں بھی بہت بہت بڑا کمال دکھایا ہے۔ اکثر نے اپنے کرداروں کو بطور ماڈل استعمال کیا ہے اور ان اشخاص نے

خود بخوشی اپنے آپ کو پیش کیا ہے ۔ برعکس اس کے امیر تیمور سلطان حسین مرزا۔ شیبانی خاں' میر علی شیر نوائی' طہماسپ اور شاہ عباس جو حکمرانی اور شہنشاہی کا مظہر ہیں' کہا نہیں جا سکتا کہ انھوں نے بھی اپنے آپ کو بطور ماڈل پیش کیا تھا یا ان کی شبیہیں خود مصوروں کے خلوص اور عقیدت کا اظہار ہیں۔

شبیہ نگاری مصوری کی ایک اہم صنف ہے جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اس کے لیے ہمارے پاس کوئی جواز بھی نہیں ہے۔ آج سے کوئی چھ ہزار سال پیشتر مصر میں اس کی ابتدا ہوئی ہے مصر میں سنگ تراشوں اور مصوروں نے فراعنۂ مصر کے جو بت تراشے ہیں اور جو شبیہیں بنائی ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے سنگ تراشوں اور مصوروں کو کس قدر کمال حاصل تھا۔

سلطان محمد دوئم فاتح قسطنطنیہ کی وہ کامیاب شبیہ جو نامور مصور جینٹائل بلینی نے بنائی ہے' اب نیشنل گیلری لندن کی ملکیت ہے کسی مشرقی سلطان کی یہ ایک ایسی شبیہ ہے جو ایک یورپین مصور نے بنائی ہے ۔صورت سازی کی صنف میں یہ شبیہ ایک لاثانی شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے اس کا مقام بہت بلند ہے۔ تصویر روغنی رنگوں میں بنی ہے ۔

مشرق میں چینی اور جاپانی مصوروں نے اس صنف میں اپنے دور کی مشہور و معروف شخصیتوں کو رنگوں اور خطوں میں بنانے میں اپنے کمال کا ثبوت دیا ہے۔ چینی مصوروں نے تو ہر عہد میں اس صنف کو بہت عروج پر پہنچا دیا تھا جس سے ان کی انفرادیت اور قدرت کا پتا چلتا ہے' چنانچہ چینی مصوری میں قبلائی خاں اور دیگر چینی سلطانوں کی جو شبیہیں ملتی ہیں وہ خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ جاپانی مصوروں نے اس صنف کو اپنے مخصوص اسلوب ووڈکٹ میں بڑی کامیابی سے نبھایا ہے - یہ جاپانی ووڈکٹ انیسویں صدی میں فرانسیسی مصوروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے ہیں۔ آج ایرانی اور ترکی شبیہ سازی کو چینی شبیہ سازی کا خوشہ چیں کہا جاتا ہے۔

ہالینڈ کے عظیم ترین مصور ریمبراں نے خود اپنی اور یورپین اشخاص کی غیر فانی شبیہوں کے علاوہ مشرقی مدبرین اور بزرگ اشخاص کی کئی شبیہیں بنائی ہیں۔ جن کے خدوخال اور جاہ و جلال کے آگے آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس زمانے کے قابل ذکر اور پر عظمت اشخاص ہوں جن کو ریمبراں نے شبیہ بنانے کے لیے منتخب کیا۔ مگر اس بات کا صدمہ ہوتا ہے کہ ان کے صحیح حسب و نسب اور نام و نشان سے آج کسی کو بھی واقفیت حاصل نہیں' ورنہ سلطان محمد دوئم فاتح قسطنطنیہ کی مانند آج ہم ان

کے نام و نسب سے بھی روشناس ہو سکتے۔

بابر نے ہندوستان میں مصوری کا جو سنگ بنیاد رکھا تھا اس کی اولاد کی توجہ اور ذوق نظر سے اس پر شاندار عمارت کھڑی ہو گئی اور شبیہ نگاری مغل مصوری کا طرۂ امتیاز بن گئی ہے۔ ابوالفضل نے بیان کیا ہے کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ اکبر کی توجہ اور حکم سے ایک کتاب سترگ تیار ہوئی تھی جس میں زندوں کو حیات جاوید اور مردوں کو نئی زندگی عطا ہوئی۔ یہ کتاب دربار اکبری کے خاص خاص اشخاص امرا، وزرا اور علما و فضلا کی شبیہوں سے تیار ہوئی تھی۔ ہم عصروں کے علاوہ جو لوگ گزر چکے تھے ان کی شبیہیں بھی مصوروں نے اپنے اپنے خیال اور یادداشت سے بنائی تھیں۔ مرور ایام سے یہ کتاب ناپید ہو چکی ہے۔ اب ابوالفضل کے الفاظ ہی الفاظ رہ گئے ہیں۔ شبیہ نگاری اکبر کے زمانے ہی سے شروع ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اکبر کی اولاد، جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں تو اس صنف نے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ جہانگیر اور شاہ جہاں کے مصوروں میں خاص خاص مصوروں کو یہ کمال حاصل تھا۔ ان میں نادر الزماں ابوالحسن، نادر سمرقندی، فرخ بیگ قلماق، بچتر، منوہر، گوردھن، بھگوتی اور بشن داس تھے۔ آخر الذکر کو جہانگیر نے اس غرض سے ایران بھیجا تھا کہ وہ شاہ عباس اور اس کے امرا اور وزرا کی شبیہیں بنا کر لائے۔ اس کے علاوہ ہونہار، انوپ چتر، میر ہاشم، صادق وغیرہ بھی اس صنف میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ مغلوں کی شبیہ نگاری اور صورت سازی کا اعتراف ہے کہ ریمبران اور سر جوشا رینلڈ جیسے فخر زمانہ شبیہ ساز مغلوں کی شبیہ نگاری کے قائل اور مداح ہیں۔ ریمبران نے تو خود مغلوں کی شبیہ نگاری کی نقلیں بنائی ہیں جو آج بھی یورپ کے عجائب خانوں کی زینت ہیں اور ان کی موجودگی پر فخر کیا جاتا ہے۔

مغلوں کی شبیہ نگاری سے متعلق شاعر بیدل نے چہار عنصر میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ اگرچہ یہ انحطاط کے زمانے کی بات ہے مگر قابل توجہ ضرور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد کا نام اور شہرت کس درجہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتے تھے۔

بیدل ۱۰۵۴ھ میں مردم خیز شہر عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ شاہ جہاں کا عہد تھا۔ جوانی اورنگ زیب کے زمانے میں گزری۔ اکتالیس برس کی عمر میں چہار عنصر لکھی۔ یہ کتاب نثر میں ہے، اس میں زیادہ تر اولیا کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ نثر و نظم میں چند ذاتی غم کے واقعات

لکھے ہیں۔ ان میں ایک واقعہ اس کی اپنی تصویر سے متعلق ہے جسے مصور انوپ چتر نے بنایا تھا۔ مصور انوپ چتر نے شاہ جہاں اور اورنگ زیب کا زمانہ دیکھا ہے اور دربار سے منسلک رہا ہے اور وہ مرزا بیدل کے عقیدت مندوں میں سے تھا۔ اس کے متعلق مرزا نے لکھا ہے۔

"روح مانی بکسوت غبار رنگ گرد تلاش می گردید۔ و فطرت بہزاد در پردۂ ناموس انفعال تردستش می کشید"۔

مرزا کے متعلق انوپ چتر کے ورق دل پر نقش عقیدت اس قدر گہرا تھا کہ اکثر التماس کیا کرتا تھا کہ اجازت ہو تو آپ کے روئے مبارک کی شبیہ بناؤں تاکہ صفحۂ روزگار پہ یادگار رہے۔ بیدل اس کی بات کو ہمیشہ عقیدت سمجھ کر ٹال دیا کرتا تھا اس لیے کہ طبیعت ادھر نہیں آتی تھی۔ ایک روز اس نے بہت منت و سماجت سے کام لیا تو اس خیال سے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو رضامندی ظاہر کردی۔ چنانچہ بیدل لکھتا ہے کہ جب اس نے میری شبیہ بنائی تو میں خود حیران و ششدر رہ گیا کہ یہ میں ہوں۔ اور جس نے بھی دیکھا اس نے تعجب کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس نے ایک باکمال شبیہ بنائی تھی۔ جو بھی دیکھتا تھا مصور کے کمال اور ہنر کی داد دیتا تھا۔

ایرانی مصوری میں مصور کتب کی تعداد لاتعداد ہے مگر شبیہ سازی کی رو سے اس کا سرمایہ بہت محدود ہے۔ ایرانی ہوں یا مغل، یورپین نقادان سے متعلق ہمیشہ ایک حربہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہر ایسی شبیہ کو جسے شبیہ کہا جا سکے شک و شبہ کی نظر سے دیکھیں گے اور ناظر کی نظر میں بھی تشکیک پیدا کرنے کی غرض سے کبھی تو اسے یورپین اثرات کی حامل قرار دے کر نظر انداز کرنے کی کوشش کریں گے اور کبھی رنگ آمیزی اور طراحی میں نقائص ثابت کرنے کی سعی فرمائیں گے اور یہ ان کا مخصوص ہتھیار ہے۔ شبیہ نگاری کی رو سے استاد بہزاد کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا سرمایہ بہت محدود ہے لیکن پھر بھی جو کچھ ہے اس کا اپنا مقام ہے۔ استاد کی ہر اس تصویر کو جس پر شبیہ ہونے کا گمان ہو سکتا ہے ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کبھی تو اس کو نقل کہہ کر نظر انداز کیا جاتا ہے اور کبھی یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ شبیہ سازی بہزاد کے بس کا روگ نہیں۔ یہ بات استاد بہزاد کی شبیہ نگاری تک محدود نہیں اس کے مرقع جات کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لوگ کسی حد تک راستی پر بھی ہیں۔ اس لیے کہ بہزاد کے نام سے بے شمار تصاویر اور مرقع جات خواہ مخواہ منسوب کر دیے گئے ہیں اور

ایسا کرنے میں قدیم اشیا فروخت کرنے والوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے جنھوں نے اپنے ذاتی فائدے کے لیے غیر مصدقہ تصاویر اور مرقع جات استاد کے نام سے منسوب کر دیے ہیں۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ غیر مصدقہ تصاویر اور مرقع جات سے سرکاری اور غیر سرکاری عجائب گھر اور ذاتی مجموعے بھرے پڑے ہیں۔ یورپ میں بھی یہ حربہ قدیم اشیا فروخت کرنے والوں کا پیدا کردہ ہے جو انھوں نے مشہور قدیم یورپین مصوروں کے شاہکاروں کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔

بہزاد اور اس سے بیشتر شبیہ سازی کی صنعت میں ایرانی مصوروں کا کوئی خاص کارنامہ موجود نہیں ہے ہاں ایرانی شبیہ نگاری میں استاد بہزاد کا اپنا مقام ضرور ہے۔ سلطان محمد آقا میرک اور آقا رضا کا مقام الگ حیثیت رکھتا ہے۔ بہزاد کے بعد رضا عباسی اور اس کے ہم عصروں نے اس صنف میں قابل قدر خدمت انجام دی ہے جس کے لیے رضا عباسی' اس کے شاگرد اور ہم عصر ستائش کے مستحق ہیں۔ ان مصوروں نے اپنی توجہ کا مرکز مرقعوں سے ہٹا کر صورت سازی اور چہرہ کشائی کی جانب موڑ دیا تھا۔ اس دور میں مردوں کے علاوہ عورتوں کی شبیہ بنانے پر بھی توجہ دی گئی ہے یہاں تک کہ انھوں نے عورتوں کی برہنہ شبیہیں بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس دور میں ان مصوروں نے سلطانانِ وقت کے علاوہ وزیر' ولی عہد' امیر امرا' درویش' اولیا اللہ اور عام آدمیوں کی بھی شبیہیں بنائی ہیں یہاں تک کہ انھوں نے گزرے ہوئے اشخاص کی بھی شبیہیں بنائی ہیں۔ انھوں نے ہم عصر مصوروں اور اپنے استادوں کی شبیہیں بھی بنائی ہیں۔ سلطان محمد' میرک' محمدی' بہزاد کی شبیہیں ملتی ہیں۔ اور تو اور رضا عباسی کے شاگرد معین نے اپنے استاد رضا عباسی کی جو شبیہ بنائی ہے۔ وہ ایک مشہور زمانہ شبیہ سمجھی جاتی ہے۔

سلطان حسین مرزا' مرزا شیبانی خان' امیر علی شیر نوائی' شاہ طہماسپ اور شاہ عباس کی شبیہیں دیکھ کر ہم ایک عجیب و غریب ردعمل سے دوچار ہوتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ مشرقی فن کاروں نے بھی اس صنف کی اہمیت کو سمجھا تھا اور محسوس کیا تھا اور یہ اس بات کا باعث ہے کہ آج ہم ان سلطانوں' وزیروں' بہزادوں اور ہنر پروروں سے روشناس ہیں جنھوں نے ایرانی مصوری کو اور فن کاروں کو پھلنے پھولنے کے خاطر خواہ اسباب مہیا کیے تھے۔

بہزاد کا قلم صورت سازی میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اگرچہ استاد کی شبیہیں لاتعداد نہیں ہیں۔ مگر اس نے سلاطین' وزرا' امرا اور خاص خاص اشخاص کی جو شبیہیں بنائی ہیں وہ ایرانی مصوری میں خاص

مقام رکھتی ہیں۔ اس نے ہر شخص کی شبیہ کو اس کی شخصیت میں گم ہو کر بنایا ہے۔ اس کا سلطان سلطان معلوم ہوتا ہے، دربان دربان اور درویش درویش کے روپ میں نظر آتا ہے اور قیدی قیدی دکھائی دیتا ہے۔ غرض ہر شبیہ اپنے کردار کا آئینہ ہے جس میں کردار کی جبلت، صورت اور سیرت دیکھی جا سکتی ہے۔ شبیہ نگاری پر جو قدرت بہزاد کو حاصل تھی اس کا اعتراف دوست دشمن سب نے کیا ہے۔ چنانچہ بابر کے الفاظ اس کی شبیہ نگاری پر پوری پوری روشنی ڈالتے ہیں جو اس نے شاہ مظفر اور بہزاد کا مقابلہ کرتے میں استعمال کیے ہیں۔ بہزاد کو انسانی صورت سازی ہی پر قدرت حاصل نہ تھی اس نے چرند، پرند، اونٹ گھوڑے، بھیڑ بکری، پھل پھول، شاخ اور درخت، ایوان اور محل غرض جس چیز کو بنایا ہے اس میں زندگی ڈال دی ہے۔ اس میں پختگی، نفاست، نزاکت، جسامت اور تناسب موجود ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ عورت اور مرد، اونٹ اور گھوڑے، چرند پرند، ایوان اور محل کچھ کا کچھ دکھائی دینے لگیں۔ میرا خیال ہے ایرانی مصوری میں بہزاد پہلا مصور ہے جس نے ہم عصر شخصیتوں کو صورت سازی میں ڈھالا ہے کیونکہ اس کے پیش روؤں میں ہم کسی مصور کا نام وثوق سے نہیں لے سکتے جس نے کسی سلطان، وزیر یا امیر کی شبیہ بنائی ہو اور جہاں تک مطالعے کا تعلق ہے آج تک کسی سلطان، وزیر یا امیر کی کوئی ایسی شبیہ دیکھنے میں نہیں جس کو ہم یقین سے کہہ سکیں کہ یہ فلاں سلطان، وزیر یا امیر کی شبیہ ہے اور بہزاد سے پیشتر فلاں مصور نے بنائی ہے

بہزاد کو اکثر ماہرین فن اور نقاد شبیہ ساز مصور تسلیم کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتے کیونکہ سلطان حسین مرزا اور شیبانی خاں کی جو شبیہیں بہزاد نے بنائی ہیں وہ بعض نقادوں کے نزدیک غیر فانی کارنامہ ہیں۔ ڈاکٹر مارٹن کی بلند نظری اور منصفانہ رائے بہزاد کو مشہور یورپین مصورین ڈیورر میم لنگ اور ہال بین کے ہم پلہ تسلیم کرتی ہے۔ ڈاکٹر مارٹن سلطان حسین مرزا کی شبیہ کو تو ہال بین (HOL.BEIN) کی مشہور شبیہ ہنری ہشتم سے بھی بہتر خیال کرتا ہے اور وہ اس بات کو خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ بہزاد نے ہال بین سے سو سال پہلے سلطان حسین کی شبیہ بنائی ہے اس لیے کہ ہر اچھی شبیہ کو یورپین نقاد یورپین اثرات کا ممنون احسان ثابت کرنے میں کسی قسم کا دریغ نہیں کرتے۔ اس کا خیال ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یورپین اثرات ثابت کرنے والوں کو موقع مل جاتا کہ بہزاد نے ہال بین کی نقل کی ہے۔ اس کا اپنا خیال ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ ہال بین نے بہزاد کی نقل کی ہے تو کچھ مغالطہ نہیں ہوگا۔

بعض یورپین نقاد سلطان حسین مرزا اور شیبانی خاں کی شبیہوں کو بہزاد کی تخلیقات ماننے میں پس و پیش سے بھی کام لیتے ہیں کبھی ان کے رنگوں پر کبھی ان کی ترتیب و ترکیب اور استخواں بندی پر قسم قسم کی نکتہ چینی کرتے ہیں اور کبھی ان پر بہزاد کے دستخط کرنے کے طریق کو موضوع بحث بنالیں گے اور کبھی شیبانی خاں کے معاملے میں نفرت اور دشمنی کو باعث قرار دیں گے۔ سلطان حسین مرزا اور شیبانی خاں کی شبیہیں اس لیے بھی قابل توجہ ہیں کہ وہ اس کے مربی اور سرپرست ہوئے ہیں۔ بہزاد نے سلطان حسین مرزا کی شبیہ نہایت خلوص اور عقیدت سے بنائی ہے۔ سلطان کے لباس خدوخال اور بیٹھک پر خاص توجہ دی ہے۔ سرخ، زرد، سنہری، اور لاجورد تمام رنگ نہایت قدرت اور چابکدستی سے استعمال کیے ہیں۔ سلطان کی پگڑی، طرزِ لباس تمام چیزیں ایک ایشیائی سلطان کے شایانِ شان ہیں اور وقت اور زمانے کو ظاہر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سلطان خاص طور پر مصور کے سامنے بطور ماڈل کے بیٹھا ہے۔ سلطان کی یہ شبیہ اس کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے جب وہ سلطنت حکومت اور سلطانی کی رو سے عروج پر تھا۔ بعض کا خیال ہے اس میں چینی اثرات پائے جاتے ہیں۔ سلطان حسین مرزا کی شبیہ بنانے میں بہزاد نے خلوص اور عقیدت کے علاوہ کمالِ فن بھی دکھایا ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ اس کا مربی اور سرپرست تھا۔ اس لیے بھی کہ بہزاد اس کے سایۂ عاطفت میں پلا بڑھا اور جوان ہوا تھا۔ زندگی کا ایک بہترین حصہ اس کی رفاقت اور شفقت میں گزرا تھا۔ لیکن جو شبیہ اس نے شیبک خاں یعنی شیبانی خاں کی بنائی ہے وہ فن کی رو سے سلطان حسین کی شبیہ سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے سلطان کی شبیہ پر فوقیت رکھتی ہے اس لیے کہ اس میں شیبانی خاں کی بربریت اور جنگ جویانہ سرشت کی پوری پوری عکاسی کی گئی ہے۔ شیبانی خاں نے سلطان حسین کے بعد اس کی اولاد سے اس کی نالائقی، نااتفاقی، بے ہمتی کے باعث حکومت چھین لی تھی۔ یہ دودمان چنگیز کا آخری فرماں روا باوجود بربریت، خوں ریزی اور دہشت پسندی کے ہنرپروری اور ہنرشناسی میں تیموریوں سے کسی صورت کم نہ تھا۔ بہزاد، آقا میرک، سلطان علی مشہدی۔ جیسے خطاط اور مصور، اخوند میر جیسے عالم فاضل اور تاریخ داں سب کے سب اس کے دربار سے منسلک رہے ہیں۔ چنانچہ شیبانی خاں کی جو شبیہ بہزاد نے بنائی ہے وہ اس عہدِ حکومت کی یادگار ہے جو شیبانی خاں کو ہرات میں حاصل ہوا تھا۔ بابر اور سام مرزا، شیبانی خاں کی ہنرپروری اور صاحب نظری پر برابر کے رطب اللسان ہیں۔ ان کا خیال ہے۔

کروہ شاعری، مصوری اور خطاطی میں قابلِ قدر دخل رکھتا تھا۔ اب وہ بہزاد کا آقا اور سرپرست تھا۔ اس نے بہزاد کو کسی قسم کا رنج یا دکھ نہیں پہنچایا۔ باوجود بربریت، خون ریزی اور دہشت کے اس کے زمانے میں بہزاد اور دیگر فن کاروں کو ویسا ہی امن و سکون میسر تھا جیسا سلطان حسین مرزا کے طویل دورِ حکومت میں۔ جو مصور اور خطاط سلطان حسین مرزا کے زمانے میں برسرپیکار رہتے اس کے عہد میں بھی برسرپیکار رہے ہیں۔ بعض یورپین نقادوں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ بہزاد شیبانی خاں سے نفرت کرتا تھا یا ناپسند کرتا تھا کیونکہ اس نے اس کے آقا اور سرپرست کی سلطنت چھین لی تھی۔ اگر وہ ناپسند کرتا ہوتا تو لازمی تھا کہ وہ دوسروں کی طرح ہرات چھوڑ کر بخارا یا شیراز چلا جاتا۔ یا کہیں اور روپوش ہو جاتا مگر بہزاد نے شیبانی خاں کو بھی ویسا ہی اپنا آقا اور سرپرست تسلیم کیا ہے جیسا کہ سلطان حسین مرزا کو۔

بہزاد نے اپنے سرپرستوں کی شبیہ بنانے میں جرات، خلوص اور عقیدت کا ثبوت دیا ہے۔ سلطان حسین اور شیبانی خاں کی شبیہوں میں جلال اور جمال دونوں پائے جاتے ہیں۔ دونوں میں ایک اعجاز موجود ہے۔ سلطان حسین، شیبانی خاں، بغدادی درویش، مراد آق قونیلو، کچکینا بہادر اور دوسروں کی شبیہات بہزاد کے کمال اور کردار کا مظہر ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ سلطان حسین اور شیبانی خاں کی شبیہوں پر بہزاد کے جو دستخط موجود ہیں، وہ بعد کی اختراع ہیں۔ میرا خیال ہے یہ بہزاد ہی کے ہیں۔ اگر اس کے نہیں ہیں تو یہ ضرور ہے کہ اس کے عہد کے ضرور ہیں۔ اس لیے کہ بہزاد کی دوسری تصاویر پر بھی اس طرز میں کیے ہوئے دستخط عموماً دیکھنے میں آتے ہیں اور پھر بہزاد خود نقاش مصور اور مہندس بھی تھا، ہوسکتا ہے وہ خطاط بھی ہو۔ یہ بات کسی حد تک اس لیے بھی قابلِ قبول ہے کہ اس زمانے میں فن کار تمام فنون میں دست رس رکھتے تھے جس کا ثبوت اکثر فن کاروں کے فن کے مطالعے سے ہمارے ملاحظے میں آتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر مارٹن ایک ایسا مغربی نقاد ہے جس نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ کسی مرقعے یا تصویر میں یا کسی شبیہ میں یورپین اثرات پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ بعض یورپین نقادوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایشیائی مصوری کی تعریف میں دو تین صفحات لکھنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سب کمال یورپین اثرات کا ہے۔ حالانکہ مشرقی مصوری کا دائرہ کار اور ماحول اس قدر محدود تھا کہ ان مصوروں کو یورپین تصاویر سے مستفید ہونے کا موقع ہی میسر نہیں آسکتا تھا اور پھر مغربی مصوری کے

مراکز میں اور مشرقی مراکز میں اس قدر دوری اور حد فاصل تھی کہ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی مصور اس سے اثر انداز ہو سکیں گے۔

بہزاد نے سلطان حسین کی شبیہ کو مختلف صورتوں میں بنایا ہے مگر غور طلب بات یہ ہے کہ اکثر سبز رنگ میں بنایا ہے۔ قاہرہ والی بوستاں میں بھی سلطان حسین کو سبز رنگ ہی کے لبادے میں بنایا ہے ویسے بھی یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ بہزاد نے اپنی تصاویر میں سبز رنگ کو دوسرے رنگوں پر فوقیت دی ہے شاید اس لیے کہ کائنات کو سبز رنگ نظر افروز اور دلکش بناتا ہے اور یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مصور رنگوں کے نفسیاتی رموز سے پوری طرح واقف تھا۔ جس طرح ایک ماہر موسیقار جب اپنی ہنرمندی اور قدرت سے سروں میں امتزاج، ہم آہنگی تنوع اور پختگی کے باعث نغمے میں غنائیت پیدا کرتا ہے تو اس کا نغمہ سامعین کے لیے توجہ اور کشش کا باعث ہوتا ہے۔ اسی طرح بہزاد نے رنگوں کے امتزاج میں ہنرمندی اور قدرت سے ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ اس کے رنگوں میں ایک تنوع اور پختگی، انفرادیت اور توانائی پائی جاتی ہے۔ امتزاج، انفرادیت، ہم آہنگی اور تنوع ہی سے کسی تخلیق میں حقیقت اور موزونیت پیدا ہوتی ہے۔ تصویر میں جس قدر موزونیت ہوگی اسی حد تک اس میں حسن اور دلکشی پائی جائے گی اور وہ ناظر کی توجہ کا مرکز بنے گی۔ بہزاد نے بنیادی رنگ، زرد، سرخ اور نیلے کے امتزاج سے نہایت دلکش اور حسین نتائج پیدا کیے ہیں۔ اس نے اپنے امتزاج سے ایرانی مصوری کو نیا رنگ روپ اور نیا انداز بخشا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس کی جمالیاتی حس۔ غیر معمولی اور ترقی یافتہ تھی، اس کا ذوق نہایت شستہ اور لطیف تھا اس کا مشاہدہ وسیع اور گہرا تھا اس کی نقش کاری میں بلا کی شوخی اور اعجاز تھا اس کے فن کی سحر انگیزی اور سرور نے جاذبیت اور نظر افروزی کو زندگی عطا کی ہے۔ وہ ایک بلند مرتبہ فن کار تھا جس کا فن ہر زمانے اور ہر جگہ کے اہل ذوق اور اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کرتا رہے گا۔

سلطان حسین کی شبیہ میں سلطان کے ہاتھ میں پھول ہے۔ ایک اور شبیہ میں سلطان حسین کے ہاتھ میں پھول ہے جنٹائل بلینی نے سلطان محمد ثانی کی ایک دوسری شبیہ بنائی ہے، اس کے ہاتھ میں بھی پھول ہے۔ سلطان محمد ثانی کا ایک تمغا ہے، اس میں بھی سلطان کے ہاتھ میں پھول ہے۔ سلطان حسین کی مذکورہ بالا شبیہ کے علاوہ ایک نامکمل صورت بھی ملتی ہے جس میں لباس اور ہاتھوں میں کچھ

فرق موجود ہے اور اس میں کچھ حصہ نامکمل بھی چھوڑ دیا گیا ہے اور سیاہ قلم یعنی پنسل استعمال کی ہے معلوم ہوتا ہے اس کو بھی مکمل کرنے کا ارادہ تھا۔ یہ اس لیے بھی قابل توجہ ہے کہ اس سے ایرانی مصوّری کے طریقۂ کار پر روشنی پڑتی ہے اور اس بات کا پتا چلتا ہے کہ مصور اپنے کام کی ابتدا اور انتہا کیونکر کرتے تھے۔ اس نامکمل خاکے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی خاکے میں بہزاد نے چہرے ہاتھ اور سراپا کو کس طرح مکمل کیا ہے۔ یا تو یہ بہزاد کا پہلا خاکہ ہے یا یہ بعد میں نئی شبیہ بنانے کی خاطر ابتدا کی گئی ہے جو نامکمل رہ گئی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی شاگرد نے اس کی نقل بنانے کی کوشش کی ہو۔ مغربی مبصرین کا خیال ہے کہ ایرانی مصور چھوٹے ہاتھ اور انگلیاں بناتے تھے۔ برعکس اس کے بہزاد نے چینی مصوروں کی مانند لمبے ہاتھ اور لمبی انگلیاں بنائی ہیں۔ اس کے علاوہ بہزاد نے سلطان حسین مرزا کی ایک اور شبیہ بنائی ہے جس میں سلطان گھوڑے پر سوار ہے۔ یہ شبیہ بوسٹن میوزیم امریکہ میں موجود ہے۔ اسے مشہور آرمینی مصنف سکیپین نے بھی اپنی کتاب میں شائع کیا ہے۔ تصویر میں سوار اور گھوڑا بہزاد کی ہنرمندی اور قدرت کا ثبوت ہیں جو اسے طراحی پر حاصل تھی ـــــ بہزاد نے شیبانی خاں کی جو شبیہ بنائی ہے اس میں لبادہ ہلکے نیلے رنگ میں بنایا ہے اور زیریں کوٹ کو پھر سبز رنگ میں بنایا ہے اور پس منظر میں پھر سبز رنگ اور فرش کو سرخ بنایا ہے۔ شیبانی خاں کی پگڑی بھی سفید بنائی ہے اور کلاہ سرخ رنگ میں۔ سلطان حسین اور شیبانی خاں کی شبیہوں پر جو دستخط بہزاد کے ثبت ہیں ہوسکتا ہے کہ اس کے اپنے ہاتھ کے نہ ہوں اور ہوسکتا ہے ان کو کسی ہم عصر نقاش اور خطاط نے انجام دیا ہو۔ کیونکہ دونوں شبیہوں پر منقش دستخط خوش خط اور ایک جیسے ہی ہیں اور پھر سونے سے لکھ کر ان کے گرداگرد سیاہی سے تحریر کیا گیا ہے۔ تحریر سے میرا مطلب ہے کہ سنہری تحریر کے بعد سیاہی سے آوٹ لائن کی گئی ہے۔ دونوں نام ایک ہی قلم سے معلوم ہوتے ہیں۔ گویا دونوں کا کاتب بھی ایک ہی ہے۔ بہزاد کے دستخط مختلف تصاویر پر اور مرقع جات میں مختلف صورتوں میں پائے جاتے ہیں کسی پر کار اعلیٰ استاد بہزاد لکھا ہے۔ کسی پر کار بندہ بہزاد اور پھر کہیں صورۃ العبد بہزاد۔ کہیں فقیر نامراد بہزاد۔ کمترین بہزاد۔ مصور بہزاد اور کہیں قلم سیاہ نادر العصر استاد بہزاد اور پھر غلام بہزاد۔ بعمل السعید بہزاد۔ المذنب اصلح المہد بہزاد اور کہیں بہزاد سلطانی لکھتا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ بہزاد نے خود اپنے ہاتھ سے بہت کم تصاویر پر دستخط کیے ہیں اور یہی سبب ہے کہ آج ماہرین کو اصل تصاویر شناخت کرنے میں مشکلات پیش آرہی ہیں۔ ایک طور پر اس بات سے مصور کی بے نیازی پائی جاتی ہے۔ سلطان حسین کی شبیہ جو

مسٹر CARTIER کی ملکیت ہے اس پر "عمل حضرت استاد بہزاد" لکھا ہے اور شیبانی خاں کی شبیہ پر العبد بہزاد لکھا ہے اور مولانا عبداللہ ہاتفی کی تصویر پر عمل استاد بہزاد اور قاہرہ کی بوستان پر العبد بہزاد رقم ہے۔ اکثر تصاویر پر صرف بہزاد لکھا ہے چنانچہ کہا نہیں جا سکتا کہ ان میں سے خود استاد کے اپنے ہاتھ کے کون سے دستخط ہیں۔ بعض تصاویر اور مرقع جات کو نقادوں اور ماہرین کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے بہزاد کا تسلیم کر لیا گیا ہے اگرچہ ان پر بہزاد کے دستخط موجود نہیں ہیں اور بعض پر بہزاد کے لکھے ہونے کے باوجود ان کو بہزاد کا ماننے سے انکار کیا جاتا ہے۔ ایک اور شبیہ جو ڈاکٹر مارٹن نے اپنی کتاب میں نمبر ۸۹ پر ایک امیر کے نام سے دی ہے اس پر "بہزاد سلطانی" لکھا ہے۔ یہ شبیہ کسی حد تک بہزاد کی کہی جا سکتی ہے لیکن اس صفحے پر جو دوسری شبیہ دی ہے اس کو بھی بہزاد سے منسوب کیا گیا ہے۔ دراصل یہ بہزاد کی نہیں ہے۔ اس کے کسی شاگرد کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ بہزاد کے طرز نگارش میں انجام دی گئی ہے اس لیے اس پر شبہ کیا جاتا ہے کہ وہ بہزاد کی ہے۔ نیشنل لائبریری پیرس میں ایک شبیہ کسی نامعلوم درویش کی موجود ہے اس کو بھی بہزاد سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ شبیہ بغدادی درویش سے ملتی جلتی ہے۔ اس درویش کی بہت سی نقلیں دیکھنے میں آتی ہیں جن کو استاد محمود استاد معین الدین وغیرہ نے بھی بنایا ہے۔ بہزاد کی کئی ایسی شبیہیں ملتی ہیں جن کو اس کے شاگردوں نے بنایا اور نقل کیا ہے۔

بغدادی درویش کی شبیہ بغدادی درویش کے نام سے مشہور ہے یہ ضیاء ئل بلینی کی البم سے ہے سلطان حسین کی نامکمل شبیہ بھی ضیاء ئل بلینی کی البم سے ہے۔ سلطان حسین کی شبیہ جس کو بہزاد نے خود بھی نقل کیا ہے ڈاکٹر مارٹن کے مجموعے میں موجود ہے۔ ایک بڈھے آدمی کی شبیہ جو ریشم پر بنی ہے، ایک چینی بہادر کی شبیہ ایک اور درویش کی شبیہ۔ ایک ترکی شہزادے کی شبیہ، یہ بہزاد نے ضیاء ئل بلینی کی تصویر سے نقل کی ہے۔ ایک خاکہ سات آدمیوں کا جو نامکمل صورت میں ملتا ہے اور ان میں سے ایک تخت پر بیٹھا ہے اس پر استاد بہزاد کے دستخط ثبت ہیں، یہ خاکہ سلطان مراد کی البم سے ہے جو امپیریل لائبریری ویانا میں موجود ہے۔ ایک اور تصویر جس میں سلطان حسین گھوڑے پر سوار ہے اس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے اس میں بہزاد کے دستخط گھوڑے کی زین پر موجود ہیں۔ اسی طرح ایک اور خاکہ بھی ملتا ہے جس میں ایک تاتاری گھوڑے پر سوار ہے۔ ایک اور خاکہ جس میں دو شیر ہیں، اسی طرح کا ایک اور خاکہ ہے اس میں تین شیر بنائے گئے ہیں۔ ایک اور خاکہ شکار سے متعلق ہے۔ ایک اور خاکہ کسی نامعلوم شخص کا ہے، یہ بھی گھوڑے پر سوار ہے۔ ایک اور خاکہ ہے

جس میں ایک زخمی آدمی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ جا رہا ہے۔ یہ نیشنل لائبریری پیرس کی ملکیت ہے غرض اس قسم کے اور اس طرح کے تمام خاکے بہزاد سے منسوب ہیں۔ لیکن ان میں اس تاتاری کی شبیہ قابلِ ذکر ہے جس کو بہزاد نے عجیب و غریب سزا میں اور اس کے طریقۂ کار میں محبوس دکھایا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس قیدی کی اس طرح کی دس کے قریب مختلف شبیہیں ملتی ہیں جن کو مختلف مصوروں نے بنایا ہے چہرے کے خد و خال اور پگڑی کے پیچ و خم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آق قونیلو ترکمان خاندان کا آخری شہزادہ مراد ہے جس کو شاہ اسمٰعیل صفوی نے شرور کی جنگ میں قید کیا تھا۔ جب شاہ اسمٰعیل نے الوند قبیلہ آق قونیلو پر فتح پائی ہے اور تبریز اس کے قبضے میں آیا ہے تو اس قبیلے کے پیش روؤں کی قبروں کو کھدوا کر ان کی ہڈیوں کو جلا دیا ہے۔ یہ شہزادہ مراد اسی خاندان کا آخری شہزادہ تھا۔ قیدی کا ایک بازو لکڑی میں بندھا ہوا ہے، لکڑی غلیل نما بنائی گئی ہے جو قیدی کے بازو اور گردن دونوں کو جکڑے ہوئے ہے۔ زمانۂ قدیم میں تاتاریوں کے زمانے میں مجرم کو اسی طور سزا دی جاتی تھی۔ چنانچہ چنگیز خاں ابتدا میں مخالف قبیلے کے پنجے میں جب گرفتار ہوا ہے تو اس کو بھی اسی قسم کی لکڑی میں جکڑا گیا تھا چونکہ شہزادہ مراد کی شبیہ کی بہت سی نقلیں ملتی ہیں اس لیے ممکن ہے شاہ اسمٰعیل نے اس کی مختلف نقلیں بنوا کر اپنی قلمرو میں تشہیر کی غرض سے بھیجی ہوں۔ ان نقول کو ہم سلطان محمد، میرک یا استاد محمد سے منسوب نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں سے بیشتر بہزاد ہی سے منسوب ہیں مگر یہ یقینی بات ہے کہ یہ بہزاد کی نہیں ہیں، اس کے ہم عصروں یا شاگردوں کا کام ہے۔ ہاں ان میں بہزاد کی طرزِ نگارش کی چھاپ ضرور موجود ہے۔ ڈاکٹر مارٹن اور دیگر نقادوں کا خیال ہے کہ بوڈلین لائبریری میں اور وہ جو R. KOECHLIN کی ملکیت ہیں، وہ بہزاد کی ہیں۔ ان نقول میں ایک جو پیرس میں LOUVRE میں موجود ہے، اس پر فرخ بیگ قلماق کے دستخط ثبت ہیں، اس سے اس بات کا شک گزرتا ہے کہ جہانگیر نے جس طرح اپنے مصور نانہا سے بہزاد کی اونٹوں والی تصویر کی نقل بنوائی ہے اسی طرح کہیں فرخ بیگ نے اس تصویر کی نقل نہ بنوائی ہو۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس سے ملتی جلتی کئی تصویریں ملتی ہیں جو مختلف لوگوں کی ملکیت ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصوروں نے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اس مضمون کو اپنایا ہے۔ اسی طرح کی ایک اور تصویر ملتی ہے وہ بھی قیدی کی ہے، اس پر کسی کا نام وغیرہ نہیں ہے اور نہ معلوم ہے کہ یہ کون آدمی ہے۔ مگر یہ شہزادہ مراد سے مختلف ہے اور یہ تصویر ریشم پر بنی ہے اور مسٹر M. DOUCET کی ملکیت ہے جس میں چینی اثرات بڑی حد تک پائے جاتے ہیں۔ مصور نے اس کی ٹوپی عجیب لاابالی

انداز میں بنائی ہے۔

بہزاد کی شبیہ سازی میں اس درویش کی شبیہ سب پر سبقت رکھتی ہے جو بغدادی درویش کے نام سے مشہور ہے۔ اس شبیہ کو ڈاکٹر مارٹن، بیکیسن بے اور دوسرے نقادوں نے فخریہ طور پر اپنی اپنی کتابوں میں شائع کیا ہے۔ بغدادی درویش کے چہرے، آنکھوں اور ہونٹوں اور ہاتھوں میں جو تاثر بہزاد نے دکھایا ہے وہ بہزاد ہی کا حصہ ہے۔ دراصل شبیہ نگاری میں آنکھ، ناک، ہونٹ اور چہرے کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ ان کے اظہار ہی سے صاحب تصویر کی جبلت اور سرشت کا پتا چلتا ہے۔ صاحب تصویر کے تمام اوصاف اس کی آنکھوں، ہونٹ اور چہرے میں سمٹ کر آجاتے ہیں۔ ویسے بھی ایک سلطان ایک امیر اور عام آدمی اور درویش میں آنکھ، کان اور خد وخال کی رو سے نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مشرق میں عراق، بغداد، ایران اور پاکستان میں ایسے درویش مسجدوں اور خانقاہوں میں اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس درویش میں ایک فضیلت اور عظمت موجود ہے۔ درویش سجادہ نشین معلوم ہوتا ہے، اس میں تقدس پایا جاتا ہے۔ وہ ایک کمبل اوڑھے ہوئے ہے کمبل اوڑھے ہوئے درویش کا ناک نقشہ، چہرہ مہرہ مکمل طور پر بنایا گیا ہے۔ مصور چاہتا تو کمبل کی آڑ لے کر بعض حصوں کو نامکمل چھوڑ سکتا تھا لیکن اس نے فرار اختیار نہیں کیا۔ بھاری بھر کم لبادے کے اندر بھی تمام اعضا کے تناسب اور جسامت کا پورے طور پر اظہار کیا ہے۔ درویش ایک مجسمے کی صورت معلوم ہوتا ہے جسے کسی سنگتراش نے تراش کر رکھ دیا ہو۔ درویش کی شبیہ ساخت اور تکمیل کی رو سے اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ دراصل درویش ایک صوفی ایک اولیا اللہ کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں جب ایرانی مصوری ایک مخصوص طرز مصوری اور طرز نگارش کے دور سے گزر رہی تھی بہزاد نے شبیہ سازی کو بے مثال طریقے سے جذبات و اظہاریت سے مالامال کیا ہے۔ بعض کے نزدیک درویش کے ہاتھوں کی بناوٹ میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بہزاد ہمیشہ چینی مصوروں کی مانند بڑے ہاتھ اور انگلیاں بنانے کا موید تھا۔ مگر پورے طور پر درویش کی شبیہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے تصویر ہلکے نیلے سمرقندی کاغذ پر بنی ہے۔ شوخ اور سرخ رنگ میں بنائی گئی ہے۔ زیریں کوٹ کچھ شوخ ہے۔ ہونٹ اور چہرہ دیگر اعضا سے پوری پوری مناسبت رکھتے ہیں۔ نقش و نگار کے لحاظ سے تصویر ایک لوح کی مانند ہے اور اس لوح کے اوپر کے حصے میں سنہرے رنگ میں صورت درویش بغدادی

بعمل حضرت استاد بہزاد" لکھا ہے۔ اسی طرح ایک اور درویش کی شبیہ ہے جو ڈاکٹر مارٹن نے اپنی کتاب میں نمبر ۸ پر چھاپی ہے۔ اس کو ڈاکٹر مارٹن دعوے کے ساتھ بہزاد کی بتلاتا ہے۔ یہ تصویر نیشنل لائبریری پیرس میں موجود ہے۔ اس قسم کی درویشوں کی شبیہیں سلطان محمد، میرک اور معین الدین مصور نے بھی بنائی ہیں۔ ڈاکٹر مارٹن نے ان سب کو صفحہ ۸۰ پر اکٹھا چھاپ دیا ہے — بہزاد کی ایک اور درویش کی شبیہ ڈاکٹر مارٹن نے اپنی کتاب میں صفحہ ۹۱ پر چھاپی ہے۔ یہ چاروں طرف سے نقش ونگار اور اشعار سے مزین اور بہترین شبیہ ہے۔ میرے نزدیک اس درویش کی شبیہ بغدادی درویش کی شبیہ پر بھی سبقت رکھتی ہے۔ بغدادی درویش میں ہم ایک تقدس اور بزرگی پاتے ہیں، برعکس اس کے اس میں درویشیت اور قدرے مجذوبیت دکھائی دیتی ہے، اس کے چہرے میں اور بیٹھنے میں ایک تفکر اور سوشح پائی جاتی ہے۔ بغدادی درویش سامنے کے رخ بیٹھا ہے اور یہ یک رخی طرز میں بنایا گیا ہے۔ تمام درویشوں کی شبیہوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں تصوف نے لوگوں پر اپنا اثر ورسوخ خاصی حد تک جما رکھا تھا۔ یہ وہی درویش ہیں جو ایران اور بغداد میں حلقہ باندھ کر رقص درویشاں برپا کرتے تھے اور عرفان سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ان سے مصور بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس درویش کی شبیہ میں کچھ کچھ شیراز اسکول کا پرتو موجود ہے۔ درویشوں، فقیروں، امیروں، قیدیوں اور سواروں کی تصویروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصوروں نے پابندیٔ طرز ونگارش سے آزادہ روی اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ انھوں نے مختلف مضامین کو اپنایا ہے۔ انھوں نے آنے والوں کے لیے نئی نئی راہیں کھول دی ہیں اور اس طرز نگارش میں بہزاد سب سے پیش پیش ہے اور بہزاد کے شاگرد اور ہم عصر اس کا اتباع کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک نامعلوم شبیہ دیکھی جا سکتی ہے جو کسی امیر کی ہے، امیر باقاعدہ رائج الوقت ہتھیاروں سے لیس ہے۔ تلوار، تیر وکمان اور گولہ سب کچھ بنایا گیا ہے۔ سر پر سلطان حسین کے عہد کی پگڑی باندھ رکھی ہے اور ہاتھ میں پیالہ بھی ہے۔ پس منظر میں سیب کا درخت اپنی شاخیں پھیلائے پوری بہار پر ہے۔ یہ بوسٹن میوزم کی ملکیت ہے۔ ایک تصویر شیخ کینہ بہادر کی بھی ملتی ہے، اگرچہ اس پر بہزاد کے دستخط موجود نہیں ہیں لیکن یہ بہزاد کی معلوم ہوتی ہے۔ ایک اور شبیہ جو پگڑی کی وجہ سے شاہ طہماسپ کے عہد کو ظاہر کرتی ہے اس پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں۔ یہ شبیہ مولانا عبداللہ ہاتفی کی ہے۔ اس پر "عمل استاد بہزاد" لکھا ہے۔ یہ سکیین بے کے ذاتی مجموعے میں سے ہے۔ قصر یلدیز قسطنطنیہ میں خود بہزاد کی اپنی شبیہ

موجود ہے۔ یہ بھی شاہ طہماسپ کے زمانے کو ظاہر کرتی ہے اس لیے کہ بہزاد نے بھی وہی نوک دار کلاہ والی پگڑی پہن رکھی ہے جو اس زمانے میں رواج پا چکی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ شبیہ اس کے کسی شاگرد نے اس کی زندگی میں بنائی ہو یا ہوسکتا ہے یہ قاسم علی، یا میرک یا سلطان محمد کا کام ہو جو شبیہ سازی میں استاد تھے۔ تصویر میں ایک متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے بہزاد نے اب جوانی سے بڑھاپے میں قدم رکھ دیا ہے۔ کتاب خانۂ قصر یلدیز میں بہزاد کی شبیہوں میں سلطان حسین کے دوسرے فرزند شہزادہ غریب الزماں کی شبیہ بھی ملتی ہے۔

بہزاد، میرک، سلطان محمد، قاسم علی، آقا رضا، یہ سب شبیہ سازی اور چہرہ کشائی میں یورپین مصوروں کے دوش بدوش نظر آتے ہیں، ان میں خطوط کی روانی، ادائی، سادگی اور نزاکت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی شبیہوں میں توانائی اور کردار کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ رنگوں میں شوخی، خوبصورتی، نفاست اور لطافت یورپین مصوروں سے کسی صورت کم نہیں ہے۔ ایشائی مصور جس خلوص اور لگن سے جس محنت اور جذبے سے شبیہ بناتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس زمانے میں جب ایرانی مصوری ایک مخصوص طرز مصوری کے دور سے گزر رہی تھی، بہزاد نے شبیہ سازی کو ایک قدرت اور انفرادیت بخشی تھی۔ اس کے شاگردوں نے بھی اس صنف میں کمال حاصل کیا تھا۔ اس دور میں ہر شبیہ اظہار اور تاثر سے ایک دوسرے پر فوقیت رکھتی ہے۔ طراحی اور ڈرائنگ کی رو سے ہر ایک مکمل کہی جاسکتی ہے۔

بہزاد کی بنائی ہوئی شبیہوں میں ایک شبیہ ایسی ہے جس کی شہرت بہزاد کی شہرت کے لگ بھگ ہوگئی، یہ شبیہ خلیفہ زادہ ہارون الرشید کی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ شبیہ آقا رضا کے معجز نما موقلم کی مرہون منت ہے اور بہزاد کے بعد کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس تصویر پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں اس لیے اسے بہزاد سے منسوب کیا جاتا ہے اور اس کے شاہکاروں میں ایک حیرت انگیز شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس تصویر پر بہزاد کے دستخط دراصل ایک فنی زیادتی ہے، نہ معلوم کس شخص نے یہ زیادتی کی ہے۔ جو یہ غلط فہمی آج تک دور نہیں ہوسکی اور لوگ اسے بہزاد کی سمجھتے ہیں۔ جو لوگ بہزاد کے طرز نگارش سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بہزاد کی نہیں ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ کسی قدیم تصویروں کے بیوپاری کی حرکت معلوم ہوتی ہے جو اس نے مصور کے دستخط مٹا کر بہزاد کا نام لکھ دیا ہے، اس کی یہ حرکت ایک دائمی غلط فہمی کی صورت اختیار کر گئی ہے اور یہ آج تک جوں کی توں موجود ہے۔ آقا رضا کے بعد سلطان محمد نے بھی اس کی نقل بنائی ہے، اس کے علاوہ

اور مصوروں نے بھی یہ کام کیا ہے کیونکہ یہ اکثر عجائب گھروں میں پائی جاتی ہے۔ مغلوں کے عہد میں اس کی نقول یہاں ہندوستان میں بھی بنائی گئی ہیں۔ اور پھر مغلوں کے زوال کے بعد تو دہلی والوں نے اس کی اس قدر نقلیں بنائی ہیں کہ شائقین کے گھر کے گھر بھر گئے۔ دہلی والوں نے اس کے علاوہ رضا عباسی کی اس تصویر کی بے شمار نقلیں بنا ڈالی ہیں جن میں ایک نوجوان باز ہاتھ میں لیے بیٹھا ہے اور اس کے گرد حاشیے پر اشعار لکھے ہیں۔ یہ نقول بھی گھر گھر اور عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ خوبی کی یہ بات ہے کہ اس نقل کا حاصل کنندہ یہ سمجھتا ہے کہ اصل میرے ہی پاس ہے اور تو اور ان نقول کو دیکھ کر میں خود محوِ حیرت رہ چکا ہوں۔ یہ نقول فن پر پوری اترتی ہیں اور اس قدر اچھی اور عمدہ ہیں کہ بڑے بڑے شناخت کرنے والے دھوکا کھا چکے ہیں۔ خلیفہ ہارون الرشید کی شبیہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اصل میں نیشنل لائبریری پیرس کی ملکیت ہے، اس طرز کی اور شبیہیں بھی شاہ طہماسپ کے زمانے کے شہزادوں اور امرا کی ملتی ہیں۔ اس شبیہ کا مصور آقا رضا صورت سازی اور چہرہ کشائی میں یگانۂ روزگار تھا۔ یہ کاشان کا رہنے والا تھا، اس کا باپ اور استاد اصغر علی بھی باکمال مصور تھا۔ طراحی اور سیاہ قلم میں اسے دوسروں پر فوقیت حاصل تھی۔ کسی زمانے میں اس کی طبیعت زور آزمائی کی طرف مائل تھی، یہاں تک کہ پہلوانی اختیار کرلی تھی، لیکن کچھ عرصے بعد خود بخود اس سے طبیعت اچاٹ ہوگئی اور اپنے آپ کو اس سے باز رکھا۔ پست حوصلہ اور مزاج کا تند خو تھا، طبیعت میں ذرا بھی اختلاط نہ تھا۔ ہرات میں جب تیموریوں پر ادبار چھایا ہے تو یہ بھی شروع میں شاہ طہماسپ کے دربار سے منسلک ہوا ہے۔ شاہ عباس کے زمانے میں اس کا منظورِ نظر رہا ہے مگر ہمیشہ مفلس اور پریشان حال رہا۔ چنانچہ تنگ آکر اعلیٰ حضرت اکبر کے عہد میں ہندوستان ہجرت کر گیا، اس لیے کہ ان دنوں مغلوں کی ہنر پروری اور سرپرستی کے باعث یہاں فن کاروں کی بے حد قدر و منزلت تھی۔ آقا رضا ہندوستان آیا ہے تو اکبر چند سال بعد ہی وفات پا گیا ہے۔ اس نے جہانگیر بادشاہ کی ملازمت اختیار کی۔ شہنشاہ جہانگیر نے نوازشات اور التفات شاہانہ سے نوازا۔ جہانگیر نے اس سے متعلق اپنی تزک میں بھی ذکر کیا ہے۔ میرزا ابوالحسن اسی کا فرزند تھا جس کو جہانگیر نے اس کے دربار کا مرقع بنانے پر نادر الزماں کا خطاب دیا تھا۔ مشہور مصور کاشی جو مصور ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا اس کا داماد تھا۔

ایک دوہرے صفحے کی تصویر جو گلستان میوزیم تہران میں موجود ہے اس میں سلطان حسین مرزا اپنی

حرم سرا میں دکھایا گیا ہے۔ یہ دوہری تصویر جہانگیر کے پاس بھی رہی ہے۔ اس میں بائیں ہاتھ کے حصے میں کچھ بیگمات اور کچھ خادمائیں دکھائی گئی ہیں۔ اس انداز کی ایک نامکمل تصویر اور بھی ملتی ہے۔ تصویر میں دائیں طرف سلطان حسین ایک چمن میں سیب کے درخت کے نیچے مجلس جمائے بیٹھا ہے' سامنے دو تین خادمائیں رقص و سرود میں مصروف ہیں' کوئی عود بجا رہی ہے اور کوئی پھول چن رہی ہے۔ سلطان حسین سے ذرا نیچے دو عورتیں ایک کتاب لیے بیٹھی ہیں جس پر بہزاد کا نام ثبت ہے اور "العبد بہزاد" لکھا ہے' اوپر کے حصے میں دو عورتیں ایک عجیب و غریب کام میں مصروف ہیں اور کچھ عورتیں دوسرے کام میں مصروف ہیں۔ اس حصے میں عورتیں ہی عورتیں ہیں اور بائیں طرف والے حصے میں آدمی ہی آدمی ہیں' یہاں بھی کوئی عود بجا رہا ہے' کوئی کباب تیار کر رہا ہے' کوئی گا رہا ہے۔ اس حصے میں منقش قنات لگ رہی ہے جس کے اندر چوبدار کھڑا ہے' اس سے اظہار ہوتا ہے کہ دائیں جانب حرم سرا ہے جس میں سلطان بیگمات کے ساتھ بیٹھا ہے۔ دونوں تصاویر بہزاد کی ہنرمندی کا بہترین کارنامہ ہیں۔ یہ تصویر ان جاپانی تصاویر کی یاد دلاتی ہے جس میں جاپانی اپنی تصاویر کو الگ الگ کر کے بناتے ہیں' اگرچہ مضمون ایک ہی ہوتا ہے لیکن تصویر کو مختلف ٹکڑوں میں یوں بانٹ دیا جاتا ہے کہ ہر حصہ الگ تصویر معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرح استخوان بندی کی رو سے تصویر ایک غیر فانی شاہکار ہے۔ یہ تصویر ایک مکمل چمن کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ پھل پھول' شجر' اشجار اور نقش و نگار اس چابکدستی سے بنائے گئے ہیں کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مصور نے ایک ایک ذرے پر کام کیا ہے۔ تصویر کے دونوں حصوں میں ایک جوئے رواں چمن کو سیراب کرتی گزر رہی ہے۔ تصویر تیموریوں کے عیش و طرب اور محفل رقص و سرود کی پوری پوری عکاسی کرتی ہے۔ اس میں بھی بہزاد نے سلطان کو سبز لبادے میں بنایا ہے۔ اس تصویر میں ایک بات بڑی عجیب یہ ہے کہ ایک عورت جو پھول اکٹھے کر رہی ہے اس پر لکھا ہے۔ گوہر شاد بیگم۔ یہ نام تو مرزا شاہ رخ کی بیوی کا ہے۔ ہو سکتا ہے سلطان حسین کے زمانے میں بھی کوئی گوہر شاد بیگم موجود ہو —— قاہرہ والی بوستان کی پہلی تصویر جو دوہری تصویر ہے' اس دوہری تصویر سے ملتی جلتی ہے —— ایک اور نامکمل تصویر جو چمن میں تفریح سے تعلق رکھتی ہے وہ بھی بہزاد سے منسوب ہے —— ایک اور تصویر بہزاد سے منسوب ہے جس میں ایک اونٹ کھونٹے سے بندھا ہے' پاس ہی ساربان کھڑا ہے۔ اس پر بہزاد کے دستخط دو طرح سے ثبت ہیں ایک جگہ "صورہ بہزاد" لکھا ہے اور ایک جگہ لکھا ہے "کار اعلیٰ استاد بہزاد" ظاہر ہے یہ بات استاد بہزاد خود کسی تصویر پر نہیں لکھ سکتا تھا جو وہ خود اس بات کا اعلان کرتا کہ یہ کام

استاد بہزاد کا اعلیٰ ترین کام ہے۔ میرا خیال ہے یہ تصویر کسی اور کی ہے، اور اگر بہزاد کی ہے تو دستخط بہزاد کے اپنے ہاتھ کے نہیں ہیں بلکہ استاد بہزاد۔ کار اعلیٰ بہزاد۔ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر تصاویر پر بہزاد کے دستخط دوسرے لوگوں نے کیے ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یا تو یہ کسی ہم عصر کتاب دار کا کام ہے یا کسی ہم عصر نقاش کا ہے — ایک اور تصویر بہزاد سے منسوب ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ کتے ایک شاعر پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ مبصرین کے نزدیک یہ تصویر بہزاد کی بہترین تصویروں میں سے سمجھی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے جوانی کا کام ہے۔ تصویر گلستان میوزم طہران کی ملکیت ہے۔ تصویر پر یہ بھی لکھا ہے "طرح استاد بہزاد" اور اس کو آقا رضا نے مکمل کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آقا رضا نے استاد کی طرح کے بعد رنگوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس مضمون کو بعد میں شفیع عباسی نے بھی بنایا ہے۔ ایک چھوٹا سا خاکہ جس میں دو ہرن اور خرگوش بنائے گئے ہیں اور ایک چھوٹا سا درخت بھی ہے اس پر لکھا ہے "نقل از کار مولانا ولی صورہ العبد بہزاد" — ایک اور خاکہ بہزاد سے منسوب ہے جس میں چند آدمی ہیں نچلے حصے میں ایک آدمی گھوڑا لیے کھڑا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک آدمی ہاتھ پر باز بٹھائے کھڑا ہے۔ خاکے میں درخت ہے آدمی درخت پر چڑھا ہوا ہے اور درخت کو سیڑھی لگا رکھی ہے، ایک اور آدمی اوپر چڑھنے کی تیاری کر رہا ہے۔ تصویر میں سرو کا درخت بھی ہے جس پر کوئل بیٹھی ہے۔ یہ L O U V R E میں موجود ہے۔ مسٹر بلوشے مشہور فرانسیسی نقاد نے ان پرندوں کی تصاویر کو بہزاد سے منسوب کیا ہے جو امیر شاہی کی غزلیات کے صفحات پر بنی ہوئی ہیں اور نیشنل لائبریری پیرس کی ملکیت ہیں — ایک اور شکار کا منظر جس پر بہزاد کے دستخط موجود ہیں، بہزاد سے منسوب ہے۔

ایرانی مصوری میں بلکہ تمام مشرقی مصوری میں پگڑی کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ پگڑی سے ہر زمانے کی تصاویر پہچانی جاتی ہیں اور ان کا زمانہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ منگول اور ایلخانی اپنے وقت میں مختلف پگڑیاں اور ٹوپیاں استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ مقامات حریری اور رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ میں اپنے اپنے زمانے کی پگڑیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ تیموری شروع میں ایک خاص قسم کی ٹوپی اور سادہ قسم کی پگڑی جو چند پھیر اور چکروں تک محدود تھی استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد سلطان حسین کے زمانے میں اپنی قسم کی الگ پگڑی رواج پذیر ہوئی۔ اور پھر شاہ اسمٰعیل اور خاص طور پر شاہ طہماسپ کے عہد میں خاص قسم کی نکیلی کلاہ اور اس پر بڑی پگڑی نے رواج پایا، جسے صفوی مصوری

کی خصوصیت قرار دیا گیا ہے۔ اس دور میں ایرانی مصوری میں جمالیات کی رو سے نزاکت بانکپن اور لچک پیدا ہوتی ہے۔ دراصل اس زمانے میں شاہ نامے کی پیدا کردہ جنگ جویانہ سیرت میں انحطاط پیدا ہو کر ختم ہوا۔ حسین خیالات اور رعنائی نے مصوروں کی توجہ اپنی طرف زیادہ سے زیادہ مبذول کرالی۔ اس دور میں عورتوں کی صورت سازی پر بھی توجہ دی گئی۔ عورتوں کی شبیہ میں بھی پگڑی استعمال کی گئی ہے۔ بلکہ عورتوں کی برہنہ شبیہیں بھی بنائی گئیں۔ عورتوں کو الگ الگ اور اکٹھا بھی غسل کرتے دکھایا گیا ہے۔ ترکی سلطان بڑی بڑی پگڑیاں استعمال کرتے تھے۔ ان کے ہاں بڑی پگڑی کی خصوصیت رہی ہے۔ مغلوں نے ایک خاص پگڑی کو رواج دیا جو سلطنت کے اختتام تک ان کی خصوصیت کی نشان دہی کرتی رہی ہے۔

مرزا شاہ رخ کی موت کے بعد اس کے جانشینوں میں سلطنت کے حصول کی خاطر کئی سال تک خانہ جنگی ہوتی رہی ہے۔ باوجود اس کے ہرات علوم وفنون، آرٹ اور جمالیات کا مرکز رہا ہے۔ ہرات میں مصوری خطاطی اور دیگر ہر قسم کے فنون لطیفہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ چنانچہ مغرب میں تبریز، مشرق میں ہرات اور جنوب مغرب میں شیراز اس میں پیش پیش رہے ہیں۔ شاہ رخ مرزا کے بعد علوم وفنون کی ترقی میں دو سلطانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ سلطان ابو سعید بن سلطان محمد بن میرانشاہ اور سلطان حسین مرزا بن بالیقرہ۔ تیموریوں کے عہد میں امیر تیمور سے لے کر سلطان حسین مرزا تک جو مصوری ظہور پذیر ہوئی ہے اس کو مبصرین ہرات اسکول ہی کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ پندرھویں صدی میں ہرات کی مصوری کو عروج حاصل تھا اور اس کے سرپرست تیموری ہی تھے۔ ۸۷۳ھ ہجری میں سلطان ابو سعید کا انتقال ہوا ہے تو سلطان حسین مرزا ہرات ہی میں برسر اقتدار آیا ہے۔ سلطان حسین مرزا سولھویں صدی کے ابتدائی حصے تک برسر اقتدار رہا ہے، اس نے طویل زمانۂ حکومت پایا ہے اور اس کا زمانہ امن وامان کا زمانہ رہا ہے۔ دراصل اس کے زمانے ہی میں ہرات اسکول نے عروج حاصل کیا ہے۔ اس نے خاطر خواہ دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے۔ یہ عہد مصوری کا زرین عہد ہے اس عہد کو خاص طور پر بہزاد کے زمانۂ مصوری سے تعلق ہے۔ سلطان حسین مرزا کے بعد تیموریوں کا دور ایران اور ہرات میں ختم ہو گیا اور ہرات اسکول بھی قریب قریب ختم ہو گیا اس کے بعد شاہ اسمٰعیل اور شاہ طہماسپ صفوی کی وساطت اور سرپرستی سے صفوی اسکول ظہور پذیر ہوا ہے اور شاہ طہماسپ کے بعد شاہ عباس اول اور شاہ عباس دوم تک صفوی اسکول کو فروغ حاصل رہا ہے۔ اگرچہ رضا عباسی کی مناسبت سے بعض مبصرین ایرانی مصوری کو عباسی طرز نگارش سے منسوب

کرتے ہیں۔ جب شیبانی خاں کے حملے کی وجہ سے علما اور فضلا اور فن کار بے گھر ہونے پر مجبور ہوتے ہیں تو بہزاد کے شاگرد بخارا اور شیراز کے درباروں سے منسلک ہوتے ہیں اور وہ اس طرز نگارش کو وہاں اثر انداز کرنے کے موجب بنتے ہیں اور یہ طرز نگارش وہاں سولھویں صدی کے وسط تک اثر پذیر رہی ہے

جب ہرات اسکول کی مصوری سلطان حسین مرزا کے زمانے میں عروج پر تھی تو ایرانی مصوری کا زریں عہد سمجھا جاتا تھا۔ اب میر روح اللہ میرک نقاش، پیر سید احمد تبریزی، خلیل مرزا جیسے یگانۂ روزگار آہستہ آہستہ سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اب بہزاد واحد استاد فن تھا، دربار کے تمام فن کار بہزاد کے طرز نگارش میں رنگے ہوئے تھے۔ ان میں بیشتر بہزاد کے شاگرد تھے۔ بہزاد کی طرز نگارش ہمیں شاہ طہماسپ اور شاہ عباس کے زمانے تک اثر پذیر نظر آتی ہے۔ اس میں وہ تمام نزاکت، لطافت، روحانیت اور سحر انگیزی موجود تھی جو بہزاد کی مصوری کا طرۂ امتیاز تھی۔ علوم فنون اور صنعت و حرفت میں بہزاد اور اس کے شاگردوں کی وجہ سے ایک شستہ ذوق اور جمالیاتی حسن پیدا ہو گیا تھا۔ خطاطی، مصوری، تذہیب نگاری، موسیقی، شاعری غرض ہر فن میں ایک سے ایک باکمال موجود تھا۔

سلطان حسین مرزا کے دربار سے منسلک ہونے سے پیشتر بہزاد سلطان ابو سعید بن سلطان محمد بن میرانشاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ بہزاد کے علاوہ ابو سعید کے دربار سے بے شمار مصور اور خطاط منسلک تھے، ان میں شاہ مظفر بھی شامل تھے۔ بابر نے اسی شاہ مظفر کو بہزاد کے مقابلے میں ترجیح دی ہے۔ شاہ مظفر کا باپ منصور بھی ابو سعید کے دربار سے منسلک تھا باپ بیٹا دونوں ابو سعید کے دربار سے وابستہ تھے۔ بہزاد کے مقابلے میں شاہ مظفر کا کام بہت زیادہ نہیں ہے۔ کہتے ہیں سات سال کی مدت میں اس نے ہشت مجلس کو مصور کیا تھا۔ ایک سیاہ قلم کا خاکہ لندن کی نمائش ۱۹۳۱ء میں شاہ مظفر کے ہاتھ کا پیش ہوا تھا جس میں براق کی تصویر تیز و تند خطوط میں بڑے سائز میں بنائی گئی ہے، اس سے اس کی چابکدستی کی تصدیق ہوتی ہے۔ مولانا درویش محمد مشہور مصور اور خطاط اور دیگر مصور اس کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جس سال سلطان ابو سعید قتل ہوا ہے اور سلطان حسین برسر اقتدار آیا ہے ظفر نامہ مصور ہو رہا تھا۔ ایک روایت کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ مصور ظفر نامۂ یزدی کی ابتدا در اصل ابو سعید ہی کے زمانے میں ہو چکی تھی۔ ظفر نامے کی تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں دوسرے مصوروں کا بھی ہاتھ ہے۔ ہو سکتا ہے بہزاد نے دوسرے مصوروں کے کام کو آخری شکل دی ہو اور اس کا اپنا کام بھی اس میں شامل ہو۔

بہزاد کی طرز نگارش اس زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی برس ہا برس تک مقبول عام اور سعادت پذیر رہی ہے مگر اس کی زندگی میں تو کیا اس کے بعد بھی کسی ایرانی مصور نے یہ مذموم حرکت نہیں کی کہ تصویر بنا کر اس پر بہزاد کا نام لکھ دیا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ اس کی طرز نگارش میں کام کرنے والے بے شمار پیدا ہو گئے تھے۔ ان کی تصاویر پر ان کے دستخط موجود ہیں بعض ایسی بھی ہیں جن پر کسی کے دستخط نہیں ہیں لیکن بہزاد کی طرز میں ہونے کے باعث ان کو بہزاد سے منسوب کیا گیا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس کا زیادہ تر سبب یہ بھی ہے کہ بعض مصوروں نے دستخط نہ کرنے میں بے نیازی کا ثبوت دیا ہے، اس لیے کہ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ تصاویر پر دستخطوں کی وساطت سے مصوروں کا نام زندگیٔ جاوید حاصل کرے گا۔ بہزاد کی اکثر تصاویر کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا ہے کیونکہ بہزاد بھی تصاویر پر دستخط کرنے میں بے نیاز واقع ہوا تھا اور یہ اس بے نیازی کا ثبوت ہے کہ اس کی تصاویر پر اس کے دستخط مختلف صورتوں میں پائے جاتے ہیں جو یا تو کسی کتاب جامہ کے ہیں یا کسی خطاط کے ہاتھ کے ہیں یا وہ ایسی جگہ اور ایسی صورت میں ثبت ہیں کہ اکثر مشکوک معلوم ہوتے ہیں۔

جب ۷۸۶ھ ہجری میں امیر تیمور پہلی بار سلطانیہ پر قبضہ کرنے کے بعد سمرقند واپس چلا گیا ہے تو اس کے حریف کبیر توقتمش خاں نے تبریز پر حملہ کر دیا اور شہر اور باشندوں کو بہت بری طرح لوٹا۔ بہت سے لوگوں کو قیدی بنا کر دربند کی طرف لوٹ گیا۔ قیدیوں میں فارس کے مشہور صوفی شاعر مولانا کمال خجندی بھی تھے جن کے پہلو میں بہزاد تبریز میں مدفون ہے۔ یہ وہی توقتمش خاں ہے جس کی لڑائی کا مرقع 'شاہ عالم' جہانگیر کی خاطر ایران سے لایا تھا جسے خلیل مرزا شاہ رخی نے بنایا تھا۔ خلیل مرزا کا اصل نام غیاث الدین تھا۔ ۲ رجب سنہ ۹۲۰ ہجری کو شاہ اسمٰعیل صفوی اور عثمانیوں میں جنگ چالدران واقع ہوئی جس میں شاہ اسمٰعیل کو شکست اٹھانا پڑی۔ سلطان سلیم فاتحانہ طور پر تبریز میں داخل ہوا۔ اس نے ان تمام خزانوں اور مال و دولت کو اپنے قبضے میں کر لیا جنھیں ایرانی سلطان عرصہ دراز سے جمع کرتے آتے تھے۔ یہ اس ذلت کا بھی بدلا تھا جو سلطان یلدیز کو امیر تیمور کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی۔ سلطان سلیم مال و زر کے علاوہ سیکڑوں علما فضلا اور ماہر فن کاروں کو اکٹھا کر کے اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے گیا۔ یہی وہ موقع تھا جب شاہ اسمٰعیل نے بہت سے علما فضلا اور فن کاروں کو ایک غار میں چھپا دیا تھا جن میں بہزاد اور شاہ محمود نیشاپوری مشہور کاتب خمسہ نظامی ملکیتی برٹش میوزیم بھی شامل تھے۔ سلطان سلیم کے جانے کے بعد شاہ اسمٰعیل نے

سکھ کا سانس لیا تھا اور خدا کا شکر ادا کیا اس لیے کہ بہزاد اور شاہ محمود اس جنگ میں ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہے تھے ۔ ترکوں کی آئے دن کی یلغار سے تنگ آکر شاہ طہماسپ نے اپنا دارالحکومت تبریز سے مشرق کی جانب قزوین میں تبدیل کر لیا تھا ۔ یہ اس لیے بھی تھا کہ لوگ زیادہ تر صفویوں سے خوش نہیں تھے کیونکہ تبریز کے باشندے زیادہ تر حنفی عقائد کے تھے اور ان کو اس بات کا رنج تھا کہ جب شاہ اسمٰعیل نے سنہ ۹۰۶ ہجری میں شرور کے مقام پر مرزا آق قونیلو خاندان پر فتح پائی ہے اور تبریز اس کے قبضے میں آیا ہے تو شہر کی دو تہائی آبادی حنفی عقائد کے لوگوں پر مشتمل تھی جن کو زبردستی شیعہ بنانا چاہا تھا ۔ مورخ یعقوبی کا بیان ہے کہ شاہ اسمٰعیل کو آق قونیلو خاندان سے اس قدر نفرت اور دشمنی تھی کہ جب وہ تبریز پر قابض ہوا ہے تو اس نے اس خاندان کے بیش رووں کی قبروں کو کھدوا ڈالا اور ان کی ہڈیاں جلا ڈالیں ۔

مختلف تصاویر اور شبیہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ بہزاد کا کام مصور کتب کی صورت میں پایا جاتا ہے جس قدر مصور کتب اور شبیہات بہزاد کے نام سے منسوب یا دریافت ہوئی ہیں ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے ۔ ڈاکٹر مارٹن کا خیال ہے تمام مرقع جات اور تصاویر کی مجموعی تعداد نوے یا سو کے قریب ہوگی جن کو بہزاد سے منسوب کیا جا سکتا ہے ان میں سے زیادہ تر رشک وشبہ کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ جو مرقع جات بہزاد سے منسوب ہیں ان میں سب سے پہلے ظفر نامہ کا نام آتا ہے جو سنہ ۸۷۲ ہجری میں مصور ہوا اور اسی سال سلطان حسین مرزا بر سر اقتدار آیا ہے ۔ ایک اور مصور تیمور نامہ بہزاد سے منسوب ہے جس کو سلطان علی مشہدی نے لکھا تھا ۔ کہا جاتا ہے یہ وہی تیمور نامہ تھا جو شہنشاہ ہمایوں سے گجرات کی مہم میں کہیں کھو گیا تھا ۔ ایک خمسہ نظامی جو شاہ طہماسپ کے لیے لکھا گیا تھا اور جسے مولانا محمود نے لکھا تھا بہزاد کی تصاویر سے مزین تھا ۔ ایک اور خمسہ نظامی جو نیشنل لائبریری پیرس کی ملکیت ہے بہزاد کی تصاویر اس میں موجود ہیں ۔ ایک اور خمسہ نظامی جسے سلطان علی مشہدی نے لکھا ہے اس میں چار تصاویر بہزاد کے ہاتھ کی ہیں ۔ ایک خمسہ امیر خسرو دھلوی سنہ ۸۹۰ ہجری میں لکھا گیا ہے اس میں تیرہ تصاویر ہیں ۔ سلطان حسین مرزا کا دیوان سنہ ۹۰۳ ہجری میں سلطان علی مشہدی نے لکھا ہے ۔ اس میں تین تصاویر ہیں یہ نیشنل لائبریری پیرس کی ملکیت ہے ۔ بوستان سعدی کا مرقع خدیو لائبریری مصر کی ملکیت ہے اس میں بہزاد کی چھ تصاویر موجود ہیں ۔ نظامی کی ہفت پیکر اس میں پانچ تصاویر ہیں اور ان میں سے تین پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں ۔ برٹش میوزیم کے خمسہ نظامی میں سولہ تصاویر ہیں جن میں سے چھ بہزاد سے منسوب ہیں

پانچ میرک کے ہاتھ کی ہیں اور پانچ قاسم علی کی بنائی ہوئی ہیں ۔ لیلیٰ مجنوں میں چار تصاویر بہزاد کے ہاتھ کی ہیں۔ اس مرقع کو سلطان محمد نور مشہور شاگرد مولانا سلطان علی مشہدی نے لکھا ہے۔ یہ کبھی اردبیل کی لائبریری میں تھا اب لینن گراڈ میں موجود ہے ــــ لیلیٰ مجنوں کا ایک اور نسخہ جس میں دو تصاویر ہیں وہ بھی لینن گراڈ میں موجود ہے ـــ خمسہ نظامی کا ایک اور نسخہ جو برٹش میوزیم کی ملکیت ہے، اس میں ایک تصویر پر بہزاد کے دستخط ہیں۔ تصویر سے ظاہر ہوتا ہے یہ استاد کا بڑھاپے کا کام ہے کیونکہ تصویر میں کچھ کچھ زور قلم میں کمی محسوس ہوتی ہے ۔ ایک مرقع سلطان عبدالعزیز بخارا کے لیے مصور کیا گیا تھا یہ نسخہ سنہ ۹۲۹ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے اس میں چار تصاویر پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں ـــ ایک مرقع میر علی شیر نوائی کے کلام کا جو نیشنل لائبریری پیرس میں موجود ہے اس میں بہزاد کی تصاویر میں ایک تصویر جنگ سے متعلق ہے ۔ اس میں اور تصاویر بھی ہیں، وہ بھی لڑائی کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔

بہزاد کے مرقع جات میں میر علی شیر نوائی کا ایک خمسہ ملتا ہے جو سنہ ۹۰۰ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ یہ سلطان حسین کے فرزند بدیع الزماں کے لیے مصور کیا گیا تھا۔ یہ خمسہ چار جلدوں میں بوڈلین لائبریری میں موجود ہے۔ عجائب خانہ طوپ قپو سرائے میں جو چار مرقع جات ایرانی خطاطی اور مصوری کے موجود ہیں ان میں بہت سی تصاویر پر بہزاد کا نام ثبت ہے۔ ان میں ایک تصویر ریشم پر بنی ہے۔ یہ ایک باز کی تصویر ہے اس پر لکھا ہے" ایں باز کار استاد بہزاد است"۔ ایک اور خاکہ پر لکھا ہے" سیاہ قلم نادر العصر استاد بہزاد"۔ چیونٹوں اور خرگوش کا خاکہ بھی انھیں مرقع جات میں موجود ہے ۔ عجائب خانہ طوپ قپو سرائے میں ایک خمسہ نظامی موجود ہے جس کو مولانا سلطان علی مشہدی نے سنہ ۹۰۰ھ ہجری میں لکھا ہے اس خمسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد نے شیبانی خاں کے لیے اسے مصور کرنا شروع کیا تھا کیونکہ شاہ اسمٰعیل کو یہ شیبانی خاں کے کتب خانے سے نامکمل حالت میں ملا ہے۔ چنانچہ بہزاد نے شاہ اسمٰعیل کے لیے اسے سنہ ۹۱۸ھ ہجری میں مکمل کیا ہے اس میں استاد محمد یاری نے تذہیب نگاری کی ہے، اس میں صفوی اثرات کسی حد تک پائے جاتے ہیں۔

برٹش میوزم میں ایک اور خمسہ نظامی پایا جاتا ہے جس کا نمبر ۲۵۹۰۰ ہے اور جو سنہ ۹۴۶ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں بیس تصاویر ہیں، یہ بھی بہزاد کے آخری زمانے کا کام معلوم ہوتا ہے۔ اس میں تین تصاویر پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں ۔ قاہرہ کی بوستان کے علاوہ ایک اور بوستان مسٹر چیسٹی کے ذخیرے میں موجود ہے۔ یہ نسخہ سنہ ۹۳۳ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں گیارہ تصاویر ہیں۔ اگرچہ ان سب تصاویر

پر بہزاد کے دستخط ثبت نہیں ہیں لیکن خاتمے پر ہر کاتب نے لکھا ہے کہ اسے بہزاد نے مصور کیا ہے کیونکہ آخر میں "العبد المذنب" بہزاد لکھا ہے اور ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے کہ خدا مصور پر اپنی رحمت نازل کرے۔ مذکورہ بالا بوستان کے علاوہ چیئر بیٹی کے مجموعے میں ایک اور بوستان کا نسخہ موجود ہے جسے مولانا شمس الدین کرمانی نے ۹۱۵ھ ہجری میں لکھا تھا۔ اس میں صرف ایک تصویر ہے جس کی پشت پر "قلم بہزاد" لکھا ہے۔ اگرچہ یہ بات شک پیدا کرتی ہے مگر تصویر کی طرز نگارش اور استخوان بندی اور کمال مجبور کرتے ہیں کہ اسے بہزاد کا تسلیم کیا جائے۔ مسٹر چیئر بیٹی کے مجموعے میں ایک مصور نسخہ سبحۃ الابرار جامی کا موجود ہے اس پر کسی کاتب کا نام نہیں ہے اور نہ کوئی تاریخ ثبت ہے۔ اس لیے کہا نہیں جا سکتا کب اور کہاں مکمل ہوا ہے۔ اس کی پانچ تصاویر بالکل اسی طرز نگارش کی حامل ہیں جو بہزاد کا طرۂ امتیاز ہے مگر اس کی ایک تصویر بیرونی مناظر یعنی خیموں کی زندگی کا نظارہ پیش کرتی ہے اس پر بہزاد کا نام اس صورت میں لکھا ہے "طرح استاد بہزاد" مگر اس کے نیچے دیوانہ نقاش کا نام لکھا ہے۔ تصویر تمام تر بخارا اسکول کی طرز نگارش میں بنی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ کام دیوانہ نقاش ہی کا ہے۔ دیوانہ نقاش اگرچہ تبریز کا رہنے والا تھا مگر سلطان یعقوب کے دربار سے بخارا میں منسلک رہا ہے۔ "طرح استاد بہزاد" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خاکہ استاد بہزاد نے ترکیب دیا تھا اس خاکے کو بعد میں دیوانہ نقاش نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ کیونکہ بہزاد کی طرز نگارش کے اثرات شیراز اور بخارا اسکول میں بڑی حد تک پائے جاتے ہیں۔ اس نسخے کو ماہرین سولھویں صدی کا قرار دیتے ہیں۔ مگر تصاویر کی طرز نگارش پندرھویں صدی کے ہرات اسکول کی مرہون منت ہے اس لیے کام کی ندرت اور کمال کو دیکھ کر کسی قسم کا شک پیدا نہیں ہوتا۔

ایک نسخہ دیوان حافظ کا سلطان محمد نور کے ہاتھ کا لکھا ہوا چیئر بیٹی کے مجموعے میں موجود ہے۔ اس میں بیس تصاویر استاد بہزاد کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں۔ ایک ایسا ہی نسخہ نیشنل لائبریری پیرس میں موجود ہے اس میں جو پرندے بنے ہوئے ہیں مسٹر بلوشے ان کو بہزاد کا تسلیم کرتے ہیں۔

ظفرنامہ جو بہزاد سے منسوب ہے شاہان مغلیہ کے کتب خانے کی زینت رہا ہے۔ اس پر اعلیٰ حضرت اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک ہر ایک بادشاہ کی مہریں ثبت ہیں اور بعض کی تحریرات بھی اس پر موجود ہیں یہ ظفرنامہ مولانا شرف الدین علی یزدی کی تصنیف ہے۔ یہ نسخہ ۸۷۲ھ ہجری میں مشہور کاتب شیر علی نے لکھا ہے۔ مولانا شرف الدین یزد کے رہنے والے تھے شروع میں مرزا شاہ رخ کے دربار سے وابستہ تھے

لیکن بعد میں شیراز میں مرزا ابراہیم شاہ رخ کے فرزند کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ یہ ظفرنامہ مرزا ابراہیم ہی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ مولانا شرف الدین نے ۸۵۸ھ ہجری میں یزد میں وفات پائی ہے اور وہیں دفن ہوگئے ہیں۔ مصور نسخہ ظفرنامہ کے شروع میں ایک دائرے میں منقش لوح بنائی گئی ہے جس میں لکھا ہے یہ نسخہ ابوالغازی سلطان حسین مرزا کے لیے مکمل کیا گیا ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے میر جمال الدین حسین انجو نے اعلیٰ حضرت اکبر کی خدمت میں آگرہ میں پیش کیا ہے۔ جہانگیر کی تحریر کے مطابق اس میں آٹھ دوہری تصاویر موجود ہیں جن کو بہزاد سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان پر بہزاد کے دستخط ثبت نہیں ہیں۔ لیکن بادشاہ شاہجہاں کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں بارہ تصاویر ہیں۔ چنانچہ اس بات کی تصدیق نسخے کے آخر میں حسین انجو کی اپنی تحریر سے بھی ہوتی ہے کہ اس میں بارہ تصاویر ہیں جو ایک دوسرے کے بالمقابل دستور کے مطابق صفحات کے اندر بنائی گئی ہیں۔ ڈاکٹر آرنلڈ نے اس مرقع پر ایک جامع مضمون لکھ کر اسے کتابی صورت میں چھاپ دیا ہے۔ اس مطبوعہ نسخے میں بارہ کی بارہ تصاویر رنگین شائع کی گئی ہیں جیسا کہ ظاہر ہے اس ظفرنامے کو ہر ایک شہنشاہ نے اپنے دوران حکومت میں جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا ہے پھر کتاب پر مختلف کتاب داروں کی تحریرات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر بادشاہ اپنے عہد میں اسے سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتا رہا ہے۔ چنانچہ ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کشمیر گیا ہے تو اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اسی طرح جہانگیر اور شاہجہاں جو زیادہ تر لاہور اور دہلی رہے ہیں، انھوں نے بھی اپنے دور حکومت میں اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس سے کس قدر الفت اور محبت تھی جو ایک دم بھی اس کو اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے۔ وہ اس کو اپنی سلطنت کے نادر جواہر سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتے تھے جو ہمیشہ حرز جان بنائے رکھتے تھے۔ اس لیے بھی کہ یہ ان کے آبا و اجداد و بزرگ اور بانیٔ سلطنت امیر تیمور گورگان کی سوانح حیات تھی اور ایک اس لیے بھی کہ اس کی تصاویر یگانۂ روزگار مصور بہزاد کی بنائی ہوئی تھیں۔ جس کو عظیم اور اعلیٰ ترین مصور سمجھا جاتا تھا اور جس کی تصاویر کو بادشاہوں نے اپنے نگار خانوں کے لیے حاصل کرنا اور جمع کرنا اپنا نصب العین سمجھ رکھا تھا۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ابوالفضل کے الفاظ اور خیالات جو انھوں نے بہزاد سے متعلق بیان کیے ہیں ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور بابر کے

الفاظ تو آج بھی ایک مبسوط تاریخ کی مانند زندہ جاوید ہیں ـــ بارہ تصاویر کے علاوہ ظفر نامے میں چار منقش صفحات بھی شروع میں موجود ہیں۔ یہ ظفر نامہ نادر شاہ کی اندھیر گردی میں دوسرے قلمی نوادر، نادر تصاویر، تخت طاؤس اور دیگر زر و جواہر کے ساتھ ایران منتقل ہوا ہے۔ اور پھر شومیٔ قسمت سے شاہی خزانے سے ایک امیر بنام بہمن ابن نائب ابن السلطنت کے توسط سے ڈاکٹر SCHULZ نے چند ہزار فرانک (فرانسیسی سکہ) کے عوض خریدا۔ ان سے مسٹر M. GOLOUBEFF اور M. A. SAMBON نے۔ انھوں نے اس کو میسرز KALBOJIAN FRERES کو فروخت کیا اور ان سے M. ROBERT GARRETT نے خریدا۔ اب یہ شاہکار انھیں کے پاس ہے۔ ظفر نامے میں بارہ تصاویر ایک دوسرے کے بالمقابل بنی ہیں۔ شاید اس لیے بالمقابل بنائی گئی ہیں کہ نفس مضمون کو وسعت بیان کی ضرورت تھی۔ بہزاد نے اکثر مرقعوں میں اسی طرز میں بالمقابل تصاویر بنائی ہیں اور وہ بھی نفس مضمون سے مجبور ہو کر۔

پہلی دو تصویروں میں امیر تیمور نے کھلی فضا میں ایک چمن زار میں دربار منعقد کر رکھا ہے اور خود امیر ایک منقش تخت پر جلوہ افروز ہے۔ تخت کے پیچھے ایک منقش خیمے کو خوبصورت انداز میں نصب کیا گیا ہے۔ دائیں جانب امیر تیمور والے حصے میں امیر امرا مؤدبانہ طور پر کھڑے اور بیٹھے ہیں۔ سامنے والے حصے میں بھی امیر امرا، سردار، درباری اور سپاہی کھڑے اور بیٹھے ہیں۔ ہر ایک سامان حرب اور سامان عیش و طرب، تیر و تلوار، ڈھال اور نیزے سے لیس اور چاق چوبند ہے۔ اس میں گھوڑے بھی بنائے گئے ہیں۔ چمن زار میں آب رواں بھی ہے۔

دوسری دو تصاویر میں امیر تیمور نے شہر کیف کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ سپاہی اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار حملہ آور ہو رہے ہیں۔ دائیں حصے میں فوج حملہ آور ہو رہی ہے۔ بائیں جانب دکھایا گیا ہے کہ امیر تیمور کی فوج حصار توڑ کر شہر میں داخل ہو گئی ہے۔

پانچویں اور چھٹی تصویر میں اس لڑائی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جو دریائے اوکسس پر لڑی گئی تھی۔ فوج کشتیوں کے ذریعے دریا کو پار کر رہی ہے۔ گھوڑوں اور اونٹوں کو دریا میں ڈال دیا گیا ہے۔ دریا کے اس طرف خیمے بھی استادہ ہیں۔ خیموں میں سے طبل جنگ اور بگل بجا کر اعلان جنگ کیا جا رہا ہے اور سپاہیوں کے دل ابھارے جا رہے ہیں۔ سامنے سے دشمن بھی مزاحمت کر رہا ہے۔ امیر تیمور خود

فوج کی کمان کر رہا ہے۔ اس کے گھوڑے پر خاص قسم کی جھول پڑی ہے۔

ساتویں اور آٹھویں تصویر میں قبچاق فوج کی تباہی دکھائی گئی ہے، اس میں بھی امیر تیمور خود فوج کی کمان کر رہا ہے۔ اس میں سلطان تیمور کو خاص طور پر نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے۔ خادم نے امیر کے سر پر چتر کر رکھا ہے۔ دشمن کی فوج پہاڑوں اور گڑھوں میں سر چھپا رہی ہے۔ نویں اور دسویں تصویروں میں سمرقند میں جامع مسجد کی تعمیر کا نظارہ پیش کیا گیا ہے۔ مہندس اور معمار، مزدور اور کاریگر اپنے اپنے کام میں سرگرم عمل ہیں، کوئی پتھر کاٹ رہا ہے کوئی اینٹیں لا رہا ہے کوئی گارا بنا رہا ہے۔ ہاتھیوں کے ذریعے بھی سامان لایا جا رہا ہے۔ غرض ہر ایک اپنے اپنے کام میں نہایت محنت اور دلجمعی سے منہمک ہے۔ دائیں جانب اوپر کے حصے میں معلوم ہوتا ہے کہ امیر خود عمارت کے کام کی نگرانی کر رہے ہیں، مہندس اور معماروں کو ہدایات دے رہے ہیں۔

گیارھویں اور بارھویں تصویروں میں قلعہ سمرنا کا محاصرہ دکھایا گیا ہے۔ قلعہ بند فوج امیر تیمور کی فوج پر اوپر سے تیر اندازی کر رہی ہے۔ قلعے سے آگے فصیل موجود ہے دروازہ بند ہے، امیر کی فوج فصیل کو عبور کر کے حملہ آور ہو رہی ہے۔ ان تصاویر سے اس زمانے کے طریقۂ جنگ، سامان حرب، مقاومت اور حملہ آوری کے طریقۂ کار کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ظفر نامے کی تصاویر اکثر ماہرین کے نزدیک شک کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، ان کو بہزاد کی تسلیم کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ لیکن جہانگیر کے الفاظ اور اس کی تصاویر سے متعلق سوجھ بوجھ کے باعث ان کو بہزاد کا مانا گیا ہے اور ڈاکٹر آرنلڈ جنھوں نے اس مرقع پر ایک سیر حاصل بحث کتابی صورت میں شائع کی ہے، ان کی رائے بھی یہ ہے کہ یہ تصاویر بہزاد کی ہیں۔ ڈاکٹر مارٹن کی رائے بھی یہی ہے کہ یہ بہزاد کا کام ہے اور تو اور مسٹر بلوشے جو اکثر تصاویر کو بہزاد کی ماننے سے انکار کرتے ہیں، ان کی رائے بھی یہی ہے کہ یہ تصاویر بہزاد کی ہیں۔ ڈاکٹر آرنلڈ کی رائے کسی حد تک درست ہے کہ اس مرقع کی چونکہ دوبارہ جلد بندی کی گئی ہے اس لیے جلد بندی کے وقت اس کے اصل حاشیے کو کانٹ چھانٹ دیا گیا ہے، جس سے مرقع کی اصل صورت میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ دوسرے مرقع کی تاریخ اختتام سے بھی پتا چلتا ہے کہ موجودہ جلد بندی بعد کی بات ہے۔ بہزاد کا یہ کام اس کی جوانی کے ایام کا معلوم ہوتا ہے اور غیر معمولی پختگی اور قدرت رکھتا ہے۔ ہر تصویر مکمل نقش گری کا مظہر ہے

کسی تصویر کے کسی حصّے میں بھی بے دلی اور اکتاہٹ کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ ہر تصویر مصور کے کمال اور ہنروری کا ثبوت ہے۔ ہر تصویر میں کئی چہرے اور کردار موجود ہیں جو پورے تناسب و توازن اور مناسبت سے بنے ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ بہزاد کو جنگ جویانہ تصویریں بنانے میں ماہر خیال کرتے ہیں اور اس صفت میں اس کا نام ایک ضرب المثل قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ مشہور ترکی سیاح چلپی نے ایک ترکی مصور سے متعلق اس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ بھی جنگ سے متعلق تصاویر بنانے میں دوسرا بہزاد ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منگول، ایلخانی اور تیمور سے مرزا شاہ رخ تک شاہ نامہ ہی کو دیگر تصانیف پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اس لیے مصوروں کی توجہ بھی رزمیہ تصاویر بنانے کی طرف زیادہ رہی ہے۔ صفویوں سے پیشتر ہر دور اور ہر سلطان کے عہد میں شاہ نامہ ہی خلوت و جلوت میں زیب داستاں رہا ہے اور ہمیشہ رزمیہ مصوری کو ایک خاص مقام حاصل رہا ہے پھر بھی اپنے جذبات سے مجبور مصوروں نے شاہ نامے سے الگ ہوکر رندانہ، عاشقانہ، شاعرانہ اور متصوفانہ رنگ میں طبع آزمائی کی ہے۔ بہزاد فطرتاً حلیم اور سادہ مزاج واقع ہوا تھا۔ وہ متین اور سادہ قسم کے مضامین مصور کرنے کا جویا تھا۔ جنگ جویانہ تصاویر بنانے سے دیدہ و دانستہ گریز کرتا تھا۔ اس بات کا ثبوت بوستان سعدی، خمسہ نظامی، خمسہ امیر خسرو، لیلیٰ مجنون، ہفت پیکر جیسے مرقع جات اور وہ شبیہات موجود ہیں جو اس سے منسوب ہیں۔ ایرانی مصوری میں صفوی دور اور خصوصیت سے شاہ طہماسپ کا دور ایسا زمانہ ہے جس میں شاہ نامے کے علاوہ بوستان سعدی، یوسف زلیخا، خمسہ نظامی، حافظ اور عمر خیام پر تصاویر بنانے میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ چنانچہ ہم صفوی عہد میں مصوروں کی توجہ زیادہ تر اسی قسم کی تخلیقات کی طرف مائل پاتے ہیں، اس دور میں دوسری مصور کتب کو چھوڑ کر خمسہ نظامی اس قدر مصور ہوتے ہیں کہ کچھ شمار نہیں۔ شاہ عباس اول اور دوم کے زمانے میں تو مصوروں کا نقطۂ نگاہ ہی بدل گیا ہے۔ البتہ مغلوں نے ابتدا میں پھر جنگ جویانہ مضامین کی طرف توجہ دی ہے چنانچہ اس وقت داستان امیر حمزہ، رزم نامہ، تیمور نامہ، داراب نامہ، بابر نامہ وغیرہ مصور ہوئے شاید اس کا سبب یہ بھی تھا کہ ابتدا میں مغلوں میں دوبارہ ملک حاصل کرنے اور فتوحات حاصل کرنے کا جذبہ بڑی حد تک کارفرما تھا۔ لیکن یہاں بھی مصوری کا نقطۂ نگاہ جلد ہی بدل گیا ہے اور مصوروں کا رجحان شبیہ نگاری اور دوسری تخلیقات کی طرف مڑ گیا ہے۔

ظفر نامے کی تصاویر دیکھ کر جہانگیر نے بھی یہ رائے قائم کی تھی کہ بہزاد جنگ جویانہ تصاویر بنانے میں ماہر تھا اور جہانگیر نے یہ رائے اس وقت قائم کی ہے جب اس نے وہ مرقع دیکھا ہے جو خان عالم اس کی خاطر ایران سے لایا ہے۔ یہ مرقع خلیل مرزا شاہ رخی کا بنایا ہوا تھا اور صاحب قرآن امیر تیمور گورگان اور تقتمش خاں کی جنگ سے متعلق تھا۔ اس لیے کہ اس کا انداز ظفر نامہ سے ملتا تھا۔ اور ظفر نامے ہی کی موجودگی جہانگیر کو ایسی رائے قائم کرنے کا باعث ہوئی تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ظفر نامہ اعلیٰ حضرت اکبر کے عہد میں کتب خانہ شاہی میں جمال الدین حسن انجو کی وساطت سے داخل ہو چکا تھا اور مرقع خلیل مرزا خان عالم جہانگیر کے زمانے میں ایران سے لایا تھا۔ یہ مرقع امیر تیمور گورگان، ان کی اولاد اور امیر امرا، سپاہیوں اور سرداروں کے علاوہ دشمن اور اس کے ہمراہیوں کی صورتوں پر مشتمل تھا جو اس جنگ میں شریک تھے اور ہر ہر صورت پر ان کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس میں دو سو چالیس آدمیوں کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔ چونکہ ظفر نامہ کی موجودگی کی وجہ سے مرقع خلیل کا کام جہانگیر کے نزدیک بہزاد سے ملتا تھا اس لیے اس کو اپنی رائے قائم کرنی پڑی۔ لیکن جہانگیر لکھتا ہے کہ اگر اس پر کار استاد خلیل مرزا شاہ رخی لکھا ہوا نہ ہوتا تو ظفر نامے کی تصاویر کی رو سے میں یہی سمجھتا کہ یہ مرقع بہزاد کا بنایا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ظفر نامہ اور مرقع خلیل مرزا کے کام میں مشابہت پائی جاتی تھی۔ اس لیے ممکن ہے بہزاد نے خلیل مرزا سے بھی کسب ہنر کیا ہو۔ یا اس نے خلیل مرزا کے طرز نگارش کو اپنایا ہو۔ یہ بات کسی حد تک یقینی ہے کہ جب خلیل مرزا اور استاد روح اللہ میرک نقاش مرزا بایسنغر کے نگار خانے سے وابستہ تھے تو بہزاد نگار خانے میں ابھی کسب ہنر کر رہا تھا اور تمام استاد اپنے فن کی رو سے عروج پر تھے۔

خلیل مرزا کیا اور استاد روح اللہ میرک کیا جو بھی مصور دربار سے منسلک تھا، بہزاد ان سب سے کسب ہنر کر رہا تھا کیونکہ وہ سب سے کم عمر اور نوجوان تھا۔ سب کا طرز نگارش اس کے کام پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ چنانچہ اسی بات کو مد نظر رکھ کر جہانگیر کو خیال ہوا کہ بہزاد نے خلیل مرزا سے بھی کسب ہنر کیا تھا۔ جب ظفر نامہ مصور ہوا تو سلطان حسین سریر آرائے سلطنت ہوا تھا، اس نے باقاعدہ دربار منعقد کر کے ابوالغازی سلطان کا لقب اختیار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلیل مرزا اور بیشتر استادان فن اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اب بہزاد ہی سلطان حسین مرزا کا کتابدار تھا۔ بہزاد ہی برآوردہ صاحب ہنر تھا۔ ظفر نامے کی تصاویر کتاب کے اصل موضوع سے ہٹ کر بنائی گئی ہیں اور اصل مضمون کے تکمیل پا جانے کے بعد بنائی گئی ہیں، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تصاویر کے لیے صفحات خالی چھوڑ دیے گئے تھے۔ میرا خیال ہے

کہ یہ ویسے بھی قرین قیاس ہے کیونکہ جب تک خطاط نے کتاب مکمل نہیں کر لی ہوگی اس وقت تک اس بات کا امکان نہیں تھا کہ مصوران مقامات کی نشانی دہی کر سکتا جن کی تصاویر بنانا مقصود تھا اس لیے بھی یہ بات یقینی ہے کہ تصاویر کے لیے ضرور خالی صفحات چھوڑ دیے گئے تھے اور تصاویر ظفرنامہ تکمیل پا جانے کے بعد تیار کی گئی ہیں۔ یہ بات ہمیں مصر والی بوستان سعدی سے بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی کتابت کی تکمیل کی تاریخ ۸۹۳ھ ہجری ہے اور بہزاد کی تصاویر کی تکمیل کی تاریخ ۸۹۴ھ ہجری' ایک سال بعد کی ہے۔ ظفرنامے سے یہ بات اگرچہ ظاہر نہیں ہوتی لیکن قیاس ہے کہ اس میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اگر ظفرنامے کے اختتام کی تاریخ صحیح ہے تو اس کی تصاویر کے اختتام کی تاریخ ضرور کچھ اور ہوگی۔ اور پھر اگر ظفرنامے پر بہزاد کے دستخط ثبت ہوتے تو ہو سکتا تھا کہ اس بات کا انکشاف ہوتا۔ لیکن بقول ڈاکٹر آرنلڈ کے اس کی تذہیب نگاری کے وقت اصل حاشیہ ضائع ہو گیا ہے' اس لیے یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی۔

قیاس کہتا ہے جب خلیل مرزا شاہ رخ کے دربار سے منسلک تھا۔ تو بہزاد اس دربار سے بطور شاگرد کے وابستہ تھا۔ کیونکہ اس کے استاد میر روح اللہ میرک نقاش بھی اس دربار سے وابستہ تھے اور بہزاد نے اسی زمانے میں استاد روح اللہ سے کسب ہنر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے بہزاد نے اس زمانے میں مختلف استادانِ مصوری کے طرزِ مصوری کو دیکھا ہو اور بحیثیت شاگرد کے اس نے عمر کا کافی حصہ' وصلیاں' رنگ' برش' وغیرہ تیار کرنے میں صرف کیا ہو۔ مشرق ہو یا مغرب شاگرد اس قسم کی خدمات سے گزر کر ہی استادی کے رتبے کو پہنچے ہیں کیونکہ مشرقی دبستان مصوری اور مکتب کا طریقۂ تعلیم بھی یہی ہے۔ بہزاد بھی اسی دور سے گزرا ہے جس دور سے گزر کر ہر شاگرد استادی کے درجے تک پہنچتا ہے۔ اگرچہ بہزاد تمام استادانِ فن کے طرزِ نگارش سے فیض یاب ہوا ہے لیکن یہ اس کی فنی ذہانت اور کمال کا ثبوت ہے کہ اس نے ایک خاص طرزِ نگارش کو جنم دیا ہے جو آج بھی اس کے نام سے زندہ ہے۔ بہزاد نے اپنی طرزِ نگارش کے ذریعے نئی آنکھوں بندی' نئی طرح سازی' نئی ترکیب و تزئین کو فروغ دیا۔ اس نے نئے رنگ استعمال کیے ہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک' روح کی تسکین اور دل کا سرور ہیں۔ نیلا' زرد' سرخ' سبز اور سنہری رنگوں کے آزادانہ اور فن کارانہ استعمال سے اس کی ہر تصویر میں ایک وسعت اور گہرائی موجود ہے۔ نقش و نگار کے علاوہ زندگی' حرکت' توازن' صفائی اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ ان میں

سحر انگیزی اور سرور موجود ہے۔

بابر اور اخوند میر بہزاد کے ہم عصر تھے۔ قاضی احمد اور دیگر مبصرین تمام کے تمام اس کے فن کے مداح اور ثناخواں ہیں۔ لیکن ان سب کی تحریرات اور تصنیفات میں کہیں بھی اس قدر تفصیل نہیں ملتی کہ ہم بہزاد کے حالات اور کردار سے، اس کے بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا تعین کر سکیں۔ بہت کم لوگوں کو آج سے کئی سال پہلے اس کے اصل نام سے بھی واقفیت نہ تھی۔ آج چار صدی گزر جانے کے بعد بھی لوگ اسے بہزاد ہی کے نام سے جانتے ہیں نہ کہ کمال الدین کے نام سے۔ اس کے فن کا مطالعہ کرنے والے اس پر لکھنے والے اس کی نجی زندگی پر کچھ لکھتے ہیں اور نہ اس کی ازدواجی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں، نہ اس بات کی خبر ہے کہ اس کی رفیقۂ حیات تھی یا اس کی کوئی اولاد تھی یا نہیں، اگر تھی تو اس نے اس کی فنی روایات کا کہاں تک ساتھ دیا تھا۔ یہ بات بہزاد ہی سے متعلق مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے مشرقی فن کاروں پر بھی صادق آتی ہے۔ برعکس اس کے ان کے ہم عصر یورپین مصوروں اور فن کاروں سے متعلق پوری پوری تفصیل ملتی ہے کہ ان کا فن کیونکر پروان چڑھا تھا وہ کن مسائل اور وسائل سے دوچار رہے کن لوگوں سے ان کا واسطہ تھا انھوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ کس دربار یا سرکار سے وابستہ رہے اور کس کس کی ان کو سرپرستی حاصل تھی۔ گویا ان کے عہد بہ عہد حالات سے ہم بخوبی روشناس ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے معلوم ہوتا ہے استاد بہزاد نے شادی نہیں کی، وہ تمام عمر مجرد ہی رہا ہے۔ اس کے بھائی اور بہن ضرور تھے کیونکہ اس کے بھانجے اور بھتیجے کا ذکر ملتا ہے۔

ظفر نامہ کے بعد خمسہ امیر خسرو دہلوی جو پہلے کبھی ڈاکٹر مارٹن کی ملکیت تھا اب مسٹر بیٹی کی ملکیت میں ہے، نقادوں کی رائے کے مطابق بہزاد کے دوسرے مرقع جات پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ نسخہ جنگ جویانہ طرز سے مختلف ہے، اس میں تیرہ تصاویر ہیں اور پانچ مثنویاں ہیں۔ مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنون، آئینہ سکندری اور ہشت بہشت۔ نقادوں کی رائے کے مطابق یہ بہزاد کے دوسرے مرقع جات پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے بہتر مصور نسخہ نہ تو بہزاد سے پہلے دیکھنے میں آیا ہے اور نہ بعد میں۔ تصاویر پر بہزاد کے دستخط موجود نہیں ہیں، مگر اختتام پر بہزاد کا نام لکھا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر مارٹن نے بہزاد پر جو علیحدہ کتاب لکھی ہے اس میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ تصاویر

بہزاد ہی کی ہیں۔ دوسرے ماہرین کی رائے ہے کہ کچھ بہزاد کی ہیں اور کچھ دوسرے مصوروں کی ہیں۔ ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ کم سے کم تین اور مصوروں نے اس میں کام کیا ہے۔ اس کے رنگ تازہ ترین شوخ، چمکدار اور خوش کن ہیں۔ پس منظر میں اکثر تصاویر میں سنہری رنگ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ خمسہ ہرات اسکول کا بہترین کارنامہ ہے۔ تمام تصاویر طراحی اور تراکیب کا بہترین مظہر ہیں۔ یہ خمسہ محمد ابن اظہر نے لکھا ہے۔ مولانا اظہر ایک باکمال خطاط تھے، مولانا جعفر کے شاگرد تھے۔ مولانا جعفر سلطان علی مشہدی کے ہم عصر ہوئے ہیں اور خود بھی بڑے باکمال خطاط تھے، مولانا اظہر نے یہ نسخہ ۸۴۰ھ ہجری میں لکھا تھا۔

ایرانی مصوروں نے شاہ نامے اور خمسہ جات لاتعداد مصور کیے ہیں، اکثر مصوروں نے انھیں مضامین اور واقعات کو قلم بند کیا ہے جو ان سے پیشتر مصوروں نے کیے تھے لیکن بہزاد نے ہمیشہ نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہمیشہ لوگوں کی توقع کے خلاف مضمون انتخاب کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ظفر نامہ، بوستان سعدی اور خمسہ نظامی اور خمسہ امیر خسرو میں اس نے غیر متوقع مضامین کو مصور کیا ہے۔ خمسہ امیر خسرو میں اس نے ایک تصویر بنائی ہے جس میں درویش رقص کر رہے ہیں اور حضرت نظام الدین اولیا مجلس میں بیٹھے ہیں، تصویر میں ایک درویش ستار لیے بیٹھا ہے درویش بالکل درویش نما نہیں ہے حضرت کا مرید معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے بہزاد کا مطلب امیر خسرو ہی سے ہو جو ستار لیے بیٹھے ہیں جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ تمام مرقع بہزاد کی رنگ آمیزی کا کمال ہے، تمام رنگوں میں اس قدر تازگی اور توانائی موجود ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے پیشتر ہی تمام تصاویر تیار کی گئی ہیں۔ مرقع پر حسین علی خاں المعروف میر نظام کی مہر ثبت ہے، اس کے علاوہ کسی ایک یحییٰ کی بھی مہر ثبت ہے۔

قاہرہ کی بوستان کے علاوہ چیز بیٹی کے ذخیرے میں ایک اور بوستان موجود ہے جس کو مولانا شمس الدین محمد کرمانی نے ۹۱۵ھ ہجری میں لکھا ہے۔ اس میں صرف ایک تصویر ہے جس کی پشت پر "قلم بہزاد" لکھا ہے۔ اگرچہ یہ بات شک پیدا کرتی ہے کہ یہ بہزاد کی نہیں ہے مگر تصویر کی ساخت اور طرز نگارش جو کمال اور خوبی رکھتی ہے مجبور کرتی ہے کہ اسے بہزاد سے منسوب کیا جائے۔ اس لیے بھی کہ تمام کتاب ہرات اسکول کے کام کی مظہر ہے۔ ایک اور بوستان سعدی مسٹر چیز بیٹی کے ذخیرے میں موجود ہے۔ اس میں گیارہ تصاویر ہیں جو بہزاد سے منسوب کی جاتی ہیں، اسے ۸۹۳ھ ہجری میں میر شیخ محمد ابن شیخ احمد نے لکھا ہے۔ تصاویر کو کسی حد تک بہزاد کی طرز نگارش سے مناسبت ضرور ہے لیکن اس کو بہزاد

کی تخلیق نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ہر فرد کی ڈرائنگ میں کچھ نہ کچھ خامی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مصور جو بھی ہے وہ اس بات کی استطاعت رکھتا ہے کہ اس کے کام کو بہزاد کی طرزِ نگارش سے مناسبت دی جائے۔ تصاویر کے رنگ بہزاد کی مانند تازہ ترین اور خوش رنگ ہیں۔ نیلا رنگ تو بے حد تازہ ترین استعمال کیا ہے اور یہ بہزاد سے مناسبت رکھتا ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک نسخہ خمسہ نظامی کا موجود ہے جو سنہ ۸۹۹ھ ہجری میں لکھا گیا تھا۔ اس میں سترہ تصاویر ہیں۔ تصاویر پلیٹ نمبر ۴۳-۴۲، بہزاد کی بنائی ہوئی ہیں اور پانچ تصاویر میرک کے ہاتھ کی ہیں جو بہزاد کا شاگرد تھا۔ تصاویر نہایت عمدہ اور بہترین ہیں۔ یہ خمسہ اس زمانے کی پیداوار ہے جب بہزاد اور میرک سلطان حسین مرزا کے دربار سے منسلک تھے۔ سینٹ پیٹرز برگ لینن گراڈ کی لائبریری میں ایک مرقع لیلیٰ مجنوں کا موجود ہے جس کو سلطان محمد نور نے لکھا تھا، اس میں چار تصاویر بہزاد کے ہاتھ کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد اس زمانے میں رنگ آمیزی میں کس قدر عروج پر تھا، اس عہد میں رنگ آمیزی میں اسے کس قدر کمال حاصل تھا۔ لینن گراڈ کے تمام مرقع جات روسیوں کو اردبیل کی لائبریری سے حاصل ہوئے ہیں۔ جب انھوں نے اردبیل پر حملہ کیا اور شہر کو لوٹا تو وہ ہزاروں بیش قیمت اشیا روس لے گئے۔ یہ مرقع جات جو آج لینن گراڈ کی ملکیت ہیں، ایک نایاب اور غیر فانی دولت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لائبریری شاہ عباس اول نے جامع مسجد اردبیل میں اپنے دادا شاہ اسمٰعیل صفوی کی یاد میں قائم کی تھی۔ لیلیٰ مجنوں کا ایک اور نسخہ جس میں صرف دو تصاویر موجود ہیں وہ بھی لینن گراڈ میں موجود ہے۔

برٹش میوزیم میں ایک اور نسخہ موجود ہے جس کا نمبر ۲۵۹۰۰ ہے۔ یہ سنہ ۱۰۴۸ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے اس میں بیس تصاویر ہیں معلوم ہوتا ہے اس خمسہ کی تصاویر بہزاد کے آخری زمانے کا کام ہیں۔ کیونکہ اس میں شاہ طہماسپ کے زمانے کی نوک دار کلاہ اور پگڑی استعمال کی گئی ہے۔ میٹروپالیٹن میوزیم نیویارک میں دیوان جامی کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس میں ایک تصویر میں درویشوں کو رقص کرتے دکھایا گیا ہے۔ کام کی نفاست اور عمدگی کی رو سے درویشوں کی یہ تصویر بہزاد کی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس پر بہزاد کے دستخط ثبت نہیں ہیں مگر بہزاد کی تمام خصوصیات کی حامل ضرور ہے۔ درویشوں کا حلقہ باندھ کر رقص کناں ہونا اس جنگ کا منظر پیش کرتا ہے جس کی تصویر برٹش میوزیم کے نسخہ خمسہ نظامی میں موجود ہے اور اس میں لیلیٰ مجنوں کے قبائل آپس میں برسرِ جنگ ہیں اور مجنوں تماشائی کی حیثیت میں محوِ نظارہ ہے۔ اس جنگ میں اونٹ گھوڑے

خاص طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ اس میں ایک تصویر میں مجنوں کعبہ شریف میں موجود ہے۔ کعبے والی تصویر میں سنہری، سبز، نیلے اور زرد رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ آرمینی مصنف سیکیین بے کی رائے ہے کہ یہ تصاویر پندرھویں صدی کا ابتدائی کام ہیں۔ ایک اور خمسہ نظامی برٹش میوزم لندن میں موجود ہے جس کا نمبر ۶۸۱۰ ۔ ۵ ہے۔ یہ رنگوں کے امتزاج "ترتیب" تراکیب اور پختہ کاری کا ایک عجیب و غریب کارنامہ ہے اور ہرات اسکول کا بہترین فن پارہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی بہزاد سے منسوب ہے۔ اس پر بہزاد کا نام ثبت ہے۔ یہ نسخہ مرزا علی برلاس کے لیے مکمل کیا گیا ہے اور مصور کیا گیا ہے۔ مرزا برلاس فارسی، سلطان حسین مرزا کا منظور نظر جرنیل تھا۔ اس مرقع کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی سات تصاویر پر بہزاد کے مشہور زمانہ شاگرد قاسم علی کا نام لکھا ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بقیہ تصاویر بہزاد نے بنائی ہیں کیونکہ کسی پر بہزاد کا نام موجود نہیں ہے۔ مگر کام کی نوعیت اور طرز نگارش، موضوع کی ادائی اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ ضرور بہزاد نے بنائی ہیں اور پھر کتاب کو بہزاد سے منسوب بھی کیا گیا ہے صفحہ ۲۷ اور ۱۳۵ پر غسل کی تصاویر ہیں اور پھر ایک میں لیلیٰ کے خاوند کی موت کا نظارہ پیش کیا گیا ہے۔ اس خمسے کی تصاویر میں خاص طور پر نیلے اور سیاہ رنگ کا زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مارٹن اور ڈاکٹر آرنلڈ جنھوں نے اس نسخے کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا ہے، ان کی رائے ہے کہ زیادہ تر تصاویر بہزاد ہی کے معجز نما قلم کی مرہون منت ہیں، اگرچہ سات پر قاسم علی کے دستخط موجود ہیں۔ یہ نسخہ شہنشاہ جہانگیر کے کتب خانے کی زینت بھی رہا ہے۔ جہانگیر نے ۱۰۱۴ھ ہجری میں نسخے کے شروع میں لکھا ہے کہ اس مرقع کی زیادہ تر تصاویر استاد بہزاد کے ہاتھ کی ہیں۔ پانچ تصاویر میرک کی بھی ہیں اور ایک استاد عبدالرزاق کے ہاتھ کی ہے۔ جو خمسہ نظامی لینن گراڈ میں موجود ہے۔ اس پر بہزاد کے دستخط نہیں ہیں لیکن میٹروپولیٹن میوزیم نیویارک کے نسخہ ہفت پیکر میں پانچ تصاویر پر بہزاد کا نام موجود ہے۔ مگر بعض نقاد ہفت پیکر کو بعد کی تخلیق سمجھتے ہیں۔

برٹش میوزیم میں ایک اور خمسہ نظامی موجود ہے، اس کا ذکر ڈاکٹر مارٹن نے بھی کیا ہے۔ اس میں ۲۲ تصاویر ہیں اور یہ بہزاد کی ہیں۔ اس کے علاوہ برٹش میوزیم کے اس خمسہ نظامی کو بہت بڑی شہرت حاصل ہے جو کئی سال ہوئے نشر و اشاعت کی مشہور فرم اسٹوڈیو لندن نے نظامی کے نام سے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر بینن مرحوم نے اس کو ترتیب دیا اور اس پر ایک سیر حاصل تبصرہ بھی لکھا تھا۔ اس

میں ایرانی مصوری اور شاہ طہماسپ کے مصوروں کا تفصیل سے ذکر ہے۔ اس خمسے میں یوں تو سترہ تصاویر ہیں لیکن مبصرین کی رائے کے مطابق چودہ تصاویر اصل ہیں جو نسخہ تکمیل پاتے وقت اس میں موجود تھیں اور وہ ان مصوروں کا کام ہے جو اس نسخے کو تکمیل دینے کے لیے انتخاب کیے گئے تھے۔ چودہ تصاویر کے علاوہ جو تین تصاویر اور اس میں موجود ہیں وہ بعد کا اضافہ ہیں اور وہ ان تصاویر سے اور ان مصوروں کے کام سے بالکل لگا نہیں کھاتیں۔ یہ نسخہ شاہ طہماسپ کے لیے تکمیل دیا گیا ہے۔ اس کو پانچ مصوروں نے مصور کیا ہے۔ میرک، سلطان محمد، میر سید علی تبریزی، استاد مرزا علی اور مظفر علی۔ اس میں پانچ تصاویر پر میرک کا نام موجود ہے اور دو پر سلطان محمد کا۔ ڈاکٹر بین کا خیال ہے کہ حضورؐ کی معراج والی تصویر بھی سلطان محمد کا کام ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ معراج والی تصویر سلطان محمد ہی کا کام ہے۔ دو تصاویر پر استاد مرزا علی کا نام ثبت ہے۔ ایک تصویر جس میں ایک بڑھیا مجنوں کو ریچھ بنا کر رسی میں جکڑ کر لیلیٰ کے خیمے کے آگے لائی ہے، استاد میر سید علی تبریزی کی بنائی ہوئی ہے۔ ایک تصویر مظفر علی کی بنائی ہوئی ہے۔ باقی دو تصاویر پر شاید کسی کا نام نہیں ہے۔ اس میں بہزاد کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ یہ بہزاد کی وفات کے تین سال بعد تیار ہوا ہے یعنی ۹۴۷ہجری میں۔ یہ نسخہ مشہور کاتب شاہ محمود نیشاپوری کا لکھا ہوا ہے۔ یہ وہی شاہ محمود خطاط ہے جس کو شاہ اسمٰعیل نے جنگ چالڈران میں سلطان سلیم کے حملے کے وقت استاد بہزاد کے ساتھ ایک غار میں چھپا دیا تھا۔ شاہ محمود نیشاپوری مشہور و معروف خطاط تھا یہ اپنے ماموں مولانا عبدی کا شاگرد تھا جو مولانا سلطان علی مشہدی کے شاگرد تھے۔ یہ میر علی تبریزی اور مولانا سلطان علی مشہدی کی طرز میں خوب لکھتا تھا۔ اس کا اپنا بھی ایک خاص طرز تھا۔ خفی لکھنے میں کمال مہارت رکھتا تھا۔ شاہ طہماسپ کا منظور نظر اور خاص خطاط تھا۔ بے شمار قطعات' رسالہ جات اور مرقع جات اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اس نے مولانا جامی کی سبحۃ الابرار بھی لکھی تھی۔ تمام عمر شادی نہیں کی اور مجرد ہی رہا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اس میں ایک تصویر مظفر علی کی بھی بنائی ہوئی ہے۔ یہ استاد بہزاد کا بھانجا تھا۔ اس نے مصوری کا فن اپنے ماموں بہزاد سے سیکھا تھا۔ اس کا باپ حیدر علی جو تربتی کہلاتا تھا بہزاد کا بہنوئی اور شاگرد تھا۔ یہ بھی نامور مصور تھا۔ باپ بیٹا شاہ طہماسپ کے دربار سے منسلک تھے۔ جب صفوی دربار تبریز میں تھا۔ تو یہ بھی تبریز میں موجود تھے جب دربار قزوین میں منتقل ہوا تو یہ بھی قزوین میں آباد ہو گئے۔ سکندر بیگ منشی مصنف عالم آرائے

عباسی نے مظفر علی کو نادرہ کار چہرہ کشا لکھا ہے۔ یہ طراحی اور صورت سازی میں بے نظیر تھا خطاطی اور شطرنج کھیلنے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شاعر بھی تھا۔ میر علی تبریزی اور سلطان علی مشہدی کی طرز میں ایسی خطاطی کرتا تھا کہ لوگ دھوکا کھا جاتے تھے۔ چہل ستون میں اس کے ہاتھ کی بھی کئی تصاویر بنی ہوئی تھیں جو اب زمانے کی دست برد سے مٹ مٹا گئی ہیں۔ سنہ ۹۹۵ھ ہجری کے اواخر تک زندہ تھا۔ مشہور مصور صادقی بیگ اسی کا شاگرد تھا۔ ایک اور مصور رستم علی بھی تھا۔ یہ بہزاد کے بھائی کا لڑکا تھا۔ خطاط بھی تھا اور اس فن میں مولانا سلطان علی مشہدی کا شاگرد تھا۔ سلطان ابراہیم مرزا ابن بہرام مرزا کے کتب خانے میں کام کرتا تھا۔ تمام عمر استاد بہزاد کے ساتھ ہی رہا ہے۔ اس کی مصوری کا ایک نمونہ قصر یلدیز میں شاہ طہماسپ کے ایک مرقع میں موجود ہے۔ اور اس پر رستم علی شاہی رقم لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تبریز میں بہزاد کے پہلو میں دفن ہے۔

مشہور ترک مصنف مصطفیٰ عالی آفندی نے لکھا ہے کہ آغا میرک اور میر مصور بہزاد کے شاگرد تھے۔ سلطان محمد، قل محمد نقاش آقا میرک کے شاگرد تھے اور میر مصور، زین العابدین اصفہانی کے استاد تھے۔ میر مصور کے فرزند میر سید علی تبریزی نے بھی اپنے باپ سے کسب ہنر کیا تھا۔ آرمینی مصنف ہکیسین بے نے برج علی ازوبلی کو مہدی بیگ کا اور استاد حسین قزوینی کو سلطان محمد کا شاگرد بتلایا ہے۔ سکندر بیگ منشی نے بہزاد کے شاگردوں میں قاسم علی کو بہت شہرت یافتہ اور باکمال چہرہ کشا اور صورت ساز قرار دیا ہے۔ قاسم علی چہرہ کشائی اور صورت سازی میں یکساں مہارت رکھتا تھا۔ اس کی تصاویر سیکڑوں مرقعوں کی زینت ہیں۔ اسے تصویر کشی اور شبیہ سازی کی طرح نقاشی میں بھی یکساں قدرت حاصل تھی۔ مقصود علی، دوست محمد، ملا یوسف، دیوانہ نقاش، شیخ زادہ محمد خراسانی، استاد عبدالصمد بخاری اور حاجی محمد یہ سب بہزاد کے نامور شاگرد ہوئے ہیں۔ مقصود علی، طراحی اور پرداختی میں قاسم علی سے کسی صورت کم نہ تھا۔ ملا یوسف نہایت تیز دست اور بہتر ہنرور تھا۔ تصاویر سے زیادہ تذہیب نگاری میں استاد تھا۔ استاد بہزاد اور مولانا سلطان علی مشہدی اور دیگر مصوروں اور خطاطوں کے اس قدر شاگرد ہوتے ہیں کہ سب کو ترتیب وار بیان کرنا نہایت مشکل ترین کام ہے۔

بہزاد کے کام سے متاثر ہو کر مشہور نقاد روجر فرائی نے لکھا تھا کہ محدود تصویری طرز اور رنگ

آمیزی میں بہزاد کی مصوری ایرانی مصوری تو کیا مشرقی مصوری کی ایک کامیاب صورت پیش کرتی ہے، اس نے ان قیود سے آزاد ہو کر مصوری کی ہے جو عوام الناس کے خیال کے مطابق اسلام نے مصوری پر عاید کر رکھی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہزاد کے کام میں چینی مصوری کے اثرات کو دخل ہے۔ دراصل ایرانی مصوری چینی اثرات سے مبرا نہیں ہے۔ لیکن بہزاد پہلا مصور ہے جس نے ایرانی مصوری کو منگول اور عراقی اثرات سے پاک کیا ہے اور ایلخانی مصوری جو براہ راست چنگیزیوں کی وراثت تھی، اس سے الگ ایک نئی طرز نگارش پیدا کی ہے۔ تشبیہ سازی ہو یا مرقع سازی بہزاد کا کام اور اس کی طرز نگارش ہر صورت میں ہر رنگ میں پہچانی جاتی ہے۔

قاہرہ میوزیم میں بہزاد کی جو بوستان سعدی موجود ہے، وہ استاد کا ایک نادر روزگار کارنامہ ہے۔ یہ بوستان ۹۴-۸۹۳ ہجری میں تیار ہوئی ہے۔ اس میں استاد کی چھ تصاویر موجود ہیں، ان کا سائز حسب معمول کچھ بڑا ہے۔ یہ نادر مرقع ایرانی مصوری کی نمائش منعقدہ لندن ۱۹۳۰ء میں قاہرہ سے شمولیت کی خاطر بھیجا گیا تھا۔ کہتے ہیں ڈاکٹر مارٹن نے سب سے پہلے اس کو دریافت کیا تھا۔ اس نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو اُسے ایک تصویر پر بہزاد کے دستخط نظر آئے۔ اس زمانے میں خدیوان مصر ان نوادر کو بیش قیمت اور نایاب سمجھتے تھے اور ان کی قدر و قیمت کو غیر معمولی جانتے تھے اس لیے کسی غیر ملکی کو ان کو دیکھنے یا ان سے کسی قسم کا استفادہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر مارٹن کو باوجود ہزار منت و سماجت اور سفارشات کے ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ اس کی پرچھائیں بھی دیکھنے کو نہ دی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سولہ سال قبل ڈاکٹر مارٹن نے اس کے کچھ فوٹو فرور حاصل کئے تھے۔ اس زمانے سے لے کر لندن نمائش کے زمانے تک مصر میں کئی انقلاب آچکے تھے۔ بڑی حد تک لوگوں کے نظریات میں تبدیلی آچکی تھی اور یہ تبدیلی اس حد تک آچکی تھی کہ لندن نمائش کے موقع پر اس بوستان ہی کو نہیں بلکہ دیگر ایرانی مرقع جات اور نوادر کو بھی جو مصر کی ملکیت بنے تھے لوگوں کے استفادہ کی خاطر بخوشی بھیجا گیا تھا۔ لوگوں کے ذوق اور شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی اشاعت کی اجازت بھی دی گئی۔ ایرانی آرٹ کی اس منعقدہ نمائش پر ایک شاندار کتاب ترتیب دی گئی ہے اور شائع کی گئی ہے۔ اس کو مرحوم ڈاکٹر بین، مسٹر ولکنس اور باسل گرے نے ترتیب دیا ہے۔ یہ ان کی سعی اور کوشش سے عمدہ طور پر طبع ہوئی ہے۔ اس نمائش میں دنیا بھر کی حکومتوں نے حصہ لیا تھا اور اپنے اپنے عجائب گھروں اور ذاتی ذخیروں سے تصاویر اور مرقع جات اور دیگر ایرانی مصنوعات نمائش کی خاطر بھیجی تھیں

حکومت ایران نے بھی اس میں دل کھول کر حصہ لیا تھا اور وہ تمام تصاویر، مرقع جات اور نوادر بھیجے تھے جو ایرانی مصوری اور دیگر مصنوعات سے تعلق رکھتے تھے۔ حکومت ہندوستان نے بھی پوری طرح حصہ لیا تھا۔ ڈاکٹر بین، مسٹر ولکنسن اور باسل گرے نے ان تمام مرقع جات کے بارے میں سیر حاصل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ چنانچہ بوستان کے اس نسخے میں جس قدر تصاویر موجود ہیں ان کو رنگین اور سادہ شائع کر دیا ہے۔ مسٹر ولکنس نے اس پر خاص توجہ دی ہے اور اس پر محققانہ طور پر لکھا ہے۔ اس نے چار تصاویر پر بہزاد کے دستخط ثابت کیے ہیں۔ جناب ڈاکٹر مصطفےٰ جو قاہرہ میں آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر اور عجائب گھر کے بھی مہتمم ہیں، انھوں نے خود بھی اس بوستان کی تصاویر اور بہزاد اسکول سے متعلق دیگر تصاویر کو ایک چھوٹے سے مرقع کی صورت میں وزارت ثقافت اور قومی امور کی جانب سے چھاپ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سلطان حسین مرزا اور بہزاد کے شاگردوں پر اور ہرات اسکول پر اس مخطوطے میں ایک محققانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ شروع میں انھوں نے اپنا مقالہ جرمن زبان میں شائع کیا تھا۔ جس کو بعد میں ان کی جرمن نژاد اہلیہ فاطمہ مصطفےٰ نے انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ دو تین سال ہوئے ڈاکٹر صاحب پاکستان تشریف لائے تھے تو بہ نفس نفیس میرے گھر بھی تشریف لائے تھے۔ انھوں نے میری ذاتی مصوری کی تصاویر کے علاوہ میرا قدیم تصاویر اور خطاطی کا مجموعہ بھی دیکھا تھا۔ اسلامی مصوری اور اسلامی روح پرور نوادر کو دیکھ کر وہ بے حد محظوظ ہوئے تھے اور مجھے قاہرہ آنے کی دعوت دے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا مرقع مجھے خود عنایت کیا تھا۔ مرحوم صدر جمال عبدالناصر جب پاکستان آئے تھے تو گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں مجھ سے ملے تھے تو انھوں نے بھی مجھے قاہرہ آنے اور وہاں قدیم اور جدید نوادر اور آثار قدیمہ دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ مرحوم جمال عبدالناصر میری ذاتی تصاویر قاہرہ عجائب گھر کے لیے خاص طور پر لے گئے تھے۔

مرحوم مسٹر ولکنس نے اس نسخۂ بوستان پر برلنگٹن میگزین بابت فروری ۱۹۳۱ء میں ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ آرمینی مصنف سکیین بے نے بھی اس پر علیحدہ مضمون لکھا ہے۔ دونوں اصحاب نے اس نسخے کی فنی خوبیوں پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔

بوستان کا یہ نسخہ علی الکاتب خطاط نے ۸۹۳ھ ہجری میں سلطان حسین مرزا کی خوشنودی

کی خاطر لکھا ہے اور بہزاد نے اسے غیر فانی تصاویر کے ساتھ مصور کیا ہے۔ آخر میں ایک اور صفحہ چسپاں ہے جو بعد میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ تبریز میں استاد شمس الدین محمد کاتب نے [illegible] ہجری میں کیا ہے۔ اس پر ایک مہر بھی ثبت ہے۔ جو [illegible] ہجری کی ہے۔ یہ مہر شاہ عباس کے کتب خانہ کی ہے۔ تمام بوستان کی تذہیب و تزئین استاد کل محمد یاری نے انجام دی ہے۔ تمام عنوانات، لوحیں نقش و نگار بھی استاد یاری نے انجام دیے ہیں۔ استاد کل محمد یاری سلطان حسین مرزا کے نگار خانے میں ایک لائق فائق تذہیب نگار تھے۔ اس دور کے بیشتر مرقعے ان ہی کے ہاتھ کا کارنامہ ہیں۔ اکثر مرقعے جات میں مولانا یاری کا نام پایا جاتا ہے۔ بعض ان کو ہرات کا بتلاتے ہیں اور بعض ان کو شیراز کا کہتے ہیں۔ تذہیب نگاری میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ میر علی شیر نوائی نے اپنی کتاب مجالس النفائس میں ان سے متعلق لکھا ہے کہ "قلم اور زبان ان کی تعریف سے قاصر ہیں"۔ کہتے ہیں انھوں نے اپنے کسی کام کی خاطر کوئی جعلی فرمان بنالیا تھا جس کی پاداش میں سلطان نے ان کے قتل کا حکم صادر کیا لیکن میر علی شیر نوائی کی سفارش سے عذاب سلطانی سے نجات حاصل ہوئی۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کے دور حکومت تک زندہ تھے۔ نقاشی میں بھی خاص دست رس حاصل تھی۔ خط نستعلیق خوش خط اور خوبصورت لکھتے تھے۔ شعر نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ خود بھی شاعر تھے۔ انھوں نے مرقعے جات کے عنوانات صفحات اور حاشیوں کو مختلف طرز ہائے نگارش اور نقش و نگار سے مزین کیا ہے۔ بوستان کے شروع کے چار صفحات انھوں نے نہایت دلکش اور خوبصورت نگارش میں تکمیل دیے ہیں۔ ابتدا میں دو صفحات پر نچلے حصے میں باہر کی جانب ان کے دستخط موجود ہیں، یہ دستخط باریک خط میں ثبت ہیں مگر پھر بھی صاف طور پر پڑھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ لکھا ہے کہ اس نسخے میں بندہ یاری نے تذہیب نگاری کا کام انجام دیا ہے۔ اس بوستان کے حاشیے پر استاد یاری کے دستخط اور یادداشت دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ظفر نامے کے حاشیوں پر بھی کسی تذہیب نگار یا لوح بنانے والے فن کار کے ضرور دستخط یا تحریر موجود ہوگی۔ لیکن ڈاکٹر آرنلڈ کی تحقیق اور رائے کے مطابق ظفر نامے کی حاشیہ بندی دوبارہ کی گئی ہے، اس لیے ہوسکتا ہے یہ تمام معلومات ضائع ہوگئی ہوں۔ دستور کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ بوستان کا نسخہ کاتب اور تذہیب نگار کا کام ختم ہونے کے بعد استاد بہزاد کے سپرد ہوا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تصاویر بنانے کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی ہوگی، اور یہی طریقہ کار ظفر نامے کی تیاری میں استعمال کیا گیا ہے۔ استاد بہزاد نے پہلے ان تصاویر کو

بصورت طراحی کے یعنی خاکے کے طور پر ڈیزائن کیا ہے پھر ڈرائنگ کو پختہ کرنے کے بعد ان میں رنگ بھرے ہیں' اور رنگ بھرنے میں کافی عرصہ لگا ہے۔ یہ بات اس امر سے منکشف ہوئی ہے' کہ تصاویر پر ۸۹۳ھ ہجری اور ۸۹۴ھ ہجری بالترتیب درج ہیں۔ ظفرنامے کی مانند ابتدائی تصویر دوہری بنائی گئی ہے۔ دوہری سے میرا مطلب ہے بالمقابل آمنے سامنے۔ آخری چار تصاویر پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں جن پر کار بندہ بہزاد لکھا ہے اور نہ معلوم ایسا کیوں کیا گیا ہے کہ تمام تصاویر پر دستخط غیر معروف جگہوں پر کیے گئے ہیں۔

پہلی دوہری تصویر میں سلطان حسین مرزا کو اندرون حرم دکھایا گیا ہے جس میں چمن کو بھی دخل ہے یہاں ایک محفل رقص و سرود منعقد ہے۔ ناؤ نوش کا دور چل رہا ہے۔ سازندے ساز بجا رہے ہیں۔ حاضرین مجلس موسیقی اور رقص سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ تصویر کے دوسرے حصے میں اندرون ایوان اور چمن کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ سلطان حسین دائیں جانب قالین پر جلوہ افروز ہے۔ بہزاد نے اس تصویر میں بھی سلطان حسین مرزا کو سبز رنگ کے لبادے میں دکھایا ہے اور پگڑی سفید بنائی ہے اور سلطان نے ہاتھ میں پھول پکڑ رکھا ہے۔ بہزاد نے سلطان کے ہاتھ میں پھول دوسری شبیہوں میں بھی بنایا ہے۔ سبز رنگ کے لبادے میں ہم سلطان کو اکثر تصاویر میں دیکھتے ہیں! خصوصیت سے اس تصویر میں جو مارٹن نے شائع کی ہے۔ سلطان کی بائیں جانب ایک اور نوجوان بیٹھا ہے جس کا لباس مقابلتہً نیلا اور خوش رنگ ہے۔ محفل میں مغنی' رقاص۔ اور دوسرے اشخاص موجود ہیں' دوسری طرف دروازے سے باہر دائیں جانب ایک دربان ایک گداگر کو پیٹ رہا ہے۔ دروازے کے چاروں طرف خط نسخ میں بعض عبارات لکھی ہیں۔ آخری بند میں استاد بہزاد کا نام موجود ہے۔ مرور ایام سے اب یہ کسی حد تک ماند پڑ گیا ہے سوائے لفظ 'عمل' کے اور اس کے علاوہ حرف 'ب' ہے یا 'ش' اور کچھ موجود نہیں۔ بعض کا خیال ہے ہو سکتا ہے 'ش' کا حرف جو ہے وہ 'نقاش' کے لفظ کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر آرمینی مصنف سکیین بے کا خیال ہے خیال کیا بلکہ رائے ہے کہ بہزاد نے اپنے لیے نقاش کا لفظ کبھی استعمال نہیں کیا۔ کہا نہیں جا سکتا عمل کے بعد مصور کا نام کیونکر مٹ گیا۔ باغ والے حصے میں ایک حبشی خادمہ سفید شال اوڑھے کھڑی' تمام ماحول پر محاسبانہ نظر جمائے ہوئے ہے۔ ایک اور حبشی غلام مٹکے اٹھائے ہوئے لکڑی ٹیکتا جا رہا ہے۔ ایک اور غلام پھولوں کی ٹوکری اٹھائے آ رہا ہے۔ تمام مجلس پر سلطان کی نگاہ بھی ہے۔ سلطان کے آگے چوکی

پر جام و مینا رکھے ہوتے ہیں، ایک ملازم دوسرے کو مشروبات پیش کر رہا ہے۔ بائیں طرف نیچے ایک اور مجلس قائم ہے، اہل مجلس ایک دوسرے سے ہم کلام معلوم ہوتے ہیں، ایک درمیان میں کھڑا ہے۔ پس منظر میں قسم قسم کے پھول کھلے ہیں۔ مختلف اقسام کے پرندے چہچہا رہے ہیں۔ تصویر میں ایک غزال بھی موجود ہے۔ محفل میں سامعین موسیقار کو توجہ سے سن رہے ہیں۔ بعض خود گاتے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض پر رقص و سرود کی کیفیت طاری ہے۔ ہوش و حواس سے بیگانہ ہیں۔ بعض نے کپڑے پھاڑ دیئے ہیں۔ یہاں تک کہ سر سے پگڑیاں بھی اتر گئی ہیں۔ شراب کا دور چل رہا ہے۔ ساقی بار بار جام بھر کر دے رہا ہے۔ خادم قسم قسم کے کھانے اور مشروبات لا رہے ہیں اور لے جا رہے ہیں۔ مجموعی طور پر تصویر کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہزاد کس قدر عمیق مشاہدہ رکھتا تھا، اس نے ذرا ذرا سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ گداگر کو پٹنا، حبشی غلام کا لکڑی ٹیک کر چلنا، حبشی خادمہ کا محاسبانہ نگاہ رکھنا، یہ سب مصور کے مشاہدے کا ثبوت ہیں۔ مصور چاہتا تو ایسی تصاویر میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ مگر یہ اس کے کمال کا ثبوت ہے کہ اس نے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

تیسری تصویر بادشاہ اور چرواہے سے متعلق ہے۔ بوستان میں جو حکایت بادشاہ اور چرواہے سے متعلق ہے یہ تصویر اسی کے بارے میں ہے۔ حکایت کا موضوع یہ ہے کہ بادشاہ دارا ایک دن شکار کو گیا تو وہ اس قدر دور نکل گیا کہ اس نے اپنے آپ کو ایک لق و دق جنگل میں پایا جہاں ایک چرواہا گھوڑے چرا رہا تھا۔ جب بادشاہ کا چرواہے سے آمنا سامنا ہوا تو بادشاہ نے سمجھا کہ وہ دشمن کی حدود میں آ گیا ہے۔ اس نے جھٹ تیر و کمان سنبھال چرواہے پر حملہ کرنا چاہا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو چرواہا جھٹ بول اٹھا کہ اعلیٰ حضرت بادشاہ سلامت میں تو آپ کا نمک خوار ہوں اور آپ کے اصطبل کا خاص ملازم ہوں، معلوم ہوتا ہے حضور نے غلام کو پہچانا نہیں۔ بہزاد نے کمال ہنرمندی سے گھوڑوں اور حیوانات کی تصاویر بنائی ہیں۔ پس منظر نہایت خوبی سے ترتیب دیا گیا ہے آدمی اور حیوانات کے اعضا میں تناسب اور مناسبت موجود ہے۔ تصویر کے ہر کردار سے بہزاد کا کمال نمایاں ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہر کردار کی پیش کش میں مصور کو تزئین اور ترکیب پر قدرت حاصل ہے۔ کوئی کردار اپنے معیار سے گرا ہوا نہیں۔ تمام تصاویر کے رنگ آنکھوں کے لیے ٹھنڈک اور سرور پیدا کرنے والے ہیں۔ گھوڑوں کے زین، آدمیوں کے لباس، درخت، بیل بوٹے، نقش و نگار، غرض ہر چیز پر مقصود

نے خاص توجہ دی ہے۔ ہر چیز کو محبت اور محنت سے بنایا ہے۔ ہر چیز کی استخواں بندی محنت اور کوشش سے کی گئی ہے۔ بہزاد نے ہر چیز خلوص اور لگن سے بنائی ہے۔ بہزاد کی نظر میں ہر چیز اور ہر کردار زندۂ جاوید ہے۔ بیرونی مناظر کی رو سے استاد کی یہ تصویر اپنا مقام الگ رکھتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ بہزاد ہر چیز کو عمیق نظر سے دیکھتا ہے، اس لیے کسی چیز کو نظر انداز نہیں کرتا خواہ وہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ تصویر کی ابتدا میں ایک گھوڑی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے' بہزاد کی یہ عمیق نظری کا ثبوت ہے کہ اس نے اس معمولی سے واقعے سے بھی لاتعلقی ظاہر نہیں کی۔ مصور چاہتا تو اس کو نظر انداز کر سکتا تھا مگر اس نے اس معمولی سے واقعے کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ ترکش کے جزدان پر بہزاد کے دستخط موجود ہیں۔ ڈاکٹر مارٹن نے اپنی کتاب میں اس مضمون کی ایک اور تصویر شائع کی ہے جس کو شیخ سدا محمد مصور نے بنایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصور سدا محمد نے بہزاد کی تصویر کی نقل کی ہے۔

چھوٹی تصویر مسجد کا منظر پیش کرتی ہے۔ مسجد مسلمانوں کے لیے عبادت کا گھر ہے جہاں امیر و غریب ہر نقطۂ خیال کے لوگ بلا روک ٹوک عبادت کی غرض سے آزادانہ آجا سکتے ہیں۔ مصور نے مسجد کو اندر اور باہر سے دیکھا ہے بلکہ اندر اور باہر سے بنایا ہے۔ کوئی نماز میں مشغول ہے کوئی ابھی وضو کر رہا ہے کچھ بیٹھے ہیں کچھ مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ بائیں ہاتھ فرش پر ایک آدمی وضو کر رہا ہے۔ ایک حبشی غلام اس کے لیے تولیہ لیے کھڑا ہے۔ اس کے ساتھ دروازے کے ساتھ ایک درویش نما فقیر ایک نمازی سے خیرات مانگ رہا ہے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں بھی مسجد میں آنے والے لوگوں کو گداگر تنگ کیا کرتے تھے اور ان کو فقیروں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ایک شخص اندر صحن میں دیوار کے ساتھ نماز میں مشغول ہے' ایک نے نماز شروع کرنے کی نیت سے ہاتھ اٹھا رکھے ہیں۔ محراب کے قریب منبر سے ہٹ کر ستونوں کے درمیان جو دو آدمی بیٹھے ہیں' ان میں سے ایک نے کتاب اٹھا رکھی ہے' اس کتاب پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں' حسب معمول یہ انھیں الفاظ میں لکھے گئے ہیں" کاربندہ بہزاد"۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بہزاد معمولی سے معمولی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ نماز میں مشغولیت، نماز کے لیے نیت کرنا ہاتھ اٹھانا' فقیر اور گداگر' مسجد میں ایک دوسرے کا آپس میں مشغول ہونا' یہ تمام باتیں مصور کے مشاہدے کا ثبوت ہیں اور اس بات کا بھی کہ وہ ہر قسم کے خیالات کی ادائی پر قدرت رکھتا تھا۔ باوجود درباری مصور ہونے کے معمولی عوامی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ پانچویں تصویر بھی مسجد کے موضوع

سے متعلق ہے۔ اس میں بھی مسجد کے اندرونی حصّے کو اور وہاں کے حالات کو تصور کیا گیا ہے۔ کچھ علماء کھڑے ہیں اور کچھ لوگ بیٹھے ہیں کوئی اکیلا ہے۔ اور کچھ اکٹھے ہیں۔ میرے خیال میں یہ تصویر بہزاد کا ایک غیر فانی شاہکار کہلانے کی مستحق ہے اور مصور کے کمال کا ثبوت بھی۔ اس تصویر میں بہزاد اپنے فن کے عروج پر نظر آتا ہے۔ ویسے بھی یہ کارنامہ ان ایام کا معلوم ہوتا ہے جب مصور کا کمال پوری توانائی کے ساتھ برسر کار تھا۔ عمارات کی تزئین و تشکیل، اشخاص کی استخواں بندی، رنگ آمیزی اور ہم آہنگی اور دیگر خصوصیات کو دیکھ کر اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بہزاد کو دوسرے فن کاروں پر جو فوقیت حاصل ہے وہ بے سبب نہیں ایک چند انچ کے کاغذ پر کئی چہرے اور کردار ترتیب دینا" پھر اس کاغذ پر عمارت، پس منظر، اندرونی منظر اور پھر عمارت کی تمام جزئیات کی تزئین و تشکیل کرنا مصور کے کمال فن کا ثبوت ہے۔ اور پھر کمال کی بات یہ ہے کہ مصور کسی غیر ملکی تصویر کشی سے شناسا نہیں اور نہ اس نے کسی دوسری قوم کی مصوری کا مطالعہ کیا ہے۔ عمارت کی محراب اس کا اندرونی حصہ" پھر صحن اور صحن کے در و دیوار ان کے ساتھ ساتھ دیوار پر خوش خطی" اس کی طرز نگارش، محراب پر نقش و نگار اور بیل بوٹے اور ان کی ترتیب و تزئین، اندرونی دیوار پر نقش و نگار، عربی اقلیدسی جالی کا ڈیزائن اور اس کی تزئین اور تکمیل تمام جزئیات ایک غیر فانی فن کاری کا مظہر ہیں۔ تصویر میں صحن میں ایک شخص سرخ لباس میں بار بجاتے دکھایا گیا ہے۔ استخواں بندی یعنی COMPOSITION کی رو سے مصور کا یہ بہت بڑا کمال ہے اور اس کی ذہانت اور فن کاری کا مظاہرہ ہے۔ مصور نے صرف ایک پیکر سے ایک کردار سے تمام تصویر کا نقطۂ عروج پیدا کیا ہے گویا یہ تصویر کا مرکزی کردار ہے جس پر تمام تصویر کی اچھائی اور برائی کا انحصار ہے۔ دو انسان جو دائیں طرف بیٹھے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مصور تصویر کشی میں توازن کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے یعنی COMPOSITION یا استخواں بندی پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔ اندر کی محراب کی ابتدا میں ایک شخص بیٹھا ہے یہ استخواں بندی کا بہت بڑا کمال ہے جو تمام تصویر کو بے توازن ہونے سے بچا رہا ہے۔ اور پھر ذرا دور جا کر اندر دو اشخاص کسی گہرے غور و فکر میں مشغول ہیں۔ تمام تصویر میں طراحی کی جان رنگوں کا امتزاج ہے۔ رنگوں کا امتزاج اور ان کا انتخاب بے حد دلکش اور جاذب نظر ہے۔ خطوط کی روانی۔ نزاکت اور توانائی بہت بڑا کمال رکھتی ہے۔ میرے خیال میں یہ تصویر ایرانی مصوری کا بہت بڑا شاہکار ہے۔ شاہکار اس لیے کہ چند انچ

کاغذ کے ٹکڑے پر اس قدر افکار اور کردار کی استخواں بندی کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یورپین مصوروں کی مانند نہیں کہ دیوار برابر کینوس پر جو چاہا بنا دیا جو چاہا مٹا دیا۔ جہاں طبیعت آئی پیکر کھڑا کر دیا جہاں چاہا پیکر بٹھلا دیا۔ چھوٹے کاغذ پر چھوٹی سی جگہ میں ایک وسیع مضمون کو قلمبند کرنا اور تکمیل دینا اور ترتیب دینا' مشرقی مصور کا کمال ہے۔ ظفر نامے میں ایک دو ہی ایسی تصویر ہوگی جس میں تیس چالیس آدمیوں سے کم آدمی بنائے گئے ہوں۔ اسی طرح بوستان کی اس تصویر میں مختلف کردار بنائے گئے ہیں۔ جو مختلف مصروفیات میں منہمک ہیں۔ اس تصویر میں محراب پر عبارت تحریر ہے اور تحریر کے اردگرد آؤٹ لائن کو تحریر کیا گیا ہے۔ بائیں جانب آخر میں یہاں بھی بہزاد کے دستخط موجود ہیں اور اس نے یہاں اپنے نام کے ساتھ تاریخ اور سال بھی لکھا ہے چنانچہ ۸۹۴ھ ہجری کی تاریخ ثبت ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کتابت کے اختتام کی جو تاریخ کاتب نے ۸۹۳ھ ہجری لکھی ہے' اس کے ایک سال بعد بہزاد نے اپنی تصاویر تکمیل دی ہیں۔ اس سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ کسی مرقع کو تکمیل دیتے وقت خطاط نے وہ صفحات خالی چھوڑ دیے ہیں جن پر مصور کو تکمیل دینا یا بنانا منظور ہوتا تھا۔ اور تمام نسخہ تذہیب' نقش و نگار' تصویر کشی' جدول اور خط کشی ہو جانے کے بعد جلد بندی میں جاتا تھا اور تکمیل پاتا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرقع کن مراحل سے گزر کر مکمل صورت اختیار کرتا تھا اور پھر کسی خاص تقریب کے موقع پر سلطان وقت کی خدمت میں پیش ہوتا تھا۔ بعض اوقات اس مرقع کی تکمیل کی خوشی میں خاص تقریب بھی ترتیب دی جاتی تھی اور مصور کو انعامات اور خطابات سے نوازا جاتا تھا۔

پانچویں تصویر کے بعد چھٹی تصویر ہے جو اس مرقع کی آخری تصویر ہے اور بلاشک و شبہ ایرانی مصوری کا بے مثل شاہکار ہے۔ یہ تصویر حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا سے متعلق ہے اور یہ اس واقعے پر قلمبند کی گئی ہے جو اس قصّے کی جان ہے یا اسے کہانی کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ لفظ قصہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ قرآن نے خود اس واقعے کو احسن القصص کہا ہے یعنی قصوں میں سے بہترین قصہ۔ تصویر اس واقعے پر بنائی گئی ہے کہ جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں گرفتار ہو کر ان کو حیلے بہانے سے محل میں بلایا ہے۔ اس موضوع کو دوسرے مصوروں نے بھی مصور کیا ہے مگر بہزاد کی شان کچھ اور ہی ہے۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے قرآن حکیم نے بھی اس واقعے پر پوری

پوری روشنی ڈالی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی نیکی، پارسائی اور سیرت کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا حیلے بہانے سے بلا کر سات کمروں والے محل میں لے جاتی ہے تو سب دروازے بند کر لیتی ہیں اور ان کو گرویدہ کرنے کی خاطر اور مائل بہ گناہ کرنے کی خاطر طرح طرح کے طور طریق آزماتی ہے لیکن حضرت کسی طور بھی اس کے مکر و فریب میں گرفتار نہیں ہوتے۔ جب ہر قسم کی رعنائی، دلکشی اور محرکات سے بھی حضرت قابو میں نہیں آتے اور آمادہ گناہ نہیں ہوتے تو پھر زلیخا زبردستی پر اتر آتی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام اس کی ہر قسم کی بے حیائی اور مذموم حرکات سے تنگ آکر بھاگ اٹھتے ہیں لیکن زلیخا نے تمام محل کے دروازے پہلے ہی سے بند کر رکھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہ مفر کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی حضرت چھٹکارا حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں اور زلیخا ان کا تعاقب کر رہی ہے۔ قوت ایمانی اور رحمت خداوندی کے شامل حال ہونے کے باعث ساتوں دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں اور حضرت اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر بھاگتے میں زلیخا حضرت کا دامن پیچھے سے پکڑ لیتی ہے اور حضرت دامن چھڑا کر اس کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ اس چھینا جھپٹی اور بھاگنے میں حضرت کا دامن پیچھے سے پھٹ جاتا ہے اور پھٹا ہوا حصہ زلیخا کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ چونکہ حضرت کا دامن پیچھے سے پھٹا تھا اس لیے یہ بات حضرت کی بے گناہی کی ایک قدرتی گواہی بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب عزیز مصر کے روبرو یہ واقعہ پیش ہوتا ہے اور حضرت پر فرد جرم عاید ہوتی تو قانون کی نظر میں دامن کا پیچھے سے پھٹنا حضور کو بے گناہ ثابت کرنے میں معاون ثابت ہوا اور حضور کو بری الذمہ قرار دیا گیا۔ اس برے ارادے کی غرض سے زلیخا نے سات کمروں والا محل انتخاب کیا تھا جس کے در و دیوار اور نقش و نگار کو عریاں تصاویر اور بے حیائی کی مورتوں سے سجایا گیا تھا۔ جب ان تمام کمروں سے گزر کر آخری کمرے میں حضرت کو بند کیا گیا ہے اور زلیخا نے عرض مدعا بیان کیا ہے اور آپ کو آمادۂ گناہ کرنا چاہا ہے تو اس آزمائش کی گھڑی میں حضرت کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ آپ بھاگ اٹھتے۔ چنانچہ بہزاد نے اس بھاگنے کے واقعے کو تصویر کے روپ میں ڈھالا ہے، جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، یہ تصویر اس مرقع کی چھٹی اور آخری تصویر ہے۔ یہ مصور کے کمال کا بہترین کارنامہ

ہے۔ مصور نے سات کمروں کے نفظ کو قلمبند کرنے کی غرض سے بے حد ذہانت اور قدرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ نیچے سے اوپر تک دایئں سے بایئں تک ایک ایک ذرے پر مصور نے اپنے کمال کا ثبوت دیا ہے۔ بہزاد نے تصویر کی استخوان بندی یعنی COMPOSITION کرنے میں جو ذہانت اور قدرت دکھائی ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ کوئی دیوار، کوئی محراب، کوئی دروازہ کوئی صحن، کوئی فرش، غرض کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں مصور نے اپنا کمال نہ دکھایا ہو۔ پھر بیان کرنا پڑتا ہے کہ مصور نے آٹھ دس انچ کے کاغذ کے ٹکڑے میں کس قدر وسیع مضمون کو کیونکر سمو کر رکھ دیا ہے۔ یورپین نقاد اور مصور مصوری میں DIMENSION یعنی لمبائی چوڑائی گہرائی اور سطح کے جویا ہوتے ہیں۔ کیا وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بہزاد نے چھوٹی سی تصویر میں کس قدر وسعت، گہرائی، طول اور عرض استعمال کیے ہیں یعنی کس قدر DIMENSION دکھائے ہیں؟ اس میں ہرگز مبالغہ نہیں ہے اگر یہ کہا جائے کہ یہ مرقع اور اس کی تصاویر بہزاد کا ایک غیر فانی شاہکار ہیں۔ یہ مرقع ظفرنامے سے اکیس یا بائیس سال بعد کی تخلیق ہے مگر بہزاد کا قلم ویسا ہی جوان اور توانا نظر آتا ہے جیسا ظفرنامہ مصور کرتے وقت تھا۔ بوستاں کی تصاویر میں ظفرنامے کی تصاویر سے زیادہ ایک قسم کی پختگی اور تازگی پائی جاتی ہے ظفرنامہ اور بوستان کے درمیانی وقفے میں بہزاد نے کئی اور مرقع جات بھی تخلیق کیے ہیں اور وہ بھی جوں کے توں فن کے عروج پر نظر آتے ہیں۔ خمسۂ نظامی، خمسۂ امیر خسرو، سلطان حسین مرزا کا دیوان، میر علی شیر کا کلام "لیلیٰ مجنون" ہفت پیکر، یہ سب توانائی اور پختہ کاری کے مظہر ہیں۔ بوستان کی آخری تصویر میں دو کھڑکیوں کے درمیان حضرت یوسف علیہ السلام کی بائیں جانب ان کے سر کے مقابل بہزاد کے دستخط ثبت ہیں۔ بالکل انھیں الفاظ کے ساتھ جس طرح اس مرقع کی بقیہ تصویر میں موجود ہیں۔ "کاربندہ بہزاد"۔ جو کتابچہ اس بوستان پر ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب نے شائع کیا ہے اس میں بوستان کی چھ تصاویر کے علاوہ چھ اور تصاویر شائع کی ہیں۔ یہ چھ تصاویر بہزاد کے شاگردوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ جن میں قاسم علی اور بہرام علی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تصاویر سے بہزاد کے طرز نگارش اور اس کے شاگردوں کے کام پر روشنی پڑتی ہے۔

بہزاد کے مرقع جات اور دیگر مصوروں کی تصاویر سے ہمیں اس زمانے کے رسم و رواج، روزمرہ کی ضروریات، جنگ و جدل، سامان حرب، سامان عیش اور عوام کے معمولات اور مصوروں کے طریقہ کار سے کہ وہ کس طرح کام کرتے تھے، روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔ امیر سے لے کر سلطان تک، غریب سے لے کر گنوار اور دیہاتی تک کے رہن سہن، کام کاج اٹھنے بیٹھنے سے ہم باخبر ہوتے ہیں۔ ایسی ہی چیزوں سے گزشتہ قوموں کے حالات اور تاریخ سے موجودہ قوموں کو علم حاصل ہوا ہے۔ فراعنہ مصر کے مقابر، اجنتا کے غار، بابل اور نینوا اور ایران کے آثارِ قدیمہ سے تاریخ سازی میں بہت بڑی مدد ملی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، بہزاد نے بچپن میں ہر ہنر میں دسترس حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے زمانۂ شاگردی میں ہر استاد سے کسب ہنر کیا تھا۔ خواہ وہ خطاط تھا یا نقاش۔ تذہیب نگار تھا یا مصور۔ مہندس تھا یا معمار۔ اس لیے بھی کہ ایشیا میں شاگردوں کو ان تمام فنون سے واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے، یہ بات الگ ہے کہ کسی نے بعد میں کسی نے شروع میں کسی خاص صنف میں پختگی اختیار کی ہو اور اس میں نام پیدا کیا ہو۔ مگر ہر فن کار کو ہر صنعت ضرور آتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر مصور بہترین خطاط بھی تھے۔ بہترین نقاش اور تذہیب نگار بھی اور شاعر بھی۔ اس بات کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ بہزاد مہندسی میں بھی کافی دخل رکھتا تھا چنانچہ اس بات کا ثبوت اس کی اکثر تصاویر سے ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ظفر نامے میں ایک تصویر ہم دیکھتے ہیں کہ سمرقند کی مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔ معماروں نے باڑھ باندھ رکھی ہے۔ سیڑھیاں لگ رہی ہیں مزدور باقاعدہ مسالہ گارا چونا تیار کر رہے ہیں۔ مہندس اور معمار مصروف کار ہیں، پتھر کاٹنے والے مسالہ لانے والے سرگرم عمل ہیں۔ ہاتھی اور اونٹوں پر پتھر اور سامان آ رہا ہے۔ اس بات کی تصدیق ایک اور تصویر سے بھی ہوتی ہے جو خمسۂ نظامی کے اس نسخے میں ہے جو برٹش میوزیم کی ملکیت ہے۔ اس میں ایک تصویر میں مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔ معماروں نے یہاں بھی باقاعدہ باڑھیں باندھ رکھی ہیں۔ مختلف حصوں میں عمارت پر کام ہو رہا ہے۔ الگ طور پر مسالہ، چونا، گارا وغیرہ بنایا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں بہزاد نے ہرات کے باغ بہشت کے طور کا نقشہ تیار کیا تھا۔ چنانچہ اس قسم کے کام ایک مہندس ہی انجام دے سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ مہندسی میں

مہارت رکھتا ہو۔ اس قسم کی ایک تصویر کی نقل جہانگیر نے اپنے زمانے میں شفیعہ بانو سے بنوائی تھی۔ بہزاد کی اس قسم کی تصاویر میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بہزاد کاشی کاری، نقش ونگار اور عمارات پر کتبات، اشعار اور تحریرات کا نہایت آزادانہ استعمال کرتا ہے اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی تصاویر میں ان تمام خوبصورتیوں اور جزئیات کا خود ذمہ دار تھا، وہ جملہ جزئیات کو خود تخلیق کرتا تھا اور انجام دیتا تھا۔ اس کی تصاویر میں عمارات پر جو کتبات اور عبارات لکھی ہوتی ہیں وہ نستعلیق اور نسخ میں پائی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں آیات قرآنی بھی رقم کی گئی ہیں اور یہ آیات ہر جگہ خط نسخ میں لکھی گئی ہیں کیونکہ وہ ان باتوں کا خود ذمہ دار تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط نستعلیق خط نسخ اور دیگر خطوں پر بھی برابر قدرت رکھتا تھا۔

بہزاد کو ہر موضوع پر طبع آزمائی کرنے میں کمال حاصل تھا۔ محبت، نفرت، رزم و بزم، خلوت اور جلوت، سلطانی اور فقیری، غرض جملہ موضوعات پر اس نے طبع آزمائی کی ہے اور تصاویر بنائی ہیں۔ بیرونی مناظر، جھیل، دریا، پہاڑ، شجر، حجر، پھول پتے، ایوان اور محل، گھر اور جھونپڑی، مصور نے کسی چیز کو بھی بنانے سے گریز نہیں کیا۔ اس نے جانور اور حیوانات کی تصاویر بنانے میں بھی کمال دکھایا ہے۔ چنانچہ اس کی چند تصاویر اونٹوں اور گھوڑوں سے متعلق پائی جاتی ہیں۔ جن میں ایک دو بہت مشہور ہیں خصوصیت سے وہ تصویر جس میں دو اونٹ آپس میں برسرپیکار ہیں اس تصویر کی نقل جہانگیر نے اپنے درباری مصور نانہا سے بنوائی ہے۔ بہزاد نے اپنی تصویر پر اس کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے کہ یہ تصویر میں نے ستر سال کی عمر میں بنائی ہے۔ یہ ایک واحد واقعہ ہے جو بہزاد کے معاملے میں ہمارے ملاحظے میں آتا ہے اور ورنہ ظفرنامہ اور خمسہ نظامی جیسے مرقع جات اور کئی شبیہات بہزاد کے ہاتھ کی ملتی ہیں جن پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں لیکن اس قسم کی کوئی تحریر کسی پر موجود نہیں ہے۔ نہ معلوم مصور کو کیا ضرورت پیش آئی ہے جو اس نے اپنی اس تخلیق پر اس قسم کی تحریر ثبت کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ہندوستان میں جہانگیر کے زمانے میں بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔ چنانچہ فرخ بیگ قلماق نے بھی ایک بڈھے کی تصویر پر یہ الفاظ لکھے ہیں کہ یہ تصویر اس نے ستر سال کی عمر میں بنائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصوروں کا یہ مطلب ہے کہ وہ ستر سال کی عمر میں بھی توانا اور برسرعمل ہیں۔ بہزاد کی تصویر میں دو اونٹ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں

اور ان کو ان کے ساربان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو تصویر جہانگیر کے مصور نے بنائی ہے وہ بالکل اس کی نقل ہے اور یہ سنہ ۱۰۱۱ ہجری میں بنی ہے۔ اس پر جہانگیر نے اپنے دستخط کیے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ بہزاد کی تصویر کی نقل ہے جسے میرے حکم سے نانہا مصور نے بنایا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں تصاویر عجائب خانہ ایران کی ملکیت ہیں اور دونوں تصاویر ایک ہی وقت میں لوگوں کے ملاحظے کی خاطر لندن میں ایرانی نمائش میں پیش ہو چکی ہیں۔ دونوں تصاویر مضمون، ترتیب، ترکیب اور استخواں بندی کی رو سے بالکل ایک جیسی ہیں۔ نقل کنندہ نے ہر چیز کی پوری پوری نقل کی ہے، اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ جس جگہ بہزاد نے اپنی تحریر ثبت کی ہے اور جس صورت میں کی ہے اسی جگہ اسی طرز میں شہنشاہ جہانگیر نے اپنی تحریر ثبت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے شہنشاہ جہانگیر کس قدر صاحب ذوق اور صاحبِ نظر تھا اور کس قدر بہزاد کا والہ و شیدا تھا کہ اصل کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس کی تصاویر کی نقل بنوا کر اپنے ذوق اور شوق کی تشنگی دور کرتا تھا۔ اس کی دیدہ وری اور ذوق نظری کو آج قدرت نے یکجا کر دیا ہے کیونکہ دونوں تصاویر لوگوں کے ملاحظہ میں ایک ساتھ آتی ہیں۔ اس بات سے ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی سامنے آئی ہے کہ جہانگیر کا ذوق مصوری کس قدر بلند اور اعلیٰ تھا۔ وہ ذرا سی خوبصورتی اور جمالیاتی حسن کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ روح کی تسکین اور دل کا سرور حاصل کرے۔ اونٹوں کی لڑائی کا موضوع جہانگیر کے وقت اور اس کے بعد بھی مصوروں کے لیے دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ اونٹوں، ہاتھیوں اور بیلوں کی لڑائی کو جہانگیر کے حکم سے لاہور کے قلعے کی شمال مغربی دیوار پر نہایت عمدگی سے مختلف حالتوں میں بنایا گیا تھا بلکہ اس چیز کو گوالیار میں راجہ مان سنگھ کے محل میں بھی آزمایا گیا تھا۔ اونٹوں کی لڑائی کی ایک تصویر ہمیں بمبئی میوزیم میں بھی موجود نظر آتی ہے جو مذکورہ تصویر کی نقل ہے مگر یہ ذرا مختلف صورت میں ہے۔ ایک تو اونٹ قدرے بڑے ہیں اور دوسرا فرق یہ ہے کہ اس میں ساربان نہیں بنائے گئے۔ کسی ہندوستانی مصور کا کام ہے جو فرخ سیر کے زمانے میں یا بعد میں عمل میں آیا ہے۔ ایسی ایک اور تصویر ملتی ہے جو کبھی لندن کی مشہور فرم BENARO. QUARTIGE کے پاس تھی، یہ بھی کسی ہندوستانی مصور کا کام ہے۔ اونٹوں کی لڑائی کے علاوہ ہندوستانی مصوروں نے ہاتھیوں کی لڑائی کو ہر

دور میں مصور کیا ہے، چنانچہ ہاتھیوں کی لڑائی کی بے شمار تصاویر اور خاکے پائے جاتے ہیں جو اچھے بھی ہیں اور برے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ بیلوں اور جنگلی بھینسوں کی لڑائی کو بھی بنایا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ سب بہزاد کی اونٹوں کی لڑائی کا اتباع ہے جو مصوروں نے مختلف ادوار میں کیا ہے، اور پھر اونٹوں کی لڑائی سے ہاتھی، بیل اور بھینسوں کی طرف اپنی مصوری کا رخ موڑ دیا ہے۔ جہاں تک اونٹوں کی لڑائی کے نفس مضمون کا تعلق ہے یہ دراصل چینی مصوری سے ایرانی مصوری میں آیا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے بہزاد نے بھی یہ مضمون ایک منگول مصور کے خاکے سے اپنایا ہے۔ منگول مصور کا یہ خاکہ استنبول ترکی میں عجائب خانہ توپ کپو سرائے میں موجود ہے حال ہی میں امریکہ سے شائع شدہ رسالے ART OF ORIENT کی پہلی جلد میں شائع ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے اس خاکے کی ترکی یا ایرانی کسی اور مصور نے بھی نقل بنائی ہو۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے، اس منگول مصور کے خاکے کو اولیت حاصل ہے۔ اونٹ کی ایک اور تصویر بہزاد کے ہاتھ کی ہمارے ملاحظے میں آتی ہے جو بیکیین بے نے اپنی کتاب میں اپنے ذخیرے سے شائع کی ہے اس پر بہزاد کے دستخط کار اعلیٰ استاد بہزاد کے الفاظ میں موجود ہیں۔ اس میں اونٹ اکیلا دکھایا ہے جو اپنے کھونٹے سے بندھا ہے اور پاس ساربان کھڑا ہے۔ اس تصویر پر بہزاد کے دستخط اسی صورت میں ثبت ہیں جس صورت میں سلطان حسین مرزا اور شیبک خاں (شیبانی خاں) کی شبیہوں پر موجود ہیں۔ اونٹوں کے مضمون کو ایرانی مصوروں نے مختلف دور میں اپنایا ہے۔ ڈاکٹر مارٹن نے اپنی کتاب کی جلد دوم میں سلطان محمد کے نام سے پلیٹ نمبر ۸۱ پر ایک اونٹ کی تصویر شائع کی ہے جس میں ایک ساربان ایک سرکش اونٹ کو بٹھلانے کی کوشش کر رہا ہے یا اس کو سرکشی سے باز رکھنے کی سعی کر رہا ہے۔ ڈاکٹر مارٹن نے اسے سلطان محمد کے نام سے منسوب کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں سلطان محمد کا یہ شاہکار ایرانی مصوری میں ایک غیر فانی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ اونٹ کی ایک اور خوبصورت تصویر بیکیین بے نے اپنی کتاب میں شائع کی ہے جو شیخ محمد کے نام سے منسوب ہے۔ اسی صفحے پر جس پر مذکورہ بالا بہزاد کی اکیلی تصویر شائع کی ہے۔ یہ دونوں تصاویر ایک ہی صفحے پر اوپر نیچے چھپی ہیں۔ ڈاکٹر مارٹن نے جو تصویر سلطان محمد کے نام سے شائع کی ہے وہ کوئی رنگ دار نہیں ہے، محض سیاہ قلم میں ایک جاندار خاکہ ہے جو ایرانی مصوری کا بہترین شاہکار ہے۔

کاغذ ختائی زردی لیے ہوئے ہے۔ مصور نے اونٹ نئی وضع قطع کا بنایا ہے۔ جو دیگر اونٹوں کی تصاویر سے مختلف ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصور کو خطوط کے اظہار پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ مصور نے خطوط کے اظہار میں انسان اور حیوان کے جذبات کی پوری پوری عکاسی کی ہے۔ چینی مصور جو سیاہ قلم میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، سلطان محمد کے اس خاکے کے آگے ان کی خطوط نگاری بھی ماند نظر آتی ہے۔ اس میں پختگی، نزاکت، تازگی اور توانائی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ سلطان محمد کی مصوری ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے۔ سلطان محمد کو جو مقام ایرانی مصوری میں حاصل ہے وہ اسی سے مخصوص ہے۔ سکندر بیگ منشی مصنف عالم آرائے عباسی کے مطابق سلطان محمد شاہ طہماسپ کا پہلا استاد ہے جس سے شاہ طہماسپ نے مصوری سیکھی تھی۔ حبیب اصفہانی مصنف خط و خطاطان کے بیان کے مطابق شاہ طہماسپ نے خواجہ عبدالعزیز اصفہانی سے بھی کسب ہنر کیا ہے۔ سلطان محمد کی بے شمار تصاویر پائی جاتی ہیں۔ مشہور مصور خمسۂ نظامی جو برٹش میوزیم کی ملکیت ہے اور جس کو شاہ محمود نیشاپوری نے لکھا ہے اور جو نظامی کے نام سے لندن سے شائع ہوا ہے[۱۰] اس میں سلطان محمد کی تین تصاویر موجود ہیں۔ ڈاکٹر بینن اور دیگر مبصرین کا خیال ہے کہ حضور کی معراج والی تصویر اسی کے قلم کی مرہون منت ہے۔

شاہ اسمٰعیل صفوی اور اس کے بعد شاہ طہماسپ کے زمانے میں تیموری مصوری ہی کو دربار میں اور دربار سے باہر بھی فروغ حاصل رہا ہے۔ سلطان حسین مرزا اور شیبانی خاں سے ہوتے ہوتے ہرات اسکول کی مصوری صفوی دربار میں پہنچی ہے۔ شیبانی خاں کی شکست کے بعد بہزاد اور اس کے شاگرد اور دیگر ہم عصر، علما، فضلا اور فن کار تمام کے تمام شاہ اسمٰعیل کے دربار سے منسلک ہوتے ہیں۔ جب ۲۷ جمادی الاول ۹۲۸ھ ہجری میں شاہ اسمعیل کے اپنے فرمان کے مطابق بہزاد کو مہتمم کتب خانہ و نگار خانہ شاہی مقرر کیا گیا اور دارالحکومت ہرات سے تبریز منتقل ہوا تو تمام چہرہ کشا اور صورت ساز اور مصور کتب، تذہیب نگار اور تمام کے تمام فن کار تبریز میں منتقل ہو گئے۔ شاہ اسمٰعیل کے زمانے میں جو کتابیں مصور اور منقش ہوئی ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ برعکس اس کے اس زمانے میں شیراز میں جو کتابیں مصور ہوئی ہیں وہ ضرور قابل ذکر اور قابل ستائش ہیں۔ انڈیا آفس میں جو خمسہ نظامی ۹۱۱ھ ہجری کا

موجود ہے۔ شیراز میں مکمل ہوا ہے۔ گلستان سعدی کا جو نسخہ برٹش میوزیم میں ہے سنہ ۹۱۱ھ کا ہے کہا جاتا ہے کہ یہ شیراز میں تیار ہوا تھا۔ اور گلستان سعدی جو کتب خانہ ملی پیرس کی ملکیت ہے وہ بھی شیراز میں مکمل ہوئی ہے۔ شاہنامہ فردوسی بھی جو کتب خانہ ملی پیرس کی ملکیت ہے شیراز میں سنہ ۹۲۰ھ میں مکمل ہوا تھا۔ بوڈلین لائبریری لندن کا نسخہ بوستان سعدی سنہ ۹۱۹ھ میں شیراز میں مکمل ہوا تھا۔ خمسہ نظامی کا ایک اور نسخہ جو انڈیا آفس میں موجود ہے سنہ ۹۲۷ھ میں شیراز میں لکھا گیا ہے۔ ظفرنامہ برٹش میوزیم بھی سنہ ۹۲۹ھ ہجری میں شیراز میں انجام کو پہنچا ہے۔ ایک اور شاہ نامہ فردوسی جو محمد ہروی کا کارنامہ ہے تبریز میں سنہ ۹۳۱ھ ہجری میں شاہ اسمٰعیل کی وفات سے ایک سال پہلے مکمل ہوا ہے۔ ۲۷ عدد مصور صفحات جو لینن گراڈ میں موجود ہیں یہ بھی شاہ اسمٰعیل کے زمانے میں مصور ہوتے ہیں۔ ایک شاہ نامہ سنہ ۹۱۲ھ ہجری کا لکھا ہوا کورکین برادر کی ملکیت ہے۔ ایک خمسہ نظامی جو سلطان محمد نور، بشاگرد رشید مولانا سلطان علی مشہدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا، میٹروپولیٹن میوزیم نیویارک میں موجود ہے۔ ایک بوستان سعدی محمد ابن نظام الدین محمد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو سنہ ۹۲۱ھ ہجری میں تکمیل ہوئی ہے۔ یہ سب کورکین برادر کی ملکیت ہیں۔ ایک خمسہ امیر خسرو دہلوی جو علاؤ الدین محمد ہروی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ سنہ ۹۰۹ھ ہجری کا مکتوبہ ہے اور میٹروپولیٹن میوزیم میں موجود ہے۔ ہو سکتا ہے اور بھی مرقع جات اور مصور کتب صفوی دربار سے دور بہزاد کی طرز نگارش میں شیراز اور بخارا میں مصور ہوئی ہوں اور ہو سکتا ہے اس زمانے کا بیشتر کام گردش ایام کی نذر ہو گیا ہو جو لوگوں تک پہنچ نہیں سکا۔

بہزاد کے مرقع جات اور تصاویر کے سلسلے میں آرمینی مصنف سکیین بے اور کورکین برادران کا نام اکثر آیا ہے۔ اول الذکر نے ایرانی مصوری پر ایک محققانہ کتاب لکھی ہے اور اس کا اپنا ذخیرہ بھی ایرانی کتب اور تصاویر کا بہترین اور شاندار ہے۔ معلوم نہیں یہ مصنف تصاویر اور مرقع جات کی تجارت کرتا ہے یا اس کا مجموعہ اس کے ذوق نظر اور ایرانی مصوری سے گہرے لگاؤ کا باعث ہے۔ مگر کورکین برادران خالص تاجر قسم کے لوگ ہیں۔ پیرس، لندن اور امریکہ وغیرہ کے بیشتر عجائب گھر اور ذاتی ذخیرے ان کی مہیا کردہ تصاویر اور کتب سے مزین ہیں۔ یہ دونوں اصحاب یہودی النسل ہیں۔ کورکین برادران دوسری

جنگ عظیم سے پیشتر پیرس میں مقیم تھے، جنگ کے دوران امریکہ میں آباد ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اور دوسری جنگ عظیم سے پیشتر ہندوستان، ایران، عراق، بغداد، مصر غرض دنیا بھر میں گھومتے رہے اور نوادر اکٹھے کرتے رہے۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے دوسری جنگ عظیم سے پیشتر ان کا قیام پیرس میں تھا۔ کتب خانہ ملی پیرس اور لوور، برٹش میوزیم، میٹرو پولیٹن میوزیم نیویارک میں قیمتی نوادر انھی کے دیے ہوئے ہیں، انھی کے نوادر سے یہ عجائب گھر مالا مال ہیں۔ ان میں سے ایک بھائی دوسری جنگ عظیم سے پیشتر میرے پاس بھی آیا تھا اور میرا تمام ذخیرہ خرید کرنا چاہتا تھا۔ دراصل یہ اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ ہندوستان آچکا تھا۔ اس نے بتلایا تھا کہ وہ سید بہادر شاہ سے سینکڑوں نایاب مصور کتب اور تصاویر خرید چکا ہے اور ہمیشہ خریدتا رہا ہے۔ سید بہادر شاہ مرحوم لاہور میں قدیم اشیا کے ایک مشہور تاجر تھے۔ وہ سب سے پہلے شخص تھے جو قدیم اشیا فروخت کرتے تھے۔ لاہور میں موچی دروازے کے اندر ان کا قیام تھا۔ یہ پشاور، کابل، راولپنڈی، بنوں، کوہاٹ، سوات، لاہور اور ہندوستان کے دیگر مقامات سے تصاویر، مرقع جات، برتن، کپڑے، شالیں اور گندھارا کی سنگ تراشی غرض ہر قسم کی قدیم اشیا کے سوداگر تھے۔ ہندوستان کے دیگر قدیم اشیا کے سوداگر مثلاً گندر بمبئی، ہیرا مانک پٹنہ، امری شیوگر دہلی، آرٹ پیلس دہلی، رادھا کرشن بھرانی امرتسر اور کشمیر کے تاجر سب ان سے قدیم اشیا خریدتے تھے۔ ان کی وساطت سے ایرانی اور مغل مرقع جات اور تصاویر قدیم خاندانوں سے نکل کر عجائب گھروں کی زینت بنے ہیں۔ لاہور، کلکتہ، بمبئی میوزیم میں ان کی فروخت کی ہوئی تصاویر اور مرقع جات، برتن اور شال، قالین اور چغے آج بھی موجود ہیں۔ اکثر تصاویر اور مرقع جات پر ان کی ربڑ کی مہر ثبت ہے جس میں ان کا نام اور موچی دروازے کا پتا موجود ہے افسوس کی بات ہے کہ ان کی کوئی اولاد نہ تھی بے چارے لاولد فوت ہوئے ہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا ہے تو ان کا ذخیرہ جو سینکڑوں قلمی اور مصور نوادر پر مشتمل تھا، بوریوں میں بند کرکے کوڑیوں کے مول بطور ردی کے فروخت ہوا۔ اس صورت میں ہزاروں علمی، ادبی، ایرانی اور مغل نوادر تباہ و برباد ہو کر قعر گمنامی کی نذر ہوگئے۔ کورکین ایرانی مرقع جات زیادہ خرید کرتا تھا۔ یہ فارسی زبان بخوبی جانتا تھا۔ یہودی عموماً کئی زبانیں جانتے ہیں۔ یہ ایران، کابل

مصر اور ہندوستان گھوم چکا تھا۔

ترکی نقاد مصطفےٰ عالی آفندی کا خیال ہے کہ بہزاد پیر سید احمد تبریزی کا شاگرد تھا۔ حیدر مرزا دوغلت کا کہنا ہے کہ بہزاد میر روح اللہ میرک نقاش خراسانی کا شاگرد تھا۔ مشہور ہے کہ انھوں نے بہزاد کو بطور یتیم کے پرورش کیا تھا۔ کیونکہ بہزاد بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہوگیا تھا۔ میر روح اللہ اصفہان کے سادات میں سے تھے۔ حافظ قرآن اور خود شاعر بھی تھے۔ آپ کو شروع میں خطاطی سے شغف تھا۔ باپ کے فوت ہوجانے کے بعد خطاطی سے اور بھی زیادہ لگاؤ ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا ولی اللہ سے بھی کسب ہنر بھی کیا تھا جو تحریر اور تذہیب میں مشہور زمانہ تھے۔ جملہ فنون میں ید طولےٰ رکھتے تھے اور مصوری اور طراحی میں بے بدل تھے۔ جملہ علوم و فنون میں دست رس رکھنے کی وجہ سے شروع شروع میں سلطان حسین مرزا کے مہتمم کتب خانہ مقرر ہوئے۔ بہزاد جب سلطان حسین مرزا کا کتاب دار اور مہتمم نگارخانہ مقرر ہوا ہے تو استاد روح اللہ میرک نقاش اس جہان فانی سے عالم بالا کو سدھار چکے تھے۔ انھوں نے مرزا شاہ رخ، بایسنغر مرزا، ایلک بیگ اور مرزا ابوسعید کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ صاحب قران امیر تیمور گورگان نے سمرقند میں اپنا دارالحکومت قائم کیا تھا اور اس کی اولاد نے یہ فضیلت ہرات کو بخشی تھی اور ہوسکتا ہے بہزاد نے اپنا بچپن سمرقند میں بھی گزارا ہو اور میر روح اللہ میرک نقاش سے سمرقند ہی میں یتیمی میں پرورش پائی ہو اور کسب ہنر کیا ہو۔ اور جب مرزا شاہ رخ، بایسنغر مرزا اور ابوسعید نے ہرات میں نگارخانہ اور کتب خانہ قائم کیا ہے اور تمام خطاط اور مصور اور دوسرے فن کار ہرات میں منتقل ہوئے ہیں تو ہوسکتا ہے وہاں بہزاد نے استاد پیر سید احمد تبریزی سے بھی کسب ہنر کیا ہو۔ استاد پیر سید احمد استاد جہانگیر بخاری کے شاگرد تھے اور جہانگیر بخاری استاد گنگ کے۔ اس زمانے میں ہر نوجوان مصور اور خطاط کو اس بات سے واسطہ پڑتا تھا کہ وہ ہر استاد سے فیض حاصل کرے۔ مشرق میں ہر شاگرد کو ہر کام سے مستفید ہونے کا موقع میسر ہوتا تھا۔ چنانچہ بیشتر مصور اور خطاط، نقاشی اور تذہیب نگاری میں بھی طاق تھے لیکن کسی خاص ہنر میں مستقل حیثیت کسی خاص صفت میں پختگی حاصل کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہزاد مصوری کے ساتھ ساتھ نقاشی، تذہیب نگاری اور خطاطی میں بھی پوری مہارت

رکھتا تھا۔ ان تمام باتوں سے ہمیں اس کی تصاویر کے مطالعے سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ بہزاد کس کا شاگرد تھا اور کس کا نہیں تھا بقول جہانگیر وہ خلیل مرزا شاہ رخی کا بھی شاگرد معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی اور کوئی فرق پیدا نہیں کرتی۔

ہرات اسکول کی مصوری سلطان حسین مرزا کے عہد میں اپنے عروج پر تھی، اس کو ایرانی مصوری کا زریں عہد کہا جاتا ہے۔ اب خلیل مرزا شاہ رخی، استاد روح اللہ میرک نقاش اور استاد پیر سید احمد تبریزی کے فن کا دور گزر چکا تھا۔ اب بہزاد ہی میر مجلس فن تھا۔ دربار کے بیشتر فن کار بہزاد ہی کے شاگرد تھے اور بہزاد ہی کے طرز نگارش میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کی یہ طرز نگارش ہمیں شاہ طہماسپ اور شاہ عباس کے دور تک اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ دیکھا جائے تو بہزاد نے تمام تیموری سلطنت کا عروج و زوال دیکھا ہے اور اس سے وابستہ رہا ہے۔ بہزاد کے بچپن کے حالات تو بالکل ہی پردہ اخفا میں ہیں یہاں تک کہ اس کے سال پیدائش سے بھی کسی کو صحیح طور پر علم حاصل نہیں ہے۔ اس کے مرقع جات اور تصاویر کے مطالعے سے اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ ۱۴۵۰ء یا ۱۴۶۰ء کے کسی عشرے میں پیدا ہوا ہے۔ بابر، اخوند میر، مولانا جامی، علی شیر نوائی یہ سب بہزاد کے ہم جلیس اور ہم عصر ہوئے ہیں، تمام ایک ساتھ پلے اور بڑھے ہیں لیکن کسی نے بھی اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ وہ کب پیدا ہوا کب بڑا ہوا اور کب مصور بنا اور کب سلطنت تیموری سے وابستہ ہوا۔ یہ بھی اندازہ کیا گیا ہے کہ اس نے ایک طویل عمر پائی ہے۔ لیکن یہ بات قطعی ہے کہ اس نے شاہ طہماسپ کے دور میں تبریز میں وفات پائی ہے اور وہیں شیخ کمال خجندی کے مقبرے میں ان کے پہلو میں دفن ہوا ہے۔ دوست ہاشمی کے قطعے کے مطابق جو اس کی لوح قبر پر کندہ ہے اس نے رجب ۹۴۲ھ ہجری میں وفات پائی ہے۔ حضرت کمال خجندی نے ۷۸۶ھ ہجری میں وفات پائی ہے۔ آپ فارسی کے شاعر بھی تھے جب امیر تیمور سلطانیہ پر قبضہ کرنے کے بعد سمرقند چلا گیا تو اس کے حریف کبیر توقتمش خاں نے تبریز پر حملہ کر دیا۔ اس نے شہر اور باشندوں کو بہت بری طرح لوٹا اور بہت سوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ دربند کی طرف لوٹ گیا۔ ان قیدیوں میں حضرت شیخ کمال خجندی بھی تھے۔ قاضی احمد

کے اس بیان میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ استاد بہزاد ہرات میں فوت ہوا اور کوہ مختار کے قرب وجوار میں کسی نقش ونگار سے مزین مقبرے میں دفن ہوا۔

دوست ہاشمی کے اس قطعے سے جو بہزاد کی لوحِ تربت پر کندہ ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ اس نے تبریز میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا ہے۔

وحیدِ عصر بہزاد آنکہ چوں او — زبطن مادرِ ایام کم زاد
اجل چوں صورتِ عمرش بہ پرداخت — قضا خاکِ وجودش داد برباد
زمن صورت گری تاریخ پرسید — بدو گفتم جواب از جان ناشاد
اگر خواہی کہ تاریخش بدانی — نظر افگن بہ خاک قبر بہزاد

۹۴۲ ہجری

اس مضمون کے ساتھ بہزاد کی جو تصویریں شائع کی جا رہی ہیں، ان کی اشاعت کے لیے مالکان سے اجازت حاصل کی گئی ہے جس کے لیے ادارہ ان کا ممنون ہے۔ " سکندر اور سات حکیم" خمسۂ نظامی مملوکہ برٹش میوزیم میں شامل ہے۔ تصویر کا موضوع نظامی کی مثنوی " خردنامۂ سکندری" سے متعلق ہے۔ یہ مثنوی سلطان حسین مرزا کے نام معنون کی گئی ہے۔

شبیہ سلطان حسین مرزا از بہزاد

شبیہ سلطان حسین مرزا از بہزاد

شبیہ درویش ۔ از بہزاد

عمل بہزاد
قصۂ بہرام گور کا ایک صفحہ

مطبوعات انجمن

اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری (بابائے اردو)	قیمت : ساٹھ روپے
اسٹوڈنٹس انگریزی اردو ڈکشنری (بابائے اردو)	اکیس روپے
قاموس الکتب (بابائے اردو)	چالیس روپے
مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو [اردو] (افسر امروہوی)	
جلد اول	دس روپے
جلد دوم	سات روپے
مخطوطات انجمن ترقیٔ اردو [فارسی ۔عربی] (سید سرفراز علی رضوی)	تین روپے پچاس پیسے
تقویم سنہ ہجری وعیسوی (ابوالنصر خالدی)	ایک روپے پچاس پیسے
نصرتی، ملک الشعرائے بیجاپور (بابائے اردو)	پانچ روپے
مرحوم دہلی کالج (بابائے اردو)	چار روپے
سید احمد خاں، حالات و افکار (بابائے اردو)	چار روپے
مقالاتِ گارساں دتاسی (جلد اول)	دس روپے
سودا (شیخ چاند مرحوم)	سات روپے
اردو تھیٹر (ڈاکٹر عبد العلیم نامی) جلد اول	سات روپے
جلد دوم	سات روپے
جلد سوم	سات روپے
اردو کی منظوم داستانیں (ڈاکٹر [illegible] فتح پوری)	پچیس روپے
اردو کی نثری داستانیں (ڈاکٹر گیان چند)	اٹھارہ روپے
محمد حسین آزاد (ڈاکٹر اسلم فرخی) جلد اول	آٹھ روپے
جلد دوم	پندرہ روپے

سرشار کی ناول نگاری (ڈاکٹر لطیف حسین ادیب)	قیمت: چھ روپے پچاس پیسے
جلال لکھنوی (ڈاکٹر محمد حسن)	تین روپے
کاروانِ صحافت (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید)	چار روپے
سعادت یار خاں رنگین (ڈاکٹر صابر علی خاں)	پانچ روپے پچھتر پیسے
تنقیص الاردو (سید ہاشمی فرید آبادی)	پانچ روپے پچاس پیسے
مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب (پیر حسام الدین راشدی)	پچیس روپے
ہفت مقالہ [فارسی زبان و ادب سے متعلق سہ ماہی 'اردو' کے مضامین کا انتخاب] (پیر حسام الدین راشدی)	آٹھ روپے
غالب نام آور (سہ ماہی 'اردو' میں غالب سے متعلق شائع شدہ مضامین کا انتخاب)	پندرہ روپے
فلسفۂ کلام غالب (ڈاکٹر شوکت سبزواری)	بارہ روپے
غالب۔ فکر و فن (ڈاکٹر شوکت سبزواری)	پانچ روپے
غالب۔ ایک مطالعہ (پروفیسر ممتاز حسین)	سات روپے
ہنگامۂ دلِ آشوب (مرتبہ: سید قدرت نقوی)	سات روپے
مہر نیم روز (ترجمہ: پروفیسر سید عبدالرشید فاضل)	بارہ روپے
سہ ماہی 'اردو' غالب نمبر، حصہ اول، جنوری ۱۹۶۹ء	آٹھ روپے
سہ ماہی 'اردو' غالب نمبر، حصہ دوم، اپریل ۱۹۶۹ء	پانچ روپے
ماہ نامہ 'قومی زبان' شمارہ فروری ۱۹۶۹ء	ایک روپیہ پچاس پیسے
قدیم اردو (بابائے اردو)	پانچ روپے پچاس پیسے
سب رس (ملا وجہی۔ مرتبہ بابائے اردو)	چھ روپے
مثنوی من لگن (قاضی محمود بحری۔ مرتبہ سخاوت مرزا)	تین روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

واجد علی شاہ

(۶)

مرزا علی اظہر برلاس

سلیمن اور اوٹرم کے جھوٹے بیانات

رگھوبر سنگھ کا واقعہ "۱۸۵۲ء" میں کچھ لوگوں نے کرنل رچمنڈ رزیڈنٹ سے شکایت کی کہ رگھوبر سنگھ تحصیل دار مہرایچ نے پانچ سو مرد اور عورتوں کو پکڑ کر غلامی میں فروخت کر ڈالا۔ ریزیڈنٹ نے بلاذریعہ اطلاع بتلائے، اودھ دربار کو مطلع کیا (اطلاع پاتے ہی) اخبار نویسوں کے ریکارڈ کی تلاشی لی گئی اور ہر ہر ممکن تحقیقات کی گئی مگر کوئی پتا نہ چلا۔ دربار نے کچھ روز انتظار کیا کہ ستم رسیدہ لوگوں کے اعزا یا احباب خود آئیں گے یا رزیڈنٹ کے توسط سے کسی کو بھیجیں گے تاکہ اس واقعے کے پورے حالات معلوم ہو سکیں اور باقاعدہ تحقیقات کی جا سکے۔ جب کوئی نہیں آیا، اور رگھوبر سنگھ ملزم سے دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ انسان کی خرید و فروخت کمپنی اور اودھ کی سلطنت دونوں میں ممنوع ہے اور اتنی کثیر تعداد انسانوں کی خفیہ طور سے فروخت نہیں ہو سکتی اور نہ چھپائی جا سکتی ہے۔ کوئی خریدار اتنے آدمیوں کا جن میں بڈّھے، ضعیف اور بچے بھی ہوں گے، نہ مملکت اودھ میں اور نہ کمپنی کے سرحدی اضلاع میں پایا جا سکتا ہے اس لیے اس نے رگھوبر سنگھ درخواست کی کہ مکمّل تحقیقات کی جائے کہ کون کون لوگ اور کس کس جگہ فروخت کیے گئے اور ان کے خریدار کس حصۂ ملک کے رہنے والے تھے۔ آیا وہ اتنے آدمیوں کو خرید سکتے تھے اور ان کی قیمت بھی ادا کر سکتے تھے۔ فروخت شدہ لوگوں کے اعزّا کہاں تھے؟ اور کیا پیشہ کرتے تھے؟

"چوں کہ شرع محمدی اور قانون سلطنت کے یہ خلاف ہے کہ بلا ثبوت کے محض افواہ پر کسی شخص کو سزا دی جائے اس لیے ہم نے اس کو کوئی سزا نہیں دی مگر چونکہ رزیڈنٹ کی خوشی مجھ کو منظور تھی اور کرنل رچمنڈ رگھوبر سنگھ سے خفا تھا۔ . . . اس لیے میں نے رگھوبر سنگھ کو برطرف کر دیا، اگرچہ اس کی برطرفی سے لاکھوں روپے کا، جو اس کے ذمے باقی تھے، میرا نقصان تھا مگر میں نے

اس کی بھی پروا نہیں کی۔ اس سے زیادہ کوئی سزا میں نہیں دے سکتا تھا کیوں کہ وہ خلاف انصاف ہوتا اور ظلم ہوتا۔۔۔"

تعجب ہے کہ اگر یہ الزامات کرنل رچمنڈ کے نزدیک رگھوبر سنگھ کے خلاف ثابت تھے تو انھوں نے اُسے گرفتار کیوں نہ کرا لیا۔ نہ لکھنؤ میں اور نہ کمپنی کی حکومت میں جہاں کوئی نہ کوئی شخص اس کے خلاف پیش ہو سکتا تھا اور نہ اس کو مجسٹریٹ نے کوئی تنبیہ کی اگرچہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حدود میں آسائش اور شان و شوکت کی زندگی بسر کرتا رہا۔[۱]

ریاست نانپارہ

"منوّر علی خاں، طوغ پٹھان، عرصے سے ہماری مملکت میں تعلقدار نانپارہ کے عہدے پر فائز تھے۔ ۳۰ یا ۴۰ سال تک کوئی جھگڑا اور فساد نہ تھا تقریباً ۵ سال ہوئے کہ منوّر علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ تعلقے کے دو حقدار تھے ایک پہلی بیوی تھی مع اپنے لڑکے کے جس کو وہ منوّر علی خاں کا لڑکا بتاتی تھی، دوسری بیوی پہلی بیوی کو ناجائز قرار دیتی تھی۔ ان دونوں میں تنازع پیدا ہو گیا۔[۲]

"کرنل سلیمن نے مشورہ دیا کہ دونوں کو جائیداد سے بے دخل کر دیا جائے اور ان کی پرورش کے لیے ہماری سرکار سے کچھ دے دیا جائے۔ کرنل سلیمن کے مشورے کے مطابق احکام صادر کر دیے مگر اب تک جھگڑا فساد قائم ہے۔ کرنل سلیمن کا مشورہ ماننا ضروری تھا، ورنہ ہم اب تک اس کا آسانی سے فیصلہ کر چکے ہوتے"[۳]

ریاست تُلسی پور

"تلسی پور (بعد کو تعلقہ بلرام پور کہلاتا تھا) کا علاقہ عرصے تک دَوْن بہادر کے قبضے میں تھا، اس کے بعد اس کا لڑکا درگ راج سنگھ حسب دستور لگان دیتا رہا اور کسی کو کوئی شکایت نہ تھی ۱۸۴۹ء میں درگ راج سنگھ میں جنون کے آثار پائے جانے لگے اور یہ مناسب خیال کیا گیا کہ اس کے لڑکے صاحب جی کو قبضہ دے دیا جائے اس لیے اس کو خلعت دیا گیا۔ خلعت دینے سے ہمارا منشا یہ تھا کہ صاحب جی اپنے باپ کے نائب اور منیجر کی حیثیت سے مالی فرائض ادا کرتا ہے

جب کرنل سلیمن اودھ کے دورے پر نکلے تو مفسد لوگ درگ راج کو کرنل سلیمن کے پاس لے گئے اور کہا کہ باپ کی موجودگی میں بیٹے کا تقرر نہ ہونا چاہیے۔ کرنل سلیمن دھوکا کھا گئے اور مجھ کو متواتر اس کے بارے میں لکھتے رہے۔ میں چونکہ ہمیشہ رزیڈنٹ کی خواہشات کا لحاظ کرتا تھا' اس لیے میں نے لڑکے کو ہٹا دیا اور درگ راج کو قبضہ دے دیا۔ مگر جس کا مجھے اندیشہ تھا وہی ہوا۔ فسادات میں اضافہ ہوگیا۔ ایک طرف لڑکا لڑائی کے لیے آمادہ ہوگیا اور دوسری طرف اس کا باپ، تب کرنل سلیمن نے رائے دی کہ باپ اور بیٹے دونوں کو الگ کر دینا چاہیے۔ ان کے کہنے کے بموجب علاقہ سرکار میں لے لیا گیا یعنی کچی تحصیل کری گئی اور مالگذاری کی تحصیل کے لیے تحصیل دار مقرر کر دیا گیا۔ مگر فسادات ختم نہیں ہوئے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تلسی پور کا علاقہ نیپال کی سرحد پر واقع ہے اور کسی بھی شورہ پشت کے لیے سرحد پار ہو جانا آسان ہے اور (سرکار کے لیے) اس کو گرفتار کرنا اور سزا دینا اتنا ہی دشوار ہے۔ اس علاقے میں فساد کی یہ وجہ ہے۔

صاحب جی اور درگ راج دونوں ۱۲۶۲ فصلی میں لکھنؤ آئے تھے اور کرنل سلیمن کی تجویز کے مطابق چوبیس سو روپے ان کو دینے کا وعدہ بھی کیا گیا مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔"[۲۵]

"جنرل اوٹرم نے اپنی رپورٹ مورخہ ۲؍فروری ۱۸۵۵ء کے ضمیمے میں لکھا ہے کہ 'کپتان پیٹرک آر PATRIK OAR کے اندازے کے موافق چالیس ہزار کاشتکار اپنے اپنے ہل لے کر نانپارہ (ضلع بہرائچ) سے گورکھ پور ہجرت کر گئے' مگر مجسٹریٹ گورکھ پور کی رپورٹ مورخہ ۱۵؍مارچ ۱۸۵۵ء میں چالیس ہزار تو کیا چالیس کاشتکاروں کا بھی ذکر نہیں ہے اگرچہ اس امر کا یقین کرنا بہت مشکل تھا کہ چالیس ہزار کاشتکار گاؤں چھوڑ دیں گے۔ اور اس رپورٹ کے جھوٹ ہونے کی تصدیق گورکھ پور کے مجسٹریٹ سے بآسانی ہو سکتی تھی' حیرت ہوتی ہے کہ کپتان پیٹرک آر کو ایسے بیان دینے کی ہمت کیسے ہوئی اور رزیڈنٹ نے بلا تصدیق کیے ہوئے اور بلا سوچے سمجھے اس کو (اپنی رپورٹ میں) قلم بند کر لیا۔"

ریاست رام نگر: "رام نگر دمیڑی (ضلع فیض آباد) کا مقدمہ۔ تعلقدار رام نگر دمیڑی اور حکومت اودھ کے درمیان مالگذاری کی وصولیابی کے بارے میں جھگڑا ہو گیا۔ وزیر اعظم جنرل اوٹرم سے مشورہ کرنے گئے۔ گفتگو کا خلاصہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا۔ دوران گفتگو

"جنرل اوٹرم نے کہا کہ ان کو یہ نہیں معلوم کہ تعلقے کی مالگذاری کیا ہے اور تعلقدار سالہائے ماسبق میں کیا مالگذاری دیا کرتا تھا اور اس وقت اُس سے کیا مطالبہ کیا گیا ہے ۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلقدار نے یہ سمجھ کر ہتھیار اٹھائے ہیں کہ اگر اُس نے مدافعت نہیں کی تو تحصیلدار کی سختی کی وجہ سے وہ پیس ڈالا جائے گا۔ مثال کے طور پر مہدی حسین تحصیل دار سلون کا ذکر کیا جس نے وہاں کے تعلقدار سے اتنا مطالبہ کیا ہے جو وہ دے نہیں سکتا (اور اس لیے سلون میں فساد شروع ہوگیا) وزیر اعظم . . . . نے بتایا کہ تعلقدار سے وہی جمع مانگی گئی ہے جو تعلقدار بیس برس سے دیتا چلا آیا ہے ۔ رزیڈنٹ نے کہا کہ . . . . اودھ میں مالگذاری بیس برس میں بہت گر گئی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ تعلقدار بیس برس پہلے جو جمع دیا کرتے تھے وہی اب بھی دے سکیں . . . . وزیر اعظم نے کہا کہ زمین دار ایک پیسہ بھی خوشی سے نہیں دیتے اور استدعا کی کہ شورہ پشت زمینداروں کے وکیلوں کو رزیڈنٹ بلائے ۔ رزیڈنٹ نے جواب دیا کہ اس کو لکھنؤ کے وکیلوں پر مطلق بھروسا نہیں ہے اور اگر وہ لکھنؤ دربار اور تعلقداروں کے درمیان پڑے گا تو وہ خود تعلقداروں سے ملاقات کرے گا۔ وزیر اعظم فوراً تیار ہو گئے کہ وہ اس کا انتظام کریں (یعنی تعلقداروں کو رزیڈنسی میں طلب کریں) مگر رزیڈنٹ نے کہا کہ وہ اُس وقت تک دخل نہیں دے سکتا جب تک کہ (لکھنؤ) دربار کے (رزیڈنٹ کے) ملاحظے کے لیے پورے ملک کے اعداد و شمار پیش نہیں کرے گا۔ اس گفتگو سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں ۔

(۱) پہلے یہ کہ میں اور میرے حکّام نے ہمیشہ ایمانداری سے رزیڈنٹ کا مشورہ طلب کیا اور اس پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے ۔

(۲) دوم یہ کہ بغیر صحیح مشورہ دیئے ہوئے رزیڈنٹ مختلف حیلوں سے مجھے ٹالتا رہا ۔

(۳) اس گفتگو سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی تعلقے میں خرابی کی وجہ سے جو مالگذاری بیس سال سے متواتر (اُس تعلقے سے) وصول ہوتی رہی ہو وہ طلب کی جائے ' اگرچہ اپنی رپورٹ مورخہ ۶ فروری ۱۸۵۵ء میں وہ (اوٹرم) لکھتا ہے : کلکٹر سلون نے تعلقدار سے بہ نسبت اُس رقم مالگذاری کے جو وہ بیس سال سے برابر دیتا تھا' زیادہ مطالبہ کیا اور

اسی وجہ سے وہاں فسادات شروع ہو گئے۔ یہ دونوں بیانات (اوٹرم کے) ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ عجیب مشکل ہے! اگر کلکٹر وہی رقم طلب کرے جو (تعلقدار) بیس سال سے دیتا آیا ہے تو وہ تعلقہ کی خرابی کا مجرم ٹھہرتا ہے اور تعلقدار مطالبہ کی ادائیگی سے مجبور قرار دیا جاتا ہے اور اگر وہ (کلکٹر) زیادہ مطالبہ مانگتا ہے تو اس پر ظالمانہ اور جابرانہ وصولیابی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اور یہ صرف اس لیے کہ رزیڈنٹ میری حکومت کے خلاف الزام لگانے کے لیے بے تاب ہے۔"[۵۵]

بادشاہ کی ذات پر حملے اور ان کا جواب

اپنی رپورٹ مورخہ ۱۵ رمارچ ۱۸۵۵ء کے پیراگراف ۵ا میں اوٹرم لکھتا ہے:

" دراصل میں یقین نہیں کرتا کہ ہز مجسٹی (واجد علی شاہ) کبھی بھی اس ذمہ داری کو کماحقہ محسوس کریں گے جس کی ادائیگی کا بوجھ اُن پر عائد ہوتا ہے۔" آگے چل کر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ " زمانہ ماسبق میں بادشاہ ہر ہفتے دربار کیا کرتے تھے اور اکثر اس سے بھی زیادہ۔ اس (دربار) میں تمام اعزا اور امرا' شریک ہوتے تھے اور اپنے بادشاہ کے شرف حضوری حاصل کرنے کا اور گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا یہ طریقہ (ابتدائے سلطنت کے) تین یا چار ماہ قائم رہا اور بعد کو موقوف کر دیا گیا۔"

چونکہ واجد علی شاہ کی نااہلیت، کار سلطنت سے تنفر اور شبانہ روز عیش و عشرت میں مستغرق رہنے کے ثبوت میں یہ الزام بہت ہی طمطراق سے پیش کیا جاتا ہے' اس لیے اس کے دندان شکن جوابات جو بادشاہ نے دیئے ہیں۔ وہ ناظرین کے لیے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔ چنانچہ بادشاہ کہتے ہیں:

" کاروبار (سلطنت) کے انجام دینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو بار بار دربار کا منعقد کرنا یا اپنا پورا وقت امور عامہ کی تکمیل میں صرف کرنا۔ پہلا طریقہ (دربار کرنا) اس کے لیے بہت ہی ناموزوں ہے جو اپنا پورا وقت سلطنت کے اندرونی حالات کی دریافت میں صرف کرنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ عزیز و اقارب سے ملاقات اُس وقت کو ضائع کرتی ہے جو رعایا کے مفاد کے لیے زیادہ مفید طریقے سے صرف ہو سکتا ہے (اس لیے کہ) رعایا کی بہتری کے کام راعی کے لیے سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہونا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ

میں امورِ عامّہ کو خود دیکھوں اور سمجھوں تاکہ اصلاح طلب امور کی حسبِ ضرورت اصلاح کردوں اور باقی کی توثیق کردوں، انتظامِ سلطنت کو باقاعدہ نظم کے تحت کردوں تاکہ کاروبار (سلطنت) باقاعدہ نظم و نسق کے ساتھ انجام پاتا رہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مجھے کوئی نئی سلطنت نہیں ملی تھی جس کا نیا خاکہ تیار کرنے کی ضرورت تھی بلکہ (میری سلطنت میں) ایک طریقہ کار رائج ہے جس کو تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ چلانا ہے۔ اسی لیے میں نے سب سے پہلے آزمانا چاہا کہ دیکھوں انتظامِ عدالت کیسا ہے۔ میں نے شارع عام پر صندوقچے رکھوا دیئے تاکہ (رعایا) اُن میں شکایتی درخواستیں یا عرض داشتیں ڈال دیا کریں۔ اِن درخواستوں کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہماری قدیم کچہریاں (عدالتیں) بہترین ہیں اور ہر مقدمے میں شرع محمدی کے مطابق انصاف ہوتا ہے ... یہ بھی ثابت ہوا کہ جج صاحبان قابل اور قوانینِ شرع سے واقف تھے اور صاحبِ کردار تھے۔ اس لیے میں نے (جس طرح کام ہو رہا تھا) بلا جھجک اس کی توثیق کردی۔ اس کے بعد میرا ارادہ تھا کہ فوج کو ازسرِ نو منظم کروں اور اسی لیے میں نے بہت سے افسروں کو، جو میرے بزرگوں کی خدمت کر چکے تھے مگر الگ کر دیئے گئے تھے، بحال کر دیا اور میری یہ بھی تجویز تھی کہ پوری فوج کا خود معائنہ کروں اور اس کے متعلق کچھ انتظامات بھی شروع کر دیئے تھے مگر کرنل رچمنڈ (رزیڈنٹ) اور (بعد کو) کرنل سلیمن (رزیڈنٹ) نے فوراً اس کے متعلق شکایت کی اور گفتگو کی۔ یہ سوچ کر کہ اگر چھوٹے سے فوج کے دستے کی تنظیم سے برٹش گورنمنٹ مجھ سے ناراض اور مشکوک ہوتی ہے اور آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی دوستی پر بھروسا کرتے ہوئے، جس پر سلطنت کے بیرونی اور اندرونی دشمنوں سے مملکت کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری تھی، میں نے اِس ارادے کو ترک کر دیا اور امورِ عامّہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

'امانی' اور تھانوں کا قیام

"لارڈ ہارڈنگ نے مجھے صلاح دی تھی کہ (تحصیل مالگذاری کے لیے) 'امانی' کا طریقہ رائج کروں۔ میں نے تھوڑے ہی عرصے میں ملک کے ۹/۱ حصّے میں "امانی" کا طریقہ رائج کر دیا اور اب تک اجارہ پر نہیں دیا گیا۔ مختلف مقامات پر تھانے بھی قائم کر دیئے جن کی فہرست

اس باب کے آخر میں منسلک ہے۔ تعلقےجن کی جمع انتہائی صحت کے ساتھ تشخیص کی گئی تھی۔ پانچ اور سات برس کے لیے ٹھیکے پر دے دیئے گئے اور عام اعلان جاری کر دیا گیا کہ جس کا جی چاہے وہ "حضور تحصیل" کے طریقے پر زمین حاصل کر سکتا ہے۔ مزید برآں، چوں کہ یہ افواہ بھی تھی کہ تحصیل دار غریب زمینداروں کی زمین پر قبضہ کرکے اپنے نام میں اندراج کر لیا کرتے تھے۔ اس لیے یہ حکم بھی کیا گیا کہ مواضعات کی خرید و فروخت بلا گورنمنٹ کی اطلاع اور گورنمنٹ سند کی رسید کے، جو مالک (مواضعات) کے اعتراضات سننے کے بعد اور اعلان جاری ہونے کے بعد دی گئی ہو صحیح متصور نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اعلان کی کاپیاں (جو حسب طریقہ بالا جاری ہوتا تھا) برٹش گورنمنٹ کی رعایا کی اطلاع کے لیے رزیڈنٹ کو بھیج دی جاتی تھیں۔ متذکرۂ بالا امور کے علاوہ کیا کوئی امر ایسا بھی تھا جس کی انجام دہی میں زیادہ کوشش کی جا سکتی تھی؟

مختصر یہ کہ کوئی کام ایسا نہیں ہوتا تھا جو بغیر میری اجازت اور فیصلے کے ہوتا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جو اطلاعات مختلف رزیڈنٹوں نے مجھ سے مانگیں یا دریافت کیں ان کا تشفی بخش جواب میں نے نہ دیا ہو۔ جہاں تک میرے تحصیل داروں کے طریقوں اور عادات یا دوسرے امور عامہ کے متعلق (دریافت طلب سوالات) اطلاعات کا ذکر ہے تو یہ محال تھا کہ اُن مسائل پر بلا غور و خوض کے میں جواب دے سکتا ... جہاں تک درباروں کے کم منعقد کرنے کا سوال ہے تو میں (اس سلسلے میں) تنہا منفرد نہیں ہوں۔ پہلے رزیڈنٹ ہی، مسٹر میڈک تک ہفتے میں ایک بار دربار کیا کرتے تھے جس میں برٹش رعایا اور عہدیدار حاضر ہوا کرتے تھے۔ تقریباً بیس برس سے یہ طریقہ (یعنی ریذیڈنٹ کے ہفتہ وار دربار کا) ختم ہو گیا ہے۔ میں نے کبھی کسی سے ملاقات کرنے سے انکار نہیں کیا بلکہ جس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی فوراً طلب کر لیا۔

چکلے داروں کا رعایا کی اراضی پر قبضہ

اوٹرم نے یہ الزام لگایا تھا کہ "بہرائچ خالصہ کے چھ سو پچاس مواضعات (غریب زمینداروں سے لے لے کر) تعلقہ داران پیاگ پور، اکونہ، چردہ شاہ اور بونڈی شاہ کے حوالے کر دیے گئے۔ اس کا جواب واجد علی شاہ یہ دیتے ہیں کہ:

"اولاً یہ الزام اُس بیان سے متضاد ہے جس کا ذکر وزیرِ اعظم کے ساتھ گفتگو کے سلسلے میں اپنی رپورٹ مورخہ ۱۸ فروری ۱۸۵۵ء میں کیا ہے اُس رپورٹ میں شاہی تحصیل داروں پر استعمال بالجبر کا الزام لگایا ہے اور یہاں اصل جمع کو بھی چھوڑ دینا کہا جاتا ہے۔ یہ زبیان کا اختلاف، خاص طور سے قابلِ غور ہے۔ میں اس بات سے قطعاً انکار کرتا ہوں کہ میرے دورِ حکومت میں کسی ایک چھوٹے زمیندار کا گاؤں بھی کسی بڑے تعلقدار کو دیا گیا ہو۔

"حضور تحصیل"

"حضور تحصیل" میں چھوٹے زمیندار بڑے تعلقداروں کے پاس اس لیے جاتے ہیں کہ وہ (تعلقدار) اُن کی (چھوٹے زمینداروں کی) ضمانت کریں اور یہ معاملہ اُن کی مرضی اور خوشی پر منحصر ہے۔ گورنمنٹ سے اِس سے کوئی واسطہ نہیں۔ مثال کے طور پر خود جنرل اوٹرم اسی رپورٹ کے پیراگراف ۲۸ میں لکھتا ہے "کہ محمد علی شاہ 'حضور تحصیل' کو وسعت نہ دے سکے کیونکہ متمول زمیندار (ضمانت کے لیے) دستیاب نہ ہو سکے۔ میرے دورِ حکومت میں جب اعلان کیا گیا کہ جس کا جی چاہے وہ لکھنؤ آئے اور 'حضور تحصیل' میں اراضی لے، جو بلا ضمانت نہیں لی جا سکتی تو چھوٹے کاشتکاروں نے دولت مند زمینداروں کو (خوشامد سے) مجبور کیا کہ وہ ان کی (چھوٹے کاشتکاروں کی) ضمانت کریں اور ان کے ذریعہ سے "حضور تحصیل" میں ان کی اراضی شامل کر لی جائے۔ اِس طریقے سے نہ سرکاری مالگذاری کا نقصان ہوتا ہے اور نہ زمینداروں کا بلکہ ان کو اختیار ہے کہ وہ (بڑے) زمینداروں کی ضمانت منسوخ کرا دیں اور خود ضمانت داخل کر کے اپنی اراضی "حضور تحصیل" میں علیٰحدہ شامل کرا دیں۔ یہ طریقہ یقیناً بہتر ہے (اُس طریقے سے) جس میں زمینداریاں فروخت ہو جاتی ہیں اور جو طریقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ میں رائج ہے جس میں زمیندار اپنی موروثی زمینداری کے حقوق سے یک لخت "بے دم ہو جاتا ہے"۔[۵۰]

امانی یا اجارہ

"جنرل اوٹرم اپنی رپورٹ مورخہ ۵ مارچ ۱۸۵۵ء کے ۲۹ ویں پیراگراف میں "اجارہ"[۵۱]

پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ گورنمنٹ اور رعایا دونوں کے لیے یہ طریقہ تحصیل مالگذاری کا نقصان دہ ہے اس لیے کہ اجارہ دار کا منشا اپنی میعاد (اجارہ) میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا ہے بلا لحاظ اس کے کہ آئندہ کیا ہوگا اور ۳۰ ویں اور ۳۱ ویں پیراگراف میں طریقہ "امانی" کی تعریف ہے مگر میجر ٹروپ نے . . . . اپنی رپورٹ مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۸۵۴ء میں اور کپتان الگزنڈر نے اپنی رپورٹ مورخہ ۹ جنوری ۱۸۵۵ء میں، جو دونوں رپورٹیں جنرل اوٹرم کی رپورٹ مورخہ ۱۵ مارچ ۱۸۵۵ء میں منسلک ہیں "اجارہ" کی بے حد تعریف کی ہے (وہ لکھتا ہے کہ) جو عامل علاقے کو اجارے پر لیتا ہے وہ مجبور ہے کہ زمینداروں کو خوش رکھے اور وہ اُس پر بھروسا کریں کیونکہ اسی طریقے سے معاہدے کی تکمیل ہو سکتی ہے اور اگر کسی عامل کے پاس علاقہ کئی سال تک رہتا ہے۔ تو اُس کی رعایا عام طور سے خوش حال ہوتی ہے اور اس کے ساتھ برتاؤ اچھا ہوتا ہے" یہ عبارت نقل کرنے کے بعد واجد علی شاہ نے کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"مختصر یہ کہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے بدنام کرنے کے لیے میجر جنرل اوٹرم کے اسسٹنٹوں کے پاس دو طرح کے جوابات تیار رہتے ہیں۔ اگر امانی کو میں منظور کر دوں تو وہ اجارے کی تعریف کرتے ہیں اور اگر میں "اجارے" کو اچھا کہوں تو وہ "امانی" کی توصیف کرتے ہیں"۔[۱۲]

جرائم و قتل کی کثرت کا الزام

اودھ میں بدنظمی اور عدم نظم و نسق کے علاوہ لارڈ ڈلہوزی نے یہ بھی الزام لگایا تھا کہ اودھ میں سنگین جرائم مثل قتل و ڈکیتی وغیرہ کی زیادتی کے باوجود حکومت انسداد جرائم کی کوشش نہیں کرتی۔ اس لیے جواب میں واجد علی شاہ اپنی سلطنت کے جرائم کا مقابلہ کمپنی کے اضلاع کے جرائم سے کر کے کہتے ہیں کہ "میرا منشا ان بیانات سے صرف یہ ہے کہ جب برٹش پارلیمنٹ ان جرائم کے باوجود، جو کمپنی کی حکومت میں ہوتے ہیں۔ کمپنی کو ملامت نہیں کرتی تو کمپنی کے لیے یہ خلافِ انصاف ہے کہ وہ میری مملکت میں سرزد شدہ جرائم کے لیے میری گورنمنٹ کو قابلِ ملامت قرار دے اگرچہ یہ جرائم کمپنی کے اضلاع کے مقابلے میں میری سلطنت میں صرف ۱/۴ کے تناسب سے واقع ہوتے ہیں" اس کے بعد بادشاہ نے حسب ذیل اعداد و شمار[۱۳] پیش کیے ہیں۔

(۱) بنگال ۔" ۱۸۵۰ء میں ۹۶٫۳۵۲ لوگوں پر (مختلف جرائم میں) مقدمہ چلایا گیا جن میں سے ۳۵٫۲۵۲ کو جرم ثابت ہونے پر سزا دی گئی اور ۳۴٫۲۹۲ بری ہو گئے باقی بھاگ گئے یا مر گئے اور اُسی سال اکسٹرا ریگولیشن صوبوں مثلاً گوالپارہ، آسام، ہزاری باغ، ٹینی سریا، اسکان، کچھار اور کسیا کی پہاڑیوں میں ۱۴٫۶۸۹ لوگوں پر فرد جرم لگائی گئی۔ (اب اس کے مقابلے میں) اودھ (رقبے وغیرہ کے لحاظ سے) بنگال کا صرف $\frac{1}{4}$ ہے اس حساب سے (اودھ میں مجرموں کی تعداد) چوبیس ہزار ہونا چاہیے۔ اگرچہ خود جنرل اوٹرم نے صرف دو سو بارہ جرائم (ڈکیتیوں) کا ذکر کیا ہے اور ۱۸۵۴ء میں صرف چودہ سو آدمی اودھ میں مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بنگال میں اودھ سے دس گنا زیادہ جرائم سرزد ہوئے کیونکہ وہاں ... ۹۶٫۰۰۰ سے زیادہ جرائم کا ارتکاب ہوا۔ ۱۸۵۱ء میں ۹۴٫۹۵۲، ۱۸۵۲ء میں ۹۲٫۱۱۵ اور ۱۸۵۳ء میں ۹۲٫۶۲۹ ۔ یہ (جرائم کی) اوسط تعداد ہے جو کمپنی کی پولیس کی انتہائی کوشش کے باوجود بھی کم نہیں ہوتی ... . اگر اس کو بدنظمی کہتے ہیں تو یہ برٹش ممالک میں بھی موجود ہے اور میرے یہاں بھی۔ ان حقائق کے باوجود ایک کو (یعنی اودھ کی بدنظمی کو) مستقل کہنا اور دوسرے (یعنی انگریزی مملکت کی بدنظمی کو) وقتی کہنا صریحاً انصاف کے خلاف ہے۔

(۲) الہ آباد ۔" الہ آباد کے گوشوارۂ جرائم سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں ۱۴۵۲ جرائم ہوئے تھے اور ۱۷۲۸ آدمیوں کے خلاف جرائم ثابت ہوئے تھے۔ اودھ سے الہ آباد صرف $\frac{1}{5}$ حصہ ہے (یعنی اودھ پانچ حصے الہ آباد سے زیادہ ہے) بلکہ (اودھ کے ایک ضلع) سلطانپور سے بھی کم ہے۔ پھر جب چودہ سو جرائم الہ آباد میں سالانہ ہوتے ہیں تو الہ آباد کے مقابلے میں اودھ میں بہت ہی کم جرائم ہوتے ہیں۔

(۳)۔ بنارس ۔" ۱۸۵۵ء میں ۴۰۰۸ فوجداری کے مقدمات بنارس میں ہوئے اور چونکہ بنارس (رقبہ میں) $\frac{1}{4}$ حصہ ہے یعنے ضلع سلطان پور سے بھی کم ہے اس لیے ظاہر ہے کہ بنارس سے بہت کم جرائم اودھ میں ہوتے ہیں سالہائے گزشتہ میں بھی وہاں (بنارس میں) اسی تناسب سے جرائم ہوئے ہوں گے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب کمپنی کے ملک میں مملکت اودھ سے اوسطاً زیادہ جرم ہوتے ہیں تو پھر میری گورنمنٹ کے خلاف الزام کیسے عائد ہو سکتا ہے !"[۱۴]

واجد علی شاہ نے ڈلہوزی کے ہر الزام کا جواب بالتصریح دیا ہے اور خود کمپنی کے کاغذات اور گوشواروں کے اعداد و شمار سے ڈلہوزی اور ریزیڈنٹوں کے جھوٹ کو ثابت کیا ہے اُن سب کو 'بخوفِ طوالت' میں یہاں نظر انداز کرتا ہوں سوائے ایک واقعے کے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ خود انگریزوں نے ہندوستانی ریاستوں کو کس کس طرح نقصان پہنچایا اور پھر ان کے فرماں رواؤں کو دنیا کے سامنے کیسے بدنام کیا۔

نہر چار باغ

لکھنؤ کے مشہور ریلوے اسٹیشن چار باغ سے ۲۰۰ گز کے فاصلے پر ایک نالہ بہتا ہے اور ریل کے ذریعے سے مسافر اسٹیشن سے شہر کو جاتے ہیں۔ اس کی دلچسپ داستان یہ ہے :

"بادشاہ نے تجارت و زراعت کی ترقی کے لیے اور ملک کو عمومی طور سے فائدہ پہنچانے کے لیے ایک نہر کو کھود کر دریائے گنگا جو کمپنی کے ضلع کانپور اور اودھ کے درمیان حدِ فاصل ہے، کو دریائے گومتی سے ملانے کا حکم دیا۔ لاکھوں روپے کے مصارف سے تقریباً پچاس میل کھود ے جا چکے تھے کہ ریزیڈنٹ نے کھدائی کو جاری رکھنے کی یہ کہہ کر ممانعت کر دی کہ پورا علاقہ جس میں گنگا کا پانی بہے گا 'ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکیت ہو جائے گا!" اس کے بعد مولوی مسیح الدین لکھتے ہیں کہ "ریزیڈنٹ کا یہ فرض تھا کہ یہ بات وہ کام شروع ہونے کے پہلے بتا دیتا کہ کثیر رقم ضائع نہ ہوتی۔ ریزیڈنٹ نے جو یہ نہیں کیا اس کا ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بادشاہ کی مالیات کو نقصان پہنچا کر ان کو (بادشاہ) پورے طور پر اپنے قبضۂ اقتدار میں کر لے اور مملکت کی ترقی رک جائے۔"[۱۵]

غرضیکہ واجد علی شاہ نے مٹیا برج میں بیٹھ کر بلیو بک کے الزامات کا فرداً فرداً مدلل و مسکت جواب لکھ کر ملکہ وکٹوریہ، وزیر اعظم اور ارکانِ پارلیمنٹ کو اس کی کاپیاں بھجوا دیں اس کے علاوہ انھوں نے ایک عرضداشت بھی اودھ مشن کے ذریعہ سے ۱۰ دسمبر ۱۸۵۶ء کو بھیجی

جس کے ضروری اقتباسات حسب ذیل ہیں: [طلسلہ]

"بعالی خدمت رائٹ آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرز آف ایسٹ انڈیا کمپنی اور رائٹ آنریبل گورنر جنرل ہند ہز مجسٹی سلطان محمد واجد علی شاہ، بادشاہ اودھ، رائٹ آنریبل گورنر جنرل کے علم میں لانا چاہتے ہیں کہ گورنر جنرل نے جو اعلان ۱۱ فروری ۱۸۵۶ء کیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اعلان آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرز کے حکم خصوصی اور اجازت سے کیا گیا ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کی جابرانہ اور ناجائز کارروائیوں کے خلاف ہز مجسٹی نے جو احتجاجات کیے ان کے متعلق یقین دہانی کی گئی کہ وہ کارروائیاں گورنمنٹ برطانیہ کے حکم سے کی گئی ہیں اس لیے ہز مجسٹی نے مناسب خیال کیا کہ اپنی والدہ جناب عالیہ تاج آرا بیگم اور اپنے بھائی مرزا محمد جواد علی سکندر حشمت بہادر کو انگلستان روانہ کریں تاکہ آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرز کو اور برٹش گورنمنٹ کو اودھ کے صحیح حالات پیش کیے جاسکیں تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ جن الزامات کی بنا پر ہز مجسٹی سے ان کی سلطنت چھین لی گئی ہے اُن میں سے بعض تو سرے سے بے بنیاد ہیں اور بعض میں مبالغہ اور غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے جو اودھ میں بشمول دیگر ریاست ہائے ہند کے پائے جاتے ہیں اور خاص طور سے جو ریاستیں برٹش گورنمنٹ کی بلا واسطہ زیر انتظام ہیں ان میں انہی کے مثل یا اس سے زیادہ خرابیاں پائی جاتی ہیں۔

"اس معاملے میں برٹش گورنمنٹ جس نتیجے پر بھی پہنچے، پورے حالات پر مطلع ہونے کے بعد ہز مجسٹی کو یقین کامل ہے کہ وہ آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرز اور برٹش گورنمنٹ کو پورا اطمینان کرادیں گے کہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ اُن معاہدات توثیق شدہ کی تکذیب ہے جن پر ہز مجسٹی اور اُن کے اسلاف نے پورا پورا عمل کیا تھا اور برٹش گورنمنٹ نے تسلیم بھی کیا تھا ....

(ہز مجسٹی کو یقین ہے کہ) آنریبل کورٹ متذکرۂ بالا اعلان کی تنسیخ کا حکم دے گا، ہز مجسٹی کو ان کا ضبط شدہ ملک واپس دیا جائے گا اور ہندوستان میں برٹش حکام کے ہاتھوں جو ان کے (بادشاہ) خلاف زیادتیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی کی جائے گی۔ الخ" [۱۷۵]

واجد علی شاہ اگرچہ مٹیا برج میں تھے مگر حسب موقع و محل اودھ مشن کو ہدایتیں دیتے رہتے تھے اور کوئی کام لندن میں بھی بلا ان کی مرضی اور منشا کے سرانجام نہیں پاتا تھا۔ اس سے

ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ جو مفسدہ پرداز لوگ قافلے کے ہمراہ لندن پہنچ گئے تھے ان کی ہمتیں پست ہوگئیں اور قاعدے سے پیروی ہونے لگی چنانچہ صاحب "قیصر التواریخ" لکھتے ہیں کہ "یہاں (لندن میں) جنرل صاحب، مولوی مسیح الدین خاں، برنٹن صاحب بسبب وجوہات سابق الذکر حالت سکوت میں تھے منتظر حکم شاہی۔ اس عرصے میں فرمان شاہی محررہ ۱۱ ربیع الثانی مفید مطلب پہنچا۔ حریف سُن کر گوشہ نشین میں جاکر بیٹھے۔ اختیار کل جنرل صاحب، مولوی صاحب و میجر برڈ صاحب کو ہوا اب بنائے کار اور مشورہ یہ ٹھہرا کہ صاحبان کورٹ آف ڈائرکٹرز سے عرض حال مشروحاً کرنا چاہیے کہ محبت تمام ہو اور ان کا پہلے مکنون خاطر و مافی الضمیر دریافت کرنا بہتر ہے کس واسطے کہ بعد انفصال بھی انھیں کے تحت حکومت و اختیار میں رہے گا چنانچہ ایک دن میجر صاحب (و) مولوی صاحب ان کے پاس گئے۔ صاحبان عالی شان کمال اخلاق و پاس داری سے متوجہ حال ہوئے۔[۱۸]

مگر اس گفتگو کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا کیونکہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے ارکان نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ہم نے وزرائے سلطنت کے حکم سے یہ امر کیا ہے"[۱۹]

ارکان کورٹ سے ملاقات

مولوی مسیح الدین خاں سفیر شاہی اور میجر برڈ کی کوششوں سے جنرل صاحب اور مرزا ولی عہد بہادر کی ممبران کورٹ آف ڈائرکٹرز سے ملاقات طے پائی چنانچہ:

"۱۶ جنوری روز جمعہ ۱۸۵۷ء جنرل صاحب (و) مرزا ولی عہد ملازمین خاص سے بجلوس تمام ہارلے ہاؤس سے (جہاں اودھ مشن کا قیام تھا) سوار ہوئے۔ ۵ گاڑیاں اور تھیں۔ پہلی میں مولوی مسیح الدین خاں (و) میجر برڈ صاحب سوار ہو کر انڈیا ہاؤس کو چلے۔ راہ میں کثرت تماشائیوں کی بہت تھی۔

"جب گاڑی شاہزادوں کی انڈیا ہاؤس کے پھاٹک پر پہنچی کئی صاحب پولیٹکل ڈپارٹمنٹ انڈیا ہاؤس کے استقبال کو آئے۔"[۲۰]

۱۹ جنوری ۱۸۵۷ء کو شاہزادوں نے سر فریڈرک کیلے اور چیئرمین بورڈ آف ڈائرکٹرز

سے ملاقات کی " خطوط ولایت سے معلوم ہوا کہ جب شاہزادے تشریف فرما تھے صاحبان سکریٹر نے راہ میں استقبال کیا اور چیرمین نے پھاٹک سے اور جب گاڑی فرودگاہ پر پہنچی سب صاحبان نے باہر آکر استقبال کیا اور حسب دستور ٹوپی اتارے کھڑے رہے، جب تک شاہزادے گاڑی سے اُترے اُس وقت چیرمین ہم پہلوے مرزا ولی عہد اور ڈپٹی چیرمین جنرل صاحب کے پہلو باقی اور صاحب بعض آگے باہتمام اور رہبری کو مقام اجلاس تک لے گئے۔ غرض کمال احتشام واحترام سے جو قرار خور اس خاندان کے تھا بلکہ زیادہ اس طور سے پیش آئے ... گفتگوے انتزاع ملک شروع ہوئی اور خان موصوف (مولوی مسیح الدین خاں) نے ابتداءً اور انتہائے مقدمات بخوبی گزارش کیے۔ صاحب ساکت وخاموش رہے، جواب شافی نہ دیا بلکہ اس کے خلاف سُن کر کہنے لگے کہ "خان صاحب تم بہت تیز وتند ہو گئے ہو" عرض کی " آیا خلاف واقعہ یا خلاف قرب ومنزلت وگرنہ انصاف شرط ہے۔ کس واسطے کہ اول مرحلہ یہ طے فرمائیے کہ اگر بعد وض حال مقدمات ہمارا قصور ثابت ہو تو ہم چپ ہو رہیں اور اگر نسبت اہالیانِ سرکار ہو تو معترف ہوں اس صورت میں البتہ احتیاج ثالث کی پڑے گی، پس خواہ نخواہ مرافعہ طرفین محول پارلیمنٹ ہوگا۔ اس کے بعد صحبت برخاست ہوئی۔ شاہزادے فرحاں وشاداں پھر آئے

پنشن کی پیشکش

بازدید کے لیے " ۱۲ جنوری (۱۸۵۷ء) کو صاحبانِ عالیشان مہمان دولت سرائے شاہزادوں کے ہوئے، لوازمۂ مہمانی وخاطرداری حد سے یہاں زیادہ ہوا ....
بعد اختتامِ صحبت کمرۂ خلوت میں بعض صاحب و مختار شاہی (مولوی مسیح الدین خاں) اور شاہزادے رونق افروز ہوئے۔ کہنے لگے جنرل سلیمن نے ایک سو کئی خط نسبت بادشاہ لکھی ہیں، اُن میں سے کئی ہم پر بھی ثابت متحقق ہیں لہذا ۵ لاکھ روپیہ سالانہ بذات بادشاہ کو اور عمل پانچ کوس دور لکھنؤ بطور جاگیر پنج لاکھ روپیہ سالانہ کا تجویز کیا ہے۔ عرض کیا اس آپ کے ارشاد کو کچھ سند اور نیز اطمینان موکلوں کے واسطے لازم ہے۔ پس اُسی وقت موافق اقرار صاحبانِ عالیشان یہ تحریر ہوئی۔ مختار شاہی نے اُسے پارلیمنٹ میں بھیج دیا اور وزرائے سلطنت کو بھی گزرانی یعنے اظہار مدعیوں سے ہے، الحمد اللہ کہ ہمارے موکلوں کی بے قصوری کلی ثابت ہو

ظاہر ہے، اسے وزرائے سلطنت اور اہل انصاف نے بھی مستحسن جانا۔[۲۲]

پارلیمنٹ میں اودھ کے مظلوموں کی صدائے بازگشت

لندن پہنچ کر اودھ مشن نے کافی تگ و دو کی جس کا برطانوی عوام پر کافی اثر ہوا۔ چنانچہ ایک برطانوی مورخ لکھتا ہے:

"شاہی مستغیثوں کی آمد کی اطلاع کورٹ آف ڈائرکٹرز کو دی گئی اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یعنی ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو سر فنزلئے کیلی نے ایک درخواست دارالعوام میں معزول خاندان کی طرف سے پیش کی جس میں دکھلایا گیا تھا کہ انہیں خلاف انصاف ان کی مملکت، مالگذاری محلات اور دیگر املاک سے محروم کر دیا گیا تھا الخ...... اور انھوں نے استدعا کی کہ ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کر دی جائے جو ان کی شکایات اور الزامات کی تحقیق کرے۔ یہ عرض داشت دارالعوام کی میز پر رکھ دی گئی[۲۳] مگر اس کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کی گئی اگرچہ حسب دستور ذرائع سے جو اس کو شہرت ہوئی اس نے رائے عامہ کو اس کی طرف کافی متوجہ کر دیا تھا اور اس کی موافقت و مخالفت سال کے آخر تک کافی بحث و تمحیص کا مرکز بنی رہی۔"[۲۴]

دارالعوام میں اودھ کا مسئلہ پیش ہونا اور اخبارات و دیگر ذرائع اطلاعات میں مسئلے کا چھڑنا ایسا نہ تھا کہ وزیر اعظم متاثر نہ ہوتے۔ میرے خیال میں رائے عامہ سے متاثر ہو کر وزیر اعظم نے ملکہ وکٹوریہ کو جناب عالیہ سے ملاقات کرنے کا مشورہ دیا ہوگا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انگلستان کا بادشاہ یا ملکہ بغیر وزیر اعظم سے مشورہ کیے کوئی ایسا قدم اٹھا نہیں سکتی تھی۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ملاقات ملکہ وکٹوریہ کی نیک دلی کا نتیجہ تھی مگر مجھے یقین ہے کہ بادشاہ کے جوابات 'بلوبک' اودھ مشن کی لندن میں تحریری کوششیں اور دارالعوام میں مسئلہ اودھ کے پیش ہونے کی وجہ سے ملکہ وکٹوریہ ملاقات کرنے پر مجبور ہوئی۔ اودھ کی بے بس ملکہ کی وکٹوریہ جیسے ملاقات کی تفصیلات نہایت دلچسپ ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔

جناب عالیہ اور وکٹوریہ کے دربار

مولوی مسیح الدین خاں، سفیر شاہی، لکھتے ہیں: "غرض لندن میں پہنچ کے بادشاہ کے

متذکرے کا بہت عمدہ بندوبست ہوا۔ اوّل ملکہ کشور کا آٹھویں دن دربار مقرر کیا کہ ہر پنجشنبہ کو سیکڑوں بی بیاں تشریف لاتی تھیں اور مشرف اُن کی ملاقات سے ہوتی تھیں۔ متوسطین سے لے کے اونچے طبقے تک کمتر انگلستان وغیرہ کی عورتوں میں کوئی باقی ہوگی جو اُن کی ملاقات کے واسطے نہیں آئی۔ ملکۂ معظمہ کی مصاحبین بھی تشریف لائیں، یہاں تک کہ خود ملکۂ معظمہ دام اقبالہا کی خواہش[25] ملاقات کی ہوئی اور ایک خوبصورتی سے ملکہ معظمہ سے ملاقات ہوئی کہ جب سے انگلستان کی سلطنت قائم ہوئی ہے کبھی وہاں ایسا امر ظہور میں نہیں آیا تھا، یعنی زنانہ دربار ہوا کہ کوئی مرد وہاں نہ تھا اور دربار خاص میں صرف ملکۂ کشور اور دونوں شہزادے اور راقم گئے۔ ملکہ کشور سے تو ملکۂ معظمہ نے ہاتھ ملایا اور خود بیٹھیں اور محاذات میں ایک اُسی بنچ کی کرسی پر ملکۂ کشور بیٹھیں اور مرزا ولی عہد بہادر ایک پہلو میں ملکہ کشور کے اور ایک پہلو میں مرزا اسکندر حشمت کھڑے ہوئے اور پشت پر ملکۂ کشور کے راقم (یعنی مسیح الدین خاں) کھڑا ہوا۔ اُس وقت ملکۂ کشور نے اپنے چہرے سے برقع اٹھایا اور میری پشت پر سر جارج کلارک کھڑے ہوئے۔ اس واسطے کہ اُس وقت تک میں بخوبی انگریزی میں گفتگو نہیں کر سکتا تھا تاکہ میرے ذریعے سے ترجمہ ملکہ کشور کی اور ملکہ معظمہ کی گفتگو کا کریں اور جب گاڑی سواری ملکہ کشور کی قصر سلطانی میں پہنچی مجھے حکم ہوا کہ تم اپنے طور پر بندوبست زنانہ کا کر کے ملکہ کشور کو اتار کے لے جاؤ۔ اس میں ملکۂ معظمہ نے تین چار بڑی بڑی لیڈیوں کو بھیجا، وہ ملکہ کشور کو اتار کر لے گئیں اور جب دونوں ملکہ آمنے سامنے بیٹھیں اُس وقت راقم نے خریطہ بادشاہ کا گزرانا اُس کو ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا جب تک بیٹھی رہیں وہ ہاتھ میں رہا۔ قریب پچیس تیس بڑی بڑی لیڈیاں اور سب شاہزادیاں اور چھوٹے چھوٹے شاہزادے ملکہ معظمہ کے بائیں پہلو پر کھڑے رہے۔ اس میں ملکۂ معظمہ نے بعد گفتگو ذوق وشوق ارشاد کیا کہ میرا بڑا بیٹا یعنی پرنس آف ویلس جو ولی عہد سلطنت برطانیۂ اعظم ہیں، چونکہ پندرہ سولہ برس عمر کے ہیں اس واسطے اُن کو اجازت آنے کی نہیں ہوئی۔ اگر آپ اجازت دیویں تو وہ بھی آویں۔ ملکہ کشور نے فرمایا آپ کا بیٹا میرا بیٹا ہے[26]، آپ[27] بے تکلف ان کو بلائیں۔ بعد اس کے ملکہ معظمہ نے دونوں شاہزادوں کو اور راقم کو حکم دیا کہ اُس کے تیسرے دن ہم تینوں آدمی کھانے کی میز پر حاضر ہوں اور ایما کی گئی کہ ہر تقریب میں جو ملکۂ معظمہ کے یہاں ہوگی ہم تینوں شخصوں کی طلب ہوا کرے گی لیکن تقدیر نے مجاز نہ کیا[28] یعنی دوسرے دن تار برقی پر خبر آئی کہ بادشاہ کو

قلعہ میں بنہ کیا ہے وہ سارا بندوبست جو وہاں ہوا تھا سب ملتوی ہو گیا۔"[۲۸]

جناب عالیہ کا ملکہ وکٹوریہ کو نذر دینا

ملکۂ وکٹوریہ سے ملاقات کی تفصیلات "حسب تحریر خطوط لندن" ذرا مختلف، مگر زیادہ دلچسپ "قیصر التواریخ" سے ناظرین کی دلبستگی کے لیے نقل کی جاتی ہیں:

"اب ذرا لندن کی کہانی سننا چاہیئے کہ صورتِ ملاقات جناب عالیہ (و) ملکۂ معظمہ یہ ٹھہری کہ جناب عالیہ لباس ہندی یا عربی سے تشریف لے چلیں مگر دو صاحب[۲۹] حاضر حضور ملکہ معظمہ مثل کالخیر حسب دستور رہیں گے باقی کوئی اور صاحب سوائے عورات کے نہ ہوگا چنانچہ جناب عالیہ مع مقربان خاص، جنرل صاحب، مرزا ولی عہد بہادر، مولوی مسیح الدین خاں سفیر شاہی پرتکلف گاڑی میں سوار ہو کر چلے۔ جب گاڑی جناب عالیہ مقام فرودگاہ خاص پر پہنچی "کوئی میم" جو زبان ہندوستانی سے واقف تھیں استقبال کو آئیں۔ بعد ادائے سلام شاہانہ مقام خاص میں لیجا کر پرتکلف کرسیوں پر بٹھایا۔ اب آراستگی و زیب و زینت کی دولت سرائے شاہی کی اور ہر کمرۂ خاص کی کس زبان سے بیان کی جائے ... سننے ... وں کو موجب تحسین ہو (کذا)، اور غلبۂ شوق نظارہ بڑھے۔ بعد چند دقیقہ کے ان میں سے ... یم نے حضور ... ب ملکہ کو خبر کی۔ ملکۂ دوران لباس سادہ غیر تکلف سے رونق افروز ہوئیں اور بعد ادائے مزم زینت بخش کرسی عدالت ہوئیں۔ جناب عالیہ نے اشرفیاں نذر کی گزرانیں۔ دو صاحب حاضر الوقت پشت پر جناب عالیہ مقابل جناب ملکہ کھڑے ہوئے۔ جنرل صاحب آداب سلام زانوئے آداب[۳۰] سے بجالائے۔ نذر دی۔ پشت دست پر اپنے بوسہ دیا چاہتے تھے کہ جناب ملکہ نے کمال عطوفت سے مصافحہ فرمایا۔ یہی صورت مرزا ولی عہد کے واسطے ہوئی۔ سفیر شاہی ہم پہلوئے شاہزادوں کے بیٹھے۔[۳۱] شروع کلام دریائے شور سے ہوا۔ فرمایا تم[۳۲] کبھی جہاز پہ سوار ہوئے ہو۔ عرض کی ہمارے شہر میں ایک بہت چھوٹا دریا گومتی ہے۔ کبھی اس میں اتفاق سواری نہیں ہوا۔ جب بیان صدمات جہاز اور تکلیفات کا ہوا، بہت ترحم اور تاسف کیا۔ پھر ذکر مکانات ولایت ہوا کہ اگر نہ دیکھے ہوں، میں حکم دکھانے کا دوں۔ اس کے بعد فرمایا میرے دس اولادیں ہیں بعض

ان میں سے گھبرا رہے سے نہیں نکلے، لیکن پرنس آف ویلس یعنی ولی عہد ابھی لڑکا تیرہ برس کا ہے اگر اب زت ہو تو تمہارے سامنے آوے۔ عرض کی بسم اللہ میں بھی مشتاق ہوں کئی میم جا کر لے آئیں جناب عالیہ نے اپنی گودی میں بٹھا لیا بہت پیار فرمایا اور فرط محبت سے اپنے گلے کا ہار انھیں پہنایا۔ اتفاقاً وسط ہار میں ایک عطردان مرصع بھی تھا جناب ملکہ نے پوچھا۔ عرض کیا اس میں عطر رکھتے ہیں ور بروقت رخصت حسب معمول عطر اس میں سے دیتے ہیں۔ پس اس وقت جناب ملکہ کے خیال میں گزرا شاید لوگ بسبب خستگی راہ کے رخصت ہوا چاہتے ہیں۔ فرمایا تمھیں بہت تکلیف ہوئی تھوڑی دیر استراحت کر کے جانا۔ یہ ملاقات اجمالی ہوئی بعد ہفتہ عشرے کے بہ تفصیل حال ملاقات ہوگی۔ لیکن بہ ناساعدت ایام نافرجام تھی کہ صورت ملاقات بہ فردائے قیامت ٹھہری۔ بعد استراحت وہی میم نے مشایعت گاڑی تک کی۔

آٹھویں دن کے بعد یہ حضرات منتظر وعدۂ سلطانیہ چون روزہ دار گوش ہوش پر رہے کہ دفعتاً اخبار فساد ہندوستان کوچہ بکوچہ کالشمس شائع ہوئے اور اہل شہر میں ایک تلاطم عظیم برپا ہو گیا اور خاص و عام کو اس قافلے سے ایک چشمک اور شماتت ہو گئی۔ یعنی یہ فساد سب انہیں کی بدولت ہوا ہے۔ اور ان حضرات کو بھی عجب طرح کا ہراس اور یاس کلی پیدا ہوئی کہ ولایت غیر میں اس حالت بے بسی و بے اختیاری میں دیکھیے ہم غریب الوطنوں پر کیا گزرتی ہے اور انجام کار کیا ہوتا ہے۔ من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال"۔

ملکہ وکٹوریہ کے روزنامچے میں ذکر ملاقات

ملکہ وکٹوریہ نے بھی اس ملاقات کا ذکر کیا ہے اور چونکہ بعض باتوں میں وہ مندرجہ بالا دونوں بیانات سے مختلف ہے اس لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مولوی مسیح الدین خاں اگرچہ خود ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات کے وقت موجود تھے مگر پھر بھی ان کے بیان اور ملکۂ انگلستان کے بیان میں بیّن فرق ہے۔ صاحبِ "قیصر التواریخ" نے جو کچھ "اخبار لندن" سے سنا وہ نقل کر دیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے جو عبارت اپنے روزنامچے میں لکھی وہ حسب ذیل ہے۔

"جولائی ۱۴ر ۱۸۵۶ء ظہرانے کے بعد اودھ کی بیوہ ملکہ سے ملاقات کی۔ اس انتظام میں کہ کوئی مرد ان کو نہ دیکھ سکے بڑی زحمت ہوئی۔ ان کو CLOSET (وہ کمرہ جو سفید ڈرائنگ روم سے متصل ہے) میں بٹھایا گیا جہاں میری خواصین، ان کا لڑکا (مرزا سکندر حشمت) اور پوتا (مرزا ولیعہد) ان کے ساتھ رہے۔ ہم ان کی پشت پر سے داخل ہوئے۔ ہمارے ساتھ ساٹ بچے، مسٹر دی۔ اسمتھ اور سرجی۔ کلارک (بحیثیت مترجم) تھے۔ انھوں نے اپنی نقاب الٹ دی۔ اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور یہی ان کے پوتے (مرزا ولیعہد) نے کیا۔ وہ (ملکہ کشور) اپنی بھاری پوشاک، تاج اور جواہرات کے وزن سے جو بہت چھوٹے تھے، دبی جاتی تھیں۔ ان کی آنکھیں خوبصورت ہیں اور حسب معمول رنگی ہوئی تھیں (یعنی کاجل لگا ہوا تھا)۔ پوتا (مرزا ولیعہد) بھی ایک طرح کا تاج پہنے ہوئے تھا۔ دونوں شاہزادے لمبے اور ڈھیلے چغے پہنے ہوئے تھے جو مثل ڈریسنگ گاؤن کے تھے کچھ باتوں کے بعد جب ملکہ (کشور) اور ہم بیٹھ گئے تو البرٹ (ملکہ وکٹوریہ کے شوہر) دونوں بڑے لڑکوں اور عہدیداروں (اسمتھ اور کلارک) کے ساتھ ان کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے مجھے ایک خط اور ایک خوبصورت موتیوں کا مرصع زیور (ہار) دیا۔ جس میں ایک زیور مع خوشبویات کے تھا (یعنی عطردان) جو بہت ہی عجیب قسم کا تھا۔ پھر ہم رخصت ہوئے اور ان (ملکہ کشور) کے جلوس کی روانگی کو جو یقیناً بہت ہی دلچسپ منظر ہوگا، نہ دیکھ سکے۔"

واجد علی شاہ کی گرفتاری و نظربندی

ابھی تک واجد علی شاہ مٹیا برج میں آزاد زندگی بسر کر رہے تھے جہاں ایک چھوٹا سا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا۔ ہزاروں لکھنؤ کے باشندے کھنچ کھنچ کر مٹیا برج آتے تھے اور آباد ہو جاتے تھے۔ بادشاہ کو خود تالیف و تصنیف اور شاعری سے بہت شوق تھا لہٰذا انتہائی محدود وسائل کے باوجود جو آتا تھا اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کرتے تھے۔ جس کی بادشاہ تک رسائی نہیں ہوتی تھی وہ محلات معلّے کی ڈیوڑھیوں سے وابستہ ہو جاتے تھے اور آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ بادشاہ کی ادب نوازی نے بے شمار ادیبوں اور شاعروں کو مٹیا برج میں اکٹھا کر دیا تھا۔ لکھنؤ کے اکثر

اہل حرفہ، بلا تخصیص مذہب وملت، مٹیابرج میں سمٹ آئے تھے مگر زمانے نے تخت و تاج چھیننے کے بعد بھی ان کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔

۱۴ر جون ۱۸۵۷ء کو ایک سپاہی کے ذریعے انگریزوں کو یہ معلوم ہوا کہ واجد علی شاہ کا ایک برہمن سپاہی فورٹ ولیم پر تعینات سپاہیوں کو اس بات پر آمادہ کر رہا تھا کہ بادشاہ کے ملازم سپاہیوں کو قلعے میں داخل ہونے دیں اور ان کی کارروائی میں (جو بعد کو ظاہر کی جاتی) ان کی مدد کریں۔ غرض کہ یہ خبر ملتے ہی ایک طرف تو قلعے کی حفاظتی تدابیر اختیار کی گئیں اور دوسری طرف مٹیابرج کے برہمن کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے افشائے راز کی بنا پر بادشاہ کی گرفتاری کا فیصلہ کر دیا گیا۔

"۱۵ر جون (۱۸۵۷ء) کو صبح سویرے ہر مجسٹی کا ۳۷ ویں رجمنٹ جو اسی زمانے میں سیلون سے آئی تھی، ایک دستہ گارڈن ریچ پہنچا اور قبل اس کے کہ کسی کو خبر ہو اس نے بادشاہ کی رہائش گاہ کو گھیر لیا۔ اس کے بعد افسر کمانڈنگ بادشاہ کے سامنے گیا اور اپنے کار منصبی کا اعلان کیا اور ساتھ ہی ساتھ گورنر جنرل کا ایک دستخطی خط بھی پیش کیا جو حسب ذیل مضمون کا تھا:

گورنر جنرل کا خط واجد علی شاہ کے نام

فورٹ ولیم۔ ۱۵ر جون

جناب من۔ مجھے انتہائی صدمہ ہے کہ عین اس امر پر مجبور ہوا ہوں کہ آپ کو ایک موسم (سیزن) کے لیے فورٹ ولیم میں منتقل کر دوں۔ جناب کا نام اور آپ کے دربار کا رسوخ، جو لوگ برٹش گورنمنٹ کے خلاف (لوگوں کو) ابھار رہے ہیں، استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کا بند ہونا ضروری ہے۔ جناب کو علم ہے کہ جس روز سے آپ نے کلکتہ کے قرب میں رہائش اختیار کی ہے اور آج تک آپ اور آپ کے متعلقین بالکل آزاد رہے اور کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ آنجناب کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ گورنر جنرل ان کونسل کا مطلق ارادہ نہیں ہے کہ آپ کے کاموں یا کارروائیوں میں بلا وجہ دخل در معقولات کرے۔ آنجناب کو اس کا بھی یقین رکھنا چاہیے کہ آنجناب کے اعلیٰ رتبے کے مطابق جو اعزاز ہونا چاہیے اسے گورنمنٹ یا اس کے کوئی افسر

کبھی بھی فراموش نہ کریں گے اور آنجناب کے آرام و آسائش کا ہر ممکن انتظام کیا جائے گا"۔ کیننگ"۔

"افسر نے یہ بھی عرض کیا کہ ہز مجسٹی کو قلعے میں لے جانے کا اس کو حکم دیا گیا ہے مع چند ذاتی ملازمین کے۔ (اس اچانک اقدام سے) سب حیرت زدہ رہ گئے اور مطلب اس آسانی سے پورا ہوگیا کہ ذرا سی بھی مدافعت نہیں کی گئی۔ اور سات بجے صبح کو بادشاہ دو کمیشن افسروں کی معیت میں بحیثیت قیدی کے قلعۂ ولیم میں پہنچا دیے گئے۔ کاغذات اور خط و کتابت کے لیے شاہی مکان کی سخت تلاشی لی گئی اور کچھ اہم کاغذات ایسے پائے گئے جن سے کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ بادشاہ کو انگریزی گورنمنٹ کے خلاف بغاوت کی اطلاع تھی، اگرچہ، سوائے غیر معمولی تعداد میں مختلف قسم کے ہتھیاروں کا جمع کرنا، جو خفیہ طور سے ان کے محل میں پہنچا دیے گئے تھے، کوئی شہادت ایسی نہیں ملی جو ثابت کرتی کہ انھوں (بادشاہ) نے ذاتی طور سے سازش میں حصہ لیا ہو یا اس کی کامیابی کے نتائج سے وہ فائدہ اٹھائے"۔

بادشاہ کی گرفتاری کے خلاف لندن میں اپیل

واجد علی شاہ کی گرفتاری کی خبر جب لندن پہنچی تو مولوی مسیح الدین خان، سفیر اودھ نے اس کی اپیل کی کہ بادشاہ کے خلاف یک طرفہ فیصلہ نہ کیا جائے۔ مولوی صاحب موصوف نے اپنے ایک خط میں جو اخبارات میں شایع ہوا تھا اپیل کی کہ "جہاں تک ہز مجسٹی (واجد علی شاہ) کے خیالات کا تعلق ہے اور شاہی خاندان اس وقت انگلستان میں موجود ہے یا بادشاہ نے جو ہدایات اپنے کارندوں کو دی ہیں جو اس ملک میں موجود ہیں، ان میں سے کسی بات سے بھی برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہندوستان یا کہیں اور سازش کے خیال کو تقویت نہیں پہنچتی۔ ان (بادشاہ) کی مستقل طور پر یہی خواہش رہی ہے کہ ان کا معاملہ برٹش پارلیمنٹ اور (برٹش) عوام کے سامنے قانونی طریقے سے پیش کیا جائے اور مولوی صاحب نے یہ بھی درخواست کی کہ ہز مجسٹی کو اس وقت تک مجرم نہ تصور کیا جائے جب تک کہ وہ ثبوت جس پر ان (بادشاہ) کو گرفتار کیا گیا ہے، انگریزی عوام کے سامنے پیش نہ کیا جائے۔

پارلیمنٹ میں درخواست کا خارج ہونا

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف نفرت وحقارت کی جو لہر اودھ بھر میں دوڑ گئی تھی اور انگریزوں کی زیادتیوں کا جو بدلہ اودھ کے باشندوں نے لینا شروع کیا تھا اس کی خبریں جب انگلستان پہنچیں تو لازمی طور سے انگریزوں میں اس کا شدید ردّ عمل ہوا۔ اور ان حالات میں اودھ مشن کی کامیابی کی کوئی توقع باقی نہیں رہی۔ پھر بھی بطور آخری کوشش کے ملکۂ کشور اور جنرل سکندر حشمت وغیرہ نے پارلیمنٹ میں انصاف کی اپیل کی مگر (بقول ایک انگریز مورخ کے) "وہ خارج ہوگئی!۔ نہ بر بنائے وجوہ بلکہ ایک معمولی ٹکنیکل عذر (کا بہانہ لے کر) جو شاہی خاندان کے افراد کے لیے اسی قدر اہانت آمیز تھا جس قدر خود اس قانون داں کے لیے دارالامرا میں جو ایسے (اہم) موقع پر ایسا بہانہ ڈھونڈنے میں منفرد تھا۔

دارالامرا میں دوران بحث یہ اعتراض کیا گیا کہ درخواست گزاروں نے اپنی عرضداشت میں لفظ HUMBLE نہیں لکھا تھا' لہذا وہ درخواست گورنمنٹ نے واپس لے لی یعنی خارج ہوگئی"۔

ملکۂ کشور کا پیرس میں انتقال

ملکہ کشور وغیرہ کو جب اس کا یقین ہوگیا کہ انصاف کی کوئی امید انگریزوں سے نہ رکھنا چاہیے اور اودھ وغیرہ میں جو انگریزوں کا سخت مقابلہ ہو رہا تھا اور جس کی وجہ سے انگلستان میں افراد شاہی سے بجائے ہمدردی کے مخالفت پیدا ہوگئی تھی اس کو مدّ نظر رکھتے ہوئے "جناب عالیہ بہت متفکر و متردد ہوئیں کہ اب بظاہر چارۂ کار و علاج معلوم کہ حصول سلطنت دنیا کا یہ حال دیکھا معلوم ہوا مشیت خدا نہیں اور بالفرض اگر اس کا حصول بھی ہوتا تو جو اس کے مستحق ہیں انھیں ہوتا' لہذا مناسب ہے کہ اب چل کر دولت ایمانی حاصل کیجیے یعنی ملک فرانس سے ہو کر از راہ مصر مشرف بہ حج خانہ کعبہ ہوجیے۔ بظاہر اس خدشہ فتور سے بھی نجات متصور ہے۔ معدود خاص سے تشریف فرما ہوئیں۔ جب پارس (پیرس) میں پہنچیں آلام روحانی سے علالت مزاج بڑھی' آخر ۲۴ تاریخ

شہر جمادی الثانی ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء انتقال فرمایا۔ اسی وقت تار برقی سے خبر وفات لندن پہنچی۔ جنرل صاحب، مرزا ولی عہد بہادر مع ملازمین مرکب دودی سے تشریف لائے ...... وہاں (فرانس) کے وزرائے سلطنت اور شہنشاہ نے نام ونمود و بلند نامی سمجھ کر موافق دستور کے (جنازہ) بڑے تکلف اور دھوم سے اٹھایا کہ قابل یادگار ہے۔ وزرائے سلطنت، ارکان دولت، اعزا، رئیس شہر ہزارہا بہ لباس سیاہ ساتھ ہوئے۔ چند قدم جنرل صاحب پیادہ چلے تھے، جب شدت ہم وغم سے طاقت نہ رہی، وزیراعظم (فرانس) نے اپنی گاڑی میں بٹھالیا، پھر اور سب بھی گاڑیوں پر سوار ہوئے۔ ہزارہا رعایائے شہر پیادہ ساتھ تھے، ہزاروں سیم کوٹھول پر سے کالے رومال غم کے موافق اپنے دستور کے ہلاتی تھیں اور سفیر سلطان روم کے صحن مسجد میں مع تابوت دفن کیا......

جنرل سکندر حشمت کا انتقال

"جنرل صاحب کو اس صدمۂ روحانی سے شدت عارضہ مزمنہ زیادہ ہوئی۔ مختصر یہ کہ ۲۴ تاریخ شہر رجب سنہ الیہ کو انتقال فرمایا۔ اسی طرح ان کے بھی جنازے کو باہتمام شاہانہ اٹھایا۔"[۲۴]

داستان اسیری بزبان واجد علی شاہ

واجد علی شاہ بہت سخت بیمار ہوتے تھے اور صحت یاب ہونے پر غسل صحت کیا اور اس روز انگریزوں نے انھیں گرفتار کر کے فورٹ ولیم میں قید کر دیا۔ اب اس کا بیان انہی کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے۔

کہوں کیا میں ان روزوں تھا جو علیل — شفا کی نکلتی نہ تھی کچھ سبیل
وہ صفراوی تپ مجھ کو تھی الاماں — سلگتی تھی تالو کے اندر زباں
غرض بعد تبرید پائی شفا — نہ طاقت بھی آئی تھی اے مہ لقا
شفا کا جو حمام میں نے کیا — مہینہ وہ شوال[۲۵] کا تھا لکھا
مگر سن پلٹ کر بتر ہوئے — کہ ہم تندرست اور بہتر ہوئے

ہوئیں نذر کی گھر میں تیاریاں لگی کھلنے خلعت کی گلکاریاں

. . . .

سن سوتا تھا غفلت کا جاگا ہوا مقدر ادھر مجھ سے بھاگا ہوا
یکایک یہ غل کان میں آگیا غضب ہوگیا ہے ستم ہوگیا

. . . .

اٹھا خواب سے سن کے آواز میں جھجک رہ گیا دیکھ انداز میں
جو دیکھا تو لبری ہے انگریزی فوج چلی آتی ہے جیسے دریا کی موج

. . . .

سکرتر جو تھے لاٹ کے پیشکار وہ کہنے لگے مجھ سے اے شہریار
کہ چلیے مرے ساتھ یہ حکم ہے نہ کیجیے سوا اس کے اب کوئی شے
کہا میں نے کیا وجہ فرمایئے قصور آپ بندے کا بتلایئے
کہا حکم سرکار ہے یہ ہوا کہ کچھ شبہ سرکار کو آگیا

. . . .

چلیں گے جو ہمراہ فرمایئے جنھیں ساتھ لینا ہو بتلایئے

. . . .

سوا آٹھ لوگوں کے ہووے نہ اور انھیں ناموں میں کیجیے آپ غور[۲۴]

غرض کہ بادشاہ کے ساتھ ان کے پھوپھا مجاہدالدولہ اور دیانت الدولہ اور سیکرٹری ایڈمنیٹین ایک ہی گاڑی میں روانہ ہوئے اور ان کو فورٹ ولیم کے قلی دروازے کی ایک کوٹھی میں قید کردیا۔

چنانچہ بادشاہ کہتے ہیں :-

مجاہد، دیانت سوم ذوالفقار چہارم ہوئے فتح دولہ نثار
جو دولت کے ہیں مہتمم پانچویں ہوا یہ مقرر کہ ہمرہ رہیں
چلے آئے پانچوں ضعیف و نزار مرے ساتھ تھے قید میں بے قرار

مگر بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے مصیبت میں حق نمک کا کچھ خیال نہ کیا اور بادشاہ کو قید میں چھوڑ کر چل دیے۔ چنانچہ طبیب الدولہ کے بارے میں بادشاہ لکھتے ہیں:

مقدم ہو دولہ پہ لفظ طبیب　　تو ہو نام لکھنا قلم کو نصیب
مری نبض رکھتا تھا وہ ہاتھ میں　　پھنسا وہ جواں بھی مرے ساتھ میں
عجب حال ہو ہو گیا اس کا ہائے　　یہ اک دن میں بولا خدا اب چھڑائے
بہت میں نے منت بھی کی اور کہا　　مرے ساتھ سے ہوگا راضی خدا
برس بیس سے تجھ کو پالا ہے یار　　نہ چھوڑ اب مرا ساتھ تو زینہار
نہ مانا مرا کوئی اس نے کلام　　روانہ ہوا گھر کو وہ نیک نام

گورنر جنرل کا خط قید خانے میں

تہتر[1] تھے سن بارہ سو پر رقم　　ہوئے داخل قید خانہ جو ہم
قلی[2] باب دروازہ ہے قلعہ کا　　یہ بندہ وہاں آٹھ دن تک رہا
جو یاں ہیں کننگ[3] صاحب نیک نام　　ہیں ڈلہوسی صاحب کے قائم مقام[4]
وہاں لاٹ صاحب نے بھجوایا خط　　بہت خوش نما اور بہت خوش نمط
یہ مضمون تھا اس میں سراسر لکھا　　محل ایک نہایت ہے افسوس کا
یہ مخلص بہت اس میں مجبور ہے　　یہ سارے زمانے میں مشہور ہے
وہ مفسد جو پھرتے ہیں بے انصرام　　وہ لیتے ہیں اس پاک طینت کا نام
یہ کونسل کی تجویز میں آگیا　　کہ مسکن ہو چندے یہاں آپ کا
کریں آپ تبدیل چندے مکان　　کہ ہو بند یہ باب فتنہ یہاں
یہاں آپ کلکتہ میں جب سے آئے　　نہ کچھ رنج و غم ہم سے حضرت نے پائے
مع نوکروں آپ مختار تھے　　نہ زنداں کے ہرگز سزاوار تھے
نہ آئے گا عزت میں حضرت کے فرق　　رہے گی چمک بات میں مثل برق
کہ ہم نے بھی اور افسروں سے ذرا　　کبھی آبرو میں نہ ہوگی خطا

یقین خوب اس بات کا کیجیے   کہ خواہاں نہیں ہیں ہم اس امر کے
کریں گے ضرور آپ کا بندوبست   بڑے حوصلے کو کریں گے یہ پست
نہ کچھ خانگی امر میں دخل ہے   سوائے ضرورت نہیں اور شے
ضروری جو اسباب ہووے گا اور   مہیا رہے گا نہیں فکر و غور
جو کچھ حدِ امکان میں آتے گا   بحکمِ گورنر وہ مل جائے گا[۵۱]

اس کا حسبِ ذیل جواب بادشاہ کی طرف سے گورنر جنرل کو بھیجا گیا:

جواب اس کا میں نے لکھا اے عزیز   یہ بندہ تو ایسا نہیں بے تمیز
قسم کبریا کی بروحِ رسولؐ   نہیں ہے مرا مفسدوں میں شمول
مرا بیٹا یا بھائی بھی ہو اگر   یہ بندہ نہ ہو اس سے ہرگز خبر
قسم اپنے ایمان کی اے جناب   بہ قرآں بروحِ رسالت مآبؐ
میں آگاہ اس شر سے ہرگز نہیں   یہ بہتاں ہوا ہے کہیں کا کہیں
گزر جائیں گے چند دن یوں اگر   نہ پھر جاں بری ہوگی اے خوش سیر
مجھے حکم ہو اپنے گھر میں رہوں   جواب اطاعت جو دینا ہے دوں
جہاں میں رہوں گا ثنا خواں ہوں   مگر قیدِ غم میں پریشان ہوں
نہ آیا مگر میرے خط کا جواب   نہ مجھ سے کیا پھر کسی نے خطاب[۵۲]

قید خانے کی تبدیلی

واجد علی شاہ کو پہلے قلی دروازے میں قید کیا اور پھر فورٹ ولیم کے اندر ہی ایک کوٹھی میں، جو گورنر جنرل کے لیے مخصوص تھی، منتقل کر دیا۔

چنانچہ بادشاہ کہتے ہیں:

رہے جب قلی باب میں آٹھ روز   ہوئی آتشِ رنج و غم سینہ سوز
جو کوٹھی ہے ایک قلعہ کے بیچ میں   یہ تجویز ٹھہری وہاں پر رہیں
غرض ہم کو لائے اٹھا کر یہاں   فلک الاماں الاماں الاماں

کوئی آنکھ ہم سے ملاتا نہیں　　پرند جانور تک بھی آتا نہیں
ہوئے بند در قید خانے کے جب　　لکھوں کیا جو گزرا ستم اور غضب
کلیجہ مرا منہ کو آ آ گیا　　رکا دم جو سینے میں گھبرا گیا
زن و مرد تیتیس تھے میرے ساتھ　　انھیں لائے کوٹھی میں سب ہاتھوں ہاتھ

والدہ اور بھائی کے انتقال کی خبر

واجد علی شاہ قلعہ ہی میں نظر بند تھے جب ان کو اپنی والدہ جناب عالیہ متعالیہ ملکہ کشور نواب تاج آرا بیگم صاحبہ اور اپنے بھائی "سکندر حشمت دارا مرتبت صاحب عالم مرزا محمد جواد علی بہادر" اور ان کی بیٹی رافت آرا بیگم کے انتقال کی خبر ملی۔ اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

قلم اب سیہ پوش ہو بید رنگ　　سیاہی جما رنج و آفت کا رنگ
کر اب اپنے سینے کو چاک اے قلم　　بہا اشک کاغذ پہ وقتِ رقم
کر اب روتے کاغذ کو ایدل سیاہ　　پہن جامۂ سوگ با اشک و آہ

. . . .

کہ اک دفعتہً آیا لندن سے خط　　لکھا غم کا مضمون تھا اس نمط
مقدم رجب پر جو ہوتا ہے ماہ　　ہوا اس میں یہ واقعہ آہ آہ
مری والدہ تھیں جو عفت مآب　　وہ جنت کو راہی ہوئی ہیں شتاب
وہ دن بدھ کا ایسا قیامت ہوا　　کہ مجھ دل جلے پر وہ آفت ہوا
نویں تھی جو تاریخ اس ماہ کی　　قیامت بپا ہو گئی آہ کی
رجب کے مہینے میں آیا یہ خط　　کہ پڑھنے سے جس کے ہوا دل غلط
لکھا تھا کہ بھائی نے بھی کی قضا　　دہم اس مہینے کی تھی بد بلا
شب جمعہ راہی عدم کو ہوئے　　مرے ہو گئے تنگ سب حوصلے
نویں کو یہ شعبان کی آیا خط　　بھتیجی کا احوال تھا اس نمط

کہ وہ رافت آرا جمیتی جو تھی گئی سوئے دارالبقا دل جلی

- -

ہوئے دفن دونوں یہ ملک فرانس ادھر ہو گیا میرے دل کو ہراس

یہ پوری مثنوی "حزن اختر" ۱۳۹ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور قیدِ فرنگ میں لکھی گئی ہے۔ آخر میں بادشاہ نے "مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات وخاتمہ" لکھا ہے جس میں اپنی بے گناہی کے بارے یوں کہتے ہیں:

یہ ناکارہ اخترؔ کی ہے التجا نہ رد کرنا تو اس کو اے کبریا
کہ یہ بے گنہ قید میں ہے تباہ شب و روز کرتا ہے زنداں میں آہ
نہ کوئی خطا ہے نہ کوئی قصور نہ خاطیِ غلمان نہ ہے دُزدِ حور
نہ خونی نہ رہزن نہ ٹھگ ہے نہ چور کیا ہے نہ کچھ ہے غریبوں پہ جور
گرہ بر نہیں میں اُچکا نہیں نہ لے بھاگا تھا میں کوئی نازنیں
شرابی نہیں ہوں جواری نہیں کسی مال کی راہ ماری نہیں
کسی کو نہیں مجھ پہ دعوا کوئی کہے گا مرے سامنے کیا کوئی
تو ہی جانتا ہے تو ہی ہے علیم جو میں ہوں سزاوار نارِ جحیم

- -

دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہوں میں دُرِ اشک رو کر بہاتا ہوں میں
مری آبرو رکھو خدائے کریم بہت اپنے بندوں پہ ہے تو رحیم
بس اخترؔ کر اب ترک طرزِ بیاں ہوئی ختم یہ مثنوی گلستاں
رکھا حزن اختر جو شعروں کا نام یہی نام رکھ کر کیا ہے تمام
پڑھے جو کوئی دیوے اصلاح نیک کہ روشن رہے دن کو مصباح نیک
الٰہی رہیں شاد یارانِ ہند پھر آباد ہوویں جوانانِ ہند
ہوئی مثنوی اس سخن پر تمام سلامٌ علیکم علیک السلام

قلعے کی تکالیف

قلعے میں علاوہ نظر بندی کے سب سے پہلی جو تکلیف بادشاہ کو ہوئی وہ کھانے کی تھی۔ بقول قیصر التواریخ "خلاصہ ۸ پہر تک طعام خاصہ بادشاہ تک نہ پہنچا آخر مصلح السلطان نے میجر صاحب (میجر ہربرٹ) سے کہا کہ محبوس کو آب وطعام دینا آپ کے خلاف قانون بھی نہیں ہے۔ جب حکم جناب گورنر جنرل بہادر ہوا خوان طعام گئے۔ گورے نے تلاشی کے واسطے ہاتھ کھانے میں ڈال دیا، بادشاہ نے بکمال غیظ و غضب وہ خاصہ نوشجان نہ فرمایا، خوان پھر آئے۔ مصلح السلطان نے پھر صاحب سے کہا کہ اب ۱۲ پہر گزرتے ہیں، حکم ہوا گوروں کے سامنے خواص بادشاہ تلاشی طعام لیا کریں۔"[۱۵]

واجد علی شاہ فطرتاً شاعر تھے لہٰذا قید خانے میں جو مثنوی "حزن اختر" لکھی ہے اس میں انھوں نے اپنی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے۔ قید خانے میں اپنے ضعف کا ذکر شاعرانہ مبالغے کے ساتھ یوں کرتے ہیں۔

یہ احوال اعضا ہے جیسے کباب　　نہ زلفوں میں بل ہے نہ وہ پیچ و تاب
نہ چہرے کا وہ ڈھب نہ وہ دل کا حال　　ہر اک بال ہے جان و تن کو وبال
ہر اک رونگٹا مثل ارّہ ہے تیز　　نہ ہے جائے ماندن نہ پائے گریز
ہر انگلی کا عالم ہے جیسے قلم　　دیا تار مسطر سے ہے وہ بہم

- -

جو گرمی سے یہ لب پیاسے ہوئے　　تو دندان کھیلیں بتاسے ہوتے
کلائی کا عالم یہ ہے کم ہوئی　　کہ پنجہ جو گل سے کیا خم ہوئی
وہ پنجہ جو تھا پنجۂ شاہباز　　شفیعا کے خط کی طرح ہے دراز
رگیں اس طرح اس پہ ظاہر ہوئیں　　رگِ گل کی صورت سے باہر ہوئیں

- -

مہینوں ہوئے لگ گئے دونوں پاؤں　　نہ چلنے کی صورت نہ پھرنے کا داؤں

ہوا بھی جو آتی ہے اڑتے ہیں ہوش　　کفِ غم سے بیزار ہے پائے پوش
وہ گرمی کا رخ سامنے کی وہ دھوپ　　اڑاتی ہے نا طاقتی رنگ و روپ
پھر اس پر غضب چار سنڈاس ہیں　　کہ مجھ دل جلے کے وہ سب پاس ہیں
طپش یہ جو ہوتی ہے برسات کی　　یہ گھٹنس جو ہوتی ہے ہر رات کی
ابھرتی ہے ہر عطرداں کی جو بو　　کہ جس طرح مرچوں کی ہو تند خو
سلگتا ہے اس سے دماغ ضعیف　　ہوا جاتا ہے اور بھی دل نحیف
وہ مچھر وہ مچھر غضب الاماں　　ہر اک رونگٹے میں ہے جن کی زباں
اٹھا ہاتھ مچھر ہلانے کو گر　　چبھویا وہیں پہلے ہی نیشتر
دددوڑے بدن میں وہ خارش کا زور　　وہ کھٹمل کی الفت کہ جیسے چکور[۶]

بادشاہ کی رہائی

غرضکہ بادشاہ نے جو جو مصیبتیں اور روحانی اذیتیں کلکتے کے فورٹ ولیم میں اٹھائیں، ان کا ذکر انھوں نے اس مثنوی میں کیا ہے۔ گورنر جنرل کو بھی اپنی بے قصوری کا بارہا یقین دلایا مگر "نرم دل" کیننگ نے ایک نہ سنی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد جب ہندوستان پر انگریزوں کا دوبارہ اقتدار ہوگیا اور کسی طرف سے کسی خوف کی گنجائش نہ رہی تو تقریباً ۲۵ ماہ کے بعد بادشاہ کو قلعے سے رہا کیا۔ واجد علی شاہ کے خلاف کوئی سازش ثابت نہیں ہوسکی تھی، اگرچہ روز اوّل سے واجد علی شاہ نے اپنی بے گناہی کا دعویٰ کیا تھا اور سازش میں ملوث ہونے کا ثبوت مانگا تھا مگر انگریزوں کی طرف سے سوائے شبہات کے ادنیٰ سا بھی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکا۔ مگر عدالت گستری کا یہ عالم تھا کہ قلعے میں بند کرکے انگریز واجد علی شاہ کو بھول گئے۔ بادشاہ نے اپنے حبس بے جا کے متعلق کئی غزلیں کہی ہیں جس میں سے بعض اشعار ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

مژدہ اے اہل سفر ہم تو وطن بھول گئے　　خارِ صحرا وہ چبھے ہیں کہ چمن بھول گئے
ایسے گم گشتہ ہیں ہم راہِ وطن بھول گئے　　بلبلو راہ نما ہو کہ چمن بھول گئے

اب تلک قید سے میرا نہ ہوا چھٹکارا	یا علیؑ شیر خدا شاہِ زمن بھول گئے
سال بھر قید کو گزرا نہ لگی آنکھ سے آنکھ	ایسے لوٹے گئے ہم لطف وطن بھول گئے
مایۂ علم جو تھا صرف ہوا زندان میں	کسے تعلیم کریں اپنا ہی فن بھول گئے
جب سے قیدی ہوا کلکتے میں اخترؔ آکر	شاعرِ ہند بہت لطف سخن بھول گئے

جب سے کلکتے میں آئے درِ زندان دیکھا	جانتے ہی نہ تھے ماقبل تو ہم مجبوری
یہ تو کلکتے میں ہاتھ آئی ہے اس سے پہلے	قید ہم جانتے تھے اور نہ ہم مجبوری
اب تو چھٹرواؤ کہیں اخترؔ ناشاد کو بھی	ہے گراں اس پہ بہت شاہِ امم مجبوری[۶۱]

ایک فارسی کی نظم کیا خوب کہی ہے اور اس میں اپنی بے قصوری کا بھی ذکر کیا ہے:

جان بتنگ آمدہ اے عیسیٰ دوراں مددے	آبروبخشِ شہاں خسروِ ذیشاں مددے
بیگنہ گشتہ ام از طالع خوابیدہ اسیر	زن و فرزند ہمہ گشتہ پریشاں مددے
بخدا و بہ رسول و کہ منم تابعِ حکم	از کہ فریاد کنم اے شہ شاہاں مددے
اے گورنر جنرل زود رہا کن مارا	دیر در حبس شدہ حاکم زنداں مددے
جرم من ہیچ نکردیم خدا شاہد است	نظرِ رحم بفرما پے ایماں مددے
مفویاں تہمت بیہودہ بمن می بندند	من بری ام تہمش اے مہر درخشاں مددے
چند روز است کہ ہم آب و غذا ترک شدہ	گشتہ ام قرب ہلاکت شہ ذیشاں مددے
اخترؔ زار ہمیشہ بہ درستِ ہست اسیر	گر از قید رہا کن شہِ دوراں مددے[۶۲]

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو الہ آباد میں لارڈ کیننگ نے دربار کرکے ملکۂ وکٹوریہ کا جو اعلان پڑھا تھا وہ "متضمن مواعید رحم و عفو و درگزر" تھا اور اس کی رو سے بھی واجد علی شاہ کی نظر بندی فوراً ختم ہو جانا چاہیے تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی جو درگت بنی تھی، اس سے وہ اس قدر بوکھلا گئے تھے کہ سوائے اپنے اقتدار سنبھالنے کے اور کسی بات کی سدھ نہیں رہی تھی۔

بادشاہ کے حسبِ ذیل خط سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۹ جولائی ۱۸۵۹ء کو (۸ ذی جحہ ۱۲۷۵ھ) قلعہ سے رہا ہو کر مٹیابرج واپس آتے:

نقل محبت نامہ مرقومہ پنجم ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ ہجری

.... نامہ مودت نظام فصاحت آغاز بلاغت انجام مورخہ

ہفتدہم ماہ اکتوبر ۱۸۵۹ء .... بمن وصول ...... گشتہ ....

بادراک این معنی کے تقرر پنشن از نہم جولائی ۱۸۵۹ء کہ یوم بازگشت و معاودت مخلص

بمقام گارڈن ریچ (مٹیابرج) است فرمودہ اند ....

وآنچہ در نیاز نامہ سابق بابت ازدیاد سہ لک[۱۳] روپیہ از قلم اطاعت رقم برآمدہ نظر بایں

بود کہ آن اریکہ آرائے ابہت وکامرانی ابقائے جملہ مدارج تعظیم وتکریم وتاج شاہی اخلاص گزیں

بروست ہمت والائے خود از راہ کمال عنایت ومطبع نوازی تمہید فرمودہ اند ونگاہداشت

کار دور جمنٹ ہم ازانجملہ است نہ از قبیل اظہار حکومت واختیار کہ اکنوں برائے احدی از

سکنائے عملداری سرکار گردوں اقتدار باقی نماندہ ...... ہرچہ رائے الطاف .....

قرار یافتہ خصوصاً برائے نیاز کیش انسب اولےٰ است چہ مقام عذر وچہ مجال گفتگو[۱۴]

مٹیابرج میں واپسی

"آخر ۹ جولائی ۱۸۵۹ء مطابق ۸ ذیحجہ ۱۲۷۵ھ بعد چار بجے حضرت سلطان عالم مع ملازمین

خاص وشاگرد پیشہ وحضور عالم قلعے سے سوار ہو کر کوٹھی مذکورہ میں رونق افروز ہوئے۔ اس دن

بھی عجب دوگانہ عید ہوا' سب نے سجدات شکر ادا کیے۔ پہلے شاہ جی[۶۵] کے گماشتے نے حاضر ہو کر

ایک سو ایک روپیہ تصدق اور اکیس اشرفی نذر گزرانی اور گیارہ اشرفی حضور عالم کو دیں"

مرزا ولی عہد کی لندن سے واپسی

۱۸ جون ۱۸۵۶ کو واجد علی شاہ نے جو قافلہ داد خواہی اور استرداد سلطنت کے سلسلے

میں لندن بھیجا تھا اس کے ساتھ مرزا ولی عہد بہادر بھی لندن گئے تھے اگر اس اودھ مشن کے وہ باقاعدہ

رکن نہ تھے صرف تین رکن تھے یعنی جناب عالیہ ملکہ کشور (بادشاہ کی والدہ) مرزا سکندر حشمت

(بادشاہ کے سگے چھوٹے بھائی) اور مولوی مسیح الدین خان بہادر کاکوروی سفیر شاہی۔ کیونکہ جو میموریل

۱۰ دسمبر ۱۸۵۶ء کو بادشاہ کی طرف سے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لندن میں پیش کیا گیا تھا اس میں بادشاہ نے مرزا ولی عہد کا نام نہیں لیا ہے (مولوی مسیح الدین خان کے نام بادشاہ کا باقاعدہ مختارنامہ تھا اور صرف وہی مقدمے کی پیروی کے مجاز تھے)۔ مرزا ولی عہد بھی عام طور سے اودھ مشن کے رکن سمجھے جاتے تھے۔

جناب عالیہ اور جنرل صاحب مرزا سکندر حشمت کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ انگلستان میں قیام کرکے[۲۵]۔ ماہ صفر روز دوشنبہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۸۵۹ء گارڈن ریچ (مٹیا برج) میں جہاز دودی نے لنگر کیا جب یہ مژدۂ جاوید بسمع مبارک پہنچا فرط محبت و مسرت سے بے قرار ہوکر سب کو حکم استقبال ہوا۔ پہلے مصلح السلطان وکنز الدولہ نے جاکر نذر دی۔ پوشاک سفر بدلوائی۔ مبارک الدولہ سید سجاد علی خان، مرزا محمد عسکری خان بیٹے مرزا رفیع الشان کے یہ بھی بالغرض کلکتہ گئے تھے اور ملازم بھی حاضر ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلے جہاز سے جتنے مسافر تھے سب اتر گئے۔ جہاز دودی سلطانی کو حکم ہوا۔ جب دو بجے جہاز سے مرزا محمد عسکری خان کی کشتی کرائے پر لی۔ مرزا ولی عہد بہادر باہم ہوکر گھاٹ سے اترے۔ بڑے جنرل کے صاحبزادوں نے نذر دی گلے لگایا۔ دوسرے جنرل مرزا فریدوں بخت نے نذر دی، کمال محبت سے ان کے گلے (میں) ہاتھ ڈال دیا پھر مع ان تینوں شاہزادے کے گاڑی پر سوار ہوئے سوار سلطانی جلوۂ سواری میں تھے بڑی دھوم دھام سے قریب ۴ بجے داخل کوٹھی ہوئے۔ بادشاہ اس وقت نواب خاص محل کے پاس تھے، شرف ملازمت والدین حاصل ہوئی۔ قریب شام اپنے خاص محل میں داخل ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر صاحبان ولایت مشتاق ملاقات مرزا ولی عہد بہادر ہوتے ہیں، مگر بسبب خوف[۲۶] بادشاہ از راہ اطاعت تامل کرتے ہیں۔ گفتگوتے زبان انگریزی سے سبب معاشرت صاحبان ولایت مہارت ہوگئی ہے میجر صاحب ان کے لب ولہجہ سے بہت خوش ہوئے بلکہ متعجب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تا مدت قیام ولایت کبھی وہاں کا ذبیحہ نوش نہ فرمایا۔ صاحب مقدور تھے، محتاج مجبور نہ تھے۔ اگر کہیں اتفاق ضیافت ہوا نواکہات پر اکتفا فرمائی۔ دوسرے یہ بھی بہت تعجب ہے کہ اس عالم شباب میں جانب خلاف (شریعت) متوجہ نہ ہوتے حالانکہ اکثر وہاں کے (سے) خالی نہیں پھرتے ہیں[۲۷]

لکھنؤ کی یاد

واجد علی شاہ کی رعایا کو، عام اس سے کہ وہ ہندو ہو مسلمان شہر کا ہو یا دیہات کا ان سے جو محبت تھی وہ کم دیکھنے میں آئی ہے اگرچہ انگریزوں نے انتہائی کوشش کی کہ اودھ کے باشندے بادشاہ کو ظالم و جابر مان لیں مگر اس وقت تک اودھ کے قریہ قریہ میں جب بادشاہ کا ذکر ہوتا ہے تو ہر ہندو اور مسلمان، چاہے وہ زمیندار ہو یا کاشتکار، ان کا نام محبت و عقیدت سے لیتا ہے اور انگریزوں کے لیے سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے۔ بادشاہ کو بھی اپنی رعایا سے ایسی ہی محبت تھی۔ لکھنؤ چھوڑتے وقت انھوں نے یہ شعر پڑھا تھا:

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

فورٹ ولیم کلکتہ میں جب وہ نظر بند تھے تو وہاں بھی لکھنؤ کو نہیں بھولے:

اللہ اے بتو ہمیں دکھلائے لکھنؤ — سونے میں بھی یہ کہتے ہیں ہم ہائے لکھنؤ
ایسا ہوا ہوں ہجر میں اس کے ضعیف و زار — دیکھے اگر مجھے وہیں شرمائے لکھنؤ
مشک و اگر ہے خاک چمن عطر دان میں — عنبر سے بڑھ کے جانتا ہوں لائے لکھنؤ
آئے نہ میرے پاس تو میں آپ ہی چلوں — مجھ کو خدا کرے کہیں بلوائے لکھنؤ
عنقا کی طرح دیکھیے ملتا ہوں یا نہیں — مجھ کو اگر نہ پائے تو پچھتائے لکھنؤ
سیدھا سمجھ کے ہم کو مسلمان کہتے ہیں — ہندو بنائیں گے بت خود رائے لکھنؤ
بے جرم و بے گناہ چھنا میرا تخت و تاج — مجھ بے خطا کو کیوں نہ ہو دعوائے لکھنؤ
کلکتے کے حسینوں کو جب دیکھ لیتا ہوں — اس وقت دل میں ہوتا ہے سودائے لکھنؤ
اب لٹ گیا ہے کیا رہا دوزخ سے بڑھ کے ہے — رشک بہشت کہتے تھے سب جائے لکھنؤ
اعجاز موسوی کو بھلایا خیال سے — دیکھے ہیں اس طرح بیضائے لکھنؤ
گلشن جو ہے نمونہ ہے اس کے جمال کا — پایا ہے سرو نے قد بالائے لکھنؤ
اے جوہری حسن نیا رنگ شعر ہے — مضموں ہمارا ہے در یکتائے لکھنؤ

صیّاد کی طرح ہے قضاو قدر کا حال ‏ دامِ بلا میں پھنس گئے دانائے لکھنؤ

خوش چشمی آہوؤں کی وہ بھولے جہان میں ‏ دیکھے جو آنکھ نرگسِ شہلائے لکھنؤ

گلشن عجب بہار کے ہر قصر رشکِ خلد ‏ اور گومتی غضب کی ہے دریائے لکھنؤ

حور و پری کو رشک تھا اک ایک شخص پر ‏ بے مثل تھے سبھی مہ سیمائے لکھنؤ

مرنے کے بعد بھی نہ مٹے گا جگر سے داغ ‏ جنّت میں ہم کو ہووے گی پروائے لکھنؤ

جب سے ہٹا ہے وہ تہ و بالا یہ ہوگیا ‏ جنّت کوئی ضرور تھی بالائے لکھنؤ

میں کیا کہوں فقیروں کو جو کچھ غرور تھا ‏ اِک اِک گدائے شہر تھا دارائے لکھنؤ

ہٹتا نہیں تصوّر اسباب و ملک و مال ‏ کانوں میں بج رہی ہے وہ شہنائے لکھنؤ

کیا کیا حسین تھے جمع پرستان کا تختہ تھا ‏ نظروں میں پھرتے ہیں رخِ زیبائے لکھنؤ

شاہوں پہ فخر کرتے تھے اس ملک کے گدا ‏ تھا مثلِ جامِ جم کے وہ مینائے لکھنؤ

ہر چند لاکھ طرح بھلاتا ہوں یاد کو
اخترؔ پکار اٹھتا ہے دل ہائے لکھنؤ [۶۸]

حواشی

۱ـ واجد علی شاہ: "جوابات بگوئیک" ص ۱۴

کرنل رچمنڈ چاہتا تھا کہ بلا ثبوت کے واجد علی شاہ رگھبر سنگھ کو قتل کرادیں تاکہ رعایا میں ہراس اور عہدیداروں میں بددلی اور بادشاہ کی مخالفت ہوجاتے اور رچمنڈ کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ سلطنت اودھ کسی قاعدہ و قانون کی پابند نہیں بلکہ صرف افواہ پر اہل کاروں کی گردن اڑادی جاتی ہے۔ خود رچمنڈ نے جیسا کہ بادشاہ نے لکھا ہے رگھبر سنگھ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اگرچہ وہ حدودِ کمپنی میں بیٹھا چین سے زندگی بسر کرتا رہا۔

۲ـ راجہ متو علی خان کے بعد ابتدائے عہدِ انگریزی میں راجہ سرجنگ بہادر خان (جن کو راجہ متوّ علی خاں کی رانی نے متبنّیٰ کیا تھا) تعلقدار ریاست نانپارہ ہوئے۔ ان کے مرنے کے

بعد ان کے بیٹے راجہ محمد صدیق خان تعلقدار نانپارہ ہوتے۔ ان کے بعد ان کے بھانجے راجہ سید محمد سعادت علی خان تعلقدار ریاست ہوتے اور بحمداللہ زندہ ہیں۔ کانگریس گورنمنٹ نے جب زمینداریاں ختم کر دیں تو اودھ میں مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی ریاست بھی ختم ہو گئی راجہ سید محمد سعادت علی خان کے تینوں بیٹے اب مغربی پاکستان میں مقیم ہیں۔

۳ه واجد علی شاہ: "جوابات بلٹو بک" ص ۱۶

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رزیڈنٹ کی رائے پر چلنے کے نتیجے میں اگر کوئی خرابی ہوتی تو اس کی ذمہ داری بھی رزیڈنٹ غریب واجد علی شاہ کے سر تھوپ دیتا!

۴ه واجد علی شاہ: "جوابات بلٹو بک" ص ۱۷

۵ه واجد علی شاہ: "جوابات بلٹو بک" ص ۲۴ - ۲۲

اس عبارت سے جہاں اوٹرم کی بددیانتی ثابت ہوتی ہے وہاں بادشاہ کا منطقی طرز استدلال ثابت کرتا ہے کہ کاروبار سلطنت سے وہ کس قدر باخبر تھے اور رزیڈنٹ ان کو بدنام کرنے کے لیے کس کس طرح سے بے بنیاد الزام لگایا کرتا تھا۔

۶ه ریاست پیاگپور (ضلع بہرائچ) انگریزی دور کے آخر وقت تک قائم تھی اور اس کے راجہ بریندر بکرم سنگھ بہت معقول اور غیر متعصب ہندو تعلقدار تھے۔

۴۰-۱۹۳۹ء میں علامہ مشرقی مرحوم بانیٔ تحریک خاکسار نے گلوا گھاٹ (بہرائچ) کے میدان میں خاکساران صوبجات ثلاثہ (یعنی یوپی بہار اور اڑیسہ) کا ایک کیمپ کیا تھا جس میں مختلف فوجی مشقیں دکھائی گئی تھیں۔ راجہ صاحب پیاگپور نے خاکساروں کی روپیے اور سازوسامان سے بہت مدد کی تھی جس کی وجہ سے وہ کانگریس کے معتوب ہو گئے تھے اور کانگریس حکومت نے ان کو بہت پریشان کیا تھا۔

۷ه اکونہ کا علاقہ مہاراجہ کپورتھلہ کو ۹-۱۸۵۷ء کی جنگ میں انگریزوں کی مدد کے صلے میں ملا تھا۔

۸ه چردہ کے ہندو راجہ نے ۹-۱۸۵۷ء کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف بیگم صاحبہ یعنی حضرت محل کا ساتھ دیا تھا اس لیے انگریزوں نے ریاست چردہ کو ضبط کر کے مہاراجہ

کپور تھلہ کو دے دیا تھا۔ ۳۰-۱۹۲۹ء میں راقم الحروف راجہ صاحب نانپارہ (سید محمد سعادت علی خاں) کے پاس "سعادت منزل" میں بیٹھا ہوا تھا کہ اطلاع ہوئی" راجہ صاحب چردہ تشریف لائے ہیں:" فوراً بلا لیے گئے۔ یہ اصل میں راجہ صاحب چردہ کے پوتے تھے۔ چونکہ ان کے بزرگ نے بیگم صاحبہ (حضرت محل) کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے وہ بھی احتراماً "راجہ" کہلاتے تھے۔ باتوں میں راجپوتوں کا تیکھاپن موجود تھا اور ہر شخص ان کا احترام کرتا تھا تعلقہ چردہ بھی مہاراجہ کپور تھلہ کو دے دیا گیا تھا۔

۹ لوندی کا علاقہ بھی انگریزوں نے اس لیے ضبط کر لیا تھا کہ وہاں کے راجہ اور رعایا نے انگریزوں کے خلاف ۵۹-۱۸۵۷ء کی جنگ میں بیگم صاحبہ کا ساتھ دیا تھا۔ یہ علاقہ بھی مہاراجہ کپور تھلہ کو انگریزوں نے دے دیا تھا۔ یہ تینوں علاقے اکونہ، چردہ اور لوندی ضلع بہرائچ میں واقع ہیں۔

۱۰ واجد علی شاہ: "جوابات بلوبک" ص ۲۴

۱۱ سرکاری مالگذاری کی تحصیل وصول کے لیے اودھ میں تین طریقے رائج تھے۔

۱۔ "حضور تحصیل" جس میں حکومت کی طرف سے ان اراضیات کی تحصیل وصول کے لیے جو کسی مقامی سرکاری افسر کے ماتحت نہ ہوں، ایک افسر خاص مقرر ہوتا تھا۔

۲۔ طریقہ "امانی" یہ تھا کہ ہر تحصیل اور چکلے کے مقامی افسران سرکاری مالگذاری کی تحصیل وصول کر کے داخل خزانہ سرکار کرتے تھے۔

۳۔ تیسرا طریقہ سرکاری مالگذاری کی وصول کا یہ تھا کہ مواضعات کا "اجارہ" یا "ٹھیکہ" دیا جاتا تھا (اس کو "مستاجری" بھی کہتے تھے) مثلاً" دس ہزار روپیہ سال کی مالگذاری کے مواضعات کسی معتبر اور معقول شخص کو دس روپے سیکڑہ کی چھوٹ پر دیے جاتے تھے یعنی" اجارہ دار" یا "ٹھیکہ دار" کل جمع میں سے دس روپے فی سیکڑہ منہا کر کے باقی رقم سال کے آخر میں خزانۂ شاہی میں داخل کرتا تھا۔ اس طریقہ" کار میں دو فائدے تھے۔ ایک تو سرکاری مالگذاری آسانی سے جمع ہو جاتی تھی اور دوسرے یہ کہ شرفا کی پرورش بھی ہوتی تھی۔ "ٹھیکیداری" کا طریقہ اودھ میں بادشاہت ختم ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ بڑے بڑے تعلقوں مثلاً نانپارہ، بلرام پور

اجودھیا (رام نگر)، پیاگپور، علی آباد وغیرہ میں۔ جب تک تعلقداریاں اودھ میں قائم رہیں، ٹھیکیداری کا طریقہ رائج رہا اور ہر سہ فریق یعنی تعلقدار، ٹھیکیدار اور رعایا خوش حال رہے۔

۱۲؎ واجد علی شاہ: "جوابات بلوبک" ص ۷-۲۶

۱۳؎ واجد علی شاہ نے اپنے "جواب" میں ایک مستقل باب قائم کر کے کمپنی کے ممالک محروسہ کے وہ اعداد و شمار پیش کیے ہیں جو خود ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ نے شائع کیے تھے اور اودھ کے متعلق وہ اعداد و شمار دیے ہیں جو رزیڈنٹ نے وقتاً فوقتاً جمع کر کے کلکتے بھیجے تھے۔ اور جن کو ڈلہوزی نے اپنی فرد جرم کی بنا قرار دیا تھا۔ لہذا دونوں کی صحت پر برٹش گورنمنٹ کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ ان اعداد و شمار کے تقابل سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطنت اودھ کا انتظام بہ نسبت کمپنی کے بدرجہا بہتر تھا۔

۱۴؎ واجد علی شاہ: "جوابات بلوبک" ص ۵۴

۱۵؎ کپتان برڈ: "اودھ کی لوٹ" ص ۸۰-۱۷۹

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ دریائے گنگا کا دایاں کنارہ کا نپور یعنی مملکت کمپنی سے ملحق ہے اور اس کا بایاں کنارہ اودھ سے ملحق ہے۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق ہر کنارے کے باشندوں کو اپنے کنارے کی سمت دریا کا پانی لینے کا حق حاصل ہوتا ہے اس لحاظ سے رزیڈنٹ کو ممانعت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اس طرح رزیڈنٹ نے جبراً نہر چار باغ کو نامکمل رکھا اور پھر اسی نامکمل نہر کو واجد علی شاہ کی نااہلی اور بدانتظامی کے ثبوت میں پیش کرتا رہا۔

۱۶؎ اگرچہ "قیصر التواریخ" میں کوئی تاریخ نہیں دی گئی ہے مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی مسیح الدین خان اور میجر بردی ممبران کورٹ آف ڈائرکٹرز سے جس ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے، اس ملاقات میں یہ عرضداشت پیش کی گئی ہوگی۔ (قیصر التواریخ جلد دوم ص ۹-۲۹۸)

۱۷؎ مولوی مسیح الدین خان: "اودھ پر انگریزوں کی چڑھائی" ص ۱۴۶

۱۸؎ کمال الدین حیدر حسینی: "قیصر التواریخ" جلد دوم ص ۲۹۸

۱۱۹ھ کمال الدین حیدر حسینی: قیصر التواریخ، جلد دوم ص ۳۹۹

۱۲۰ھ ایضاً ص ۴۰۰

۱۲۱ھ ایضاً ص ۲ - ۴۰۱

۱۲۲ھ ایضاً ص ۳ - ۴۰۲

معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے "جوابات بُلویگ اور "اودھ مشن" کی کوششوں نے ارکان پارلیمنٹ اور برطانوی عوام کو خاصا متاثر کیا تھا۔

بادشاہ کی بے قصوری ثابت ہو چکی تھی جس سے بوکھلا کر کورٹ آف ڈائرکٹرز نے پنشن کی پیش کش کردی۔ مولوی مسیح الدین خاں اور میجر برڈ کا یہ بڑا کارنامہ تھا کہ اپنے موکل یعنی واجد علی شاہ کی بے جرمی کے ثبوت میں یہ تحریر وزرائے سلطنت اور اراکین پارلیمنٹ کو بھیج دی۔

۱۲۳ھ یعنی داخل کرلی گئی۔

۱۲۴ھ صاحب "قیصر التواریخ" کا پارلیمنٹ میں مسئلہ اودھ پیش ہونے کے بعد یہ لکھنا کہ "غالب ہے کہ آخر مئی میں اجلاس جدید ہو۔ دیکھنا چاہیئے کہ رائے صواب اس اجماع امت کی مقدمۂ خاص اودھ میں کیا پڑتی ہے" بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو مسئلہ اودھ پیش ہوا تھا یعنی آخر ماہ مئی میں۔ پارلیمنٹ کا اسی مہینہ میں جدید اجلاس کا ہونا غیر ممکن تھا۔

۱۲۵ھ ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے ملاقات کی خواہش ثابت کرتی ہے کہ برطانوی عوام اور پارلیمنٹ کے لیے مسئلہ اودھ خاصی دلچسپی کا باعث بن گیا تھا۔

۱۲۶ھ ملکہ کشور نے پرنس آف ویلز کو (جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم کہلائے اور انگلستان کے بادشاہ ہوئے) اپنا بیٹا کہہ کر محرم بنا لیا اور شرعی حیثیت سے ان کے سامنے آنے میں کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔ ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات کے دوران یا دیگر مواقع پر ملکہ کشور نے اگرچہ اس وقت ان کی مقابلتاً کوئی حیثیت نہیں تھی، اپنے وقار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

۱۲۷ھ جناب عالیہ (ملکہ کشور) "آپ" کہہ کر ملکہ وکٹوریہ سے مخاطب ہوئیں اور دوران گفتگو جناب عالیہ نے کوئی بات اپنی شان سے گری ہوئی نہیں کی۔

۱۲۸ھ ملکہ وکٹوریہ سے جناب عالیہ (ملکہ کشور) کی ملاقات ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو ہوئی تھی۔ جیسا کہ

خود ملکہ وکٹوریہ نے اپنے جرنل میں لکھا ہے۔

۲۹ مولوی مسیح الدین خاں: "سفیر اودھ" ص ۹۶-۹۵

۳۰ مولوی مسیح الدین خان کا بیان ہے کہ علاوہ ان کے صرف سر جارج کلارک ملکہ کشور کی پشت پر کھڑے ہوئے تھے۔ صاحب "قیصر التواریخ" نے چونکہ "خطوط لندن" سے نقل کیا ہے۔ اس لیے ان کا بیان ملکہ وکٹوریہ کے بیان کے موافق ہے۔

۳۱ اس سے مراد زانو سے ادب تہ کر کے نذر دینے کے ہیں۔

۳۲ مولوی مسیح الدین خان کا کہنا صحیح ہے کہ وہ پشت پر کھڑے رہے۔ صاحب "قیصر التواریخ" کا یہ لکھنا کہ وہ "پہلو میں بیٹھے" یقیناً غلط ہے کیونکہ یہ، داب شاہی کے خلاف ہے۔

۳۳ ملکہ وکٹوریہ نے جناب عالیہ (ملکہ کشور) کو "تم" "تمھیں" "تمھارے" سے مخاطب کیا تھا۔ میں نے بچپن میں لکھنؤ میں سنا تھا کہ لکھنؤ کے ایک بزرگ ملکہ وکٹوریہ کو اردو سکھاتے تھے مگر ان کو خاص طور سے ہدایت کی گئی تھی کہ وکٹوریہ کو سوائے "تم" کے "آپ" اور "جناب" کے الفاظ نہ سکھائے جائیں۔ اس لیے کہ اردو بولنے والوں میں وکٹوریہ کا کوئی ہم پلہ نہ ہوگا جس سے وہ "آپ" یا "جناب" کہہ کر گفتگو کریں۔

۳۴ میرے خیال میں مولوی مسیح الدین خان کا کہنا درست ہے کہ "دربار کے دوسرے دن" ہندوستان سے بغاوت کی خبر لندن پہنچی تھی۔

۳۵ کمال الدین حیدر حسینی: "قیصر التواریخ" جلد دوم ص ۱۴۳-۱۵

۳۶ مولوی مسیح الدین نے صرف سر جارج کلارک اور اپنی موجودگی دکھائی ہے۔ مسٹر وی۔ اسمتھ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ مگر ملکہ وکٹوریہ کا بیان یقیناً صحیح مانا جائے گا۔ وکٹوریہ نے مولوی مسیح الدین کا ذکر نہیں کیا مگر ان کی موجودگی میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔

۳۷ ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ سات بچے کون تھے، معلوم نہیں۔

۳۸ پرنس البرٹ ملکہ وکٹوریہ کے شوہر تھے مگر تخت نشین نہ ہونے کی وجہ سے ان کا درجہ ملکہ سے کم تھا اور اسی لیے وہ ملکہ کے پیچھے دونوں بڑے لڑکوں کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ پرنس البرٹ کا ذکر مولوی مسیح الدین خان نے کیا ہے اور نہ صاحب "قیصر التواریخ" نے۔ یہ فروگذاشت

معدوم نہیں ہوا ہے یا قصداً۔ ممکن ہے اس وقت کی سیاسی فضا کو دیکھتے ہوئے وکٹوریہ کے شوہر کا ملکہ کشور کے پس پشت کھڑے ہونے کا ذکر اس لیے نہ کیا ہو کہ کہیں ہندوستان کے برطانوی حکام اس کو ملکہ وکٹوریہ کی توہین تصور نہ کریں۔

۳۹ـه میں نے اپنے بچپن میں مٹیا برج میں آہنی پھاٹک (ایک مقام کا نام) کے سامنے ایک ہندو تنبولی (جس کا دادا بادشاہ کے ساتھ لکھنؤ سے مٹیا برج آیا تھا) کی دکان پر بادشاہ کی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں وہ گھوڑے پر سوار میدان میں پریڈ کرا رہے ہیں۔ بہت عمدہ تصویر تھی۔ میں نے برادر عزیز خان بہادر مرزا ابوجعفر صاحب (انسپکٹر آف اسکولز) کو کلکتہ لکھا کہ وہ اس کا فوٹو لے کر بھیج دیں۔ جب انھوں نے فوٹو مانگا تو نہ صرف دینے سے انکار کر دیا بلکہ تصویر کو گھر میں چھپا دیا۔ بادشاہ کے متعلق اس کی محبت بھری باتیں اب بھی یاد آتی ہیں۔ اسی طرح رائے بہادر بدری داس، جن کی محل نما بہت بڑی کوٹھی بڑی بازار (ہیریسن روڈ) میں تھی۔ کلکتہ کے سب سے بڑے جوہری تھے۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور والد ماجد مرحوم کے ساتھ کے تھے۔ وہ بادشاہ ہی کے زمانے میں کلکتہ آ گئے تھے اور بادشاہ کو عجیب محبت سے یاد کر کے ہزاروں دعائیں دیا کرتے تھے۔ یہ ذکر ۱۶-۱۹۱۴ء کا ہے۔

۴۰ـه میرے خیال میں لارڈ کیننگ اور اس کے رفقائے کار نے وقتی سیاسی ضرورت کے تحت یہ خبر گڑھی اور بادشاہ کو نظر بند کر دیا۔ جس کا نتیجہ حسب دلخواہ ہوا یعنی لندن میں جو ہمدردی بادشاہ کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی وہ ختم ہو گئی اور کمپنی کے مظالم کا مداوا نہ ہو سکا۔

۴۱ـه گورنر جنرل کا یہ اعتراف کہ واجد علی شاہ کا نام لے کر عوام کو برٹش گورنمنٹ کے خلاف ابھارا جا رہا تھا۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے میں عام طور سے لوگوں کی یہ رائے تھی کہ واجد علی شاہ بے قصور تھے اور ان کی سلطنت کا ضبط کرنا ظلم تھا۔ یہ تو برطانوی حکومت کا شاہکار ہے کہ اس نے خود اور اپنے کاسہ لیسوں کے ذریعے واجد علی شاہ کو اس قدر بدنام کیا کہ عوام برطانوی جھوٹے پروپگنڈے کو صحیح سمجھنے لگے۔

۴۲ـه باوجود واجد علی شاہ کے متواتر مطالبے کے تقریباً پچیس ماہ کی طویل نظر بندی کے بعد بھی کوئی شہادت، تحریری یا زبانی، برٹش گورنمنٹ پیش نہ کر سکی جس سے بادشاہ کا بغاوت کی سازش

میں ملوث ہونا ثابت ہو سکتا، اور نہ بہادر شاہ ظفر کی طرح واجد علی شاہ پر بھی مقدمہ چلایا جاتا اور مزید سزا بھگتنا پڑتی۔ مٹیا برج میں میں نے یہ بھی سنا تھا کہ گورنمنٹ نے لوگوں کو بادشاہ کے خلاف بیانات دینے کے لیے تیار کرنا چاہا تھا مگر کوئی تیار نہ ہوا اور خود انگریزوں نے واجد علی شاہ کی ہردلعزیزی کو دیکھ کر اس کی مخالفت کی اور بالآخر ارباب حکومت باز رہے!

۴۳ھ "تاریخ غدر در ہندوستان" ص ۵۸۶

۴۴ھ کمال الدین حیدر حسینی: "قیصر التواریخ" جلد دوم ص ۱۲ - ۴۱۵

۴۵ھ "قیصر التواریخ" ص ۴۰۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ شوال ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۵ جون ۱۸۵۷ء تھی۔ بادشاہ نے کوئی تاریخ اپنی مثنوی میں نہیں دی ہے۔

۴۶ھ واجد علی شاہ: مثنوی "حزن اختر" ص ۴۳، ۴۴ تا ۴۷

۴۷ھ واجد علی شاہ کی قلعے میں نظر بندی ۲۲ شوال ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو ہوئی۔ غلطی سے کاتب نے "حزن اختر" کے صفحہ ۴۴ پر ۱۲۷۲ھ لکھ دیا ہے جو یقیناً غلط ہے۔

۴۸ھ یہ دروازہ کلکتے میں اب تک "قلی دروازہ" کے نام سے مشہور ہے۔

۴۹ھ "کننگ" سے مراد گورنر جنرل لارڈ کیننگ ہے۔

۵۰ھ قائم مقام یعنی جانشین کیوں کہ لارڈ ڈلہوزی کے بعد کیننگ بحیثیت مستقل گورنر جنرل کے ہندوستان آئے تھے۔

۵۱ھ گورنر جنرل کا یہ خط وہی معلوم ہوتا ہے جو سیکرٹری ایڈمنسٹن نے ۱۷ جون ۱۸۵۷ء کو بادشاہ کو دے کر قلعے میں بحکم گورنر جنرل چلنے کو کہا تھا۔

۵۲ھ یہ بھی انگریزوں کی ایک چال تھی کہ انھوں نے واجد علی شاہ پر سازش کا بے سروپا الزام لگا کر قید کر دیا ورنہ وہ خوب جانتے تھے کہ واجد علی شاہ کسی سازش میں شریک نہ تھے۔ اصل منشا برٹش عوام کو واجد علی شاہ سے بدظن کر کے "اودھ مشن" کو ناکامیاب بنانا تھا جس میں گورنر جنرل کامیاب ہو گیا۔

۵۳ھ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گورنر جنرل نے بعد میں ۲۳ آدمیوں کو بادشاہ کے ساتھ قلعے میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

۵۴ھ بادشاہ نے اپنی والدہ کے انتقال کی تاریخ ۹ جمادی الثانی (۱۲۷۳ھ) بروز چہار شنبہ لکھی ہے۔ اس لحاظ سے "قیصر التواریخ" (ص ۴۱۰ میں دی ہوئی تاریخ ۶ جمادی الثانی غلط ہے

۵۵ مرزا سکندر حشمت کے انتقال کی تاریخ بادشاہ نے ۱ ارجب لکھی ہے مگر "قیصر التواریخ" (ص ۲۱۲) میں ۱۱ رجب دی ہے جو غلط معلوم ہوتی ہے۔

۵۶ اس لڑکی کا نام رافت آرا بیگم تھا اور عمر چار سال تھی۔ اس کو بھی وہیں اپنے باپ کے پاس دفن کر دیا گیا۔

۵۷ واجد علی شاہ: "حزن اختر" ص ۷۱-۶۹، ۵۸، ۵۴، ۴۸

۵۸ ایضاً ص ۱۳۹، ۱۴۷

۵۹ کمال الدین حیدر حسینی: "قیصر التواریخ" جلد دوم ص ۴۰۸

لارڈ کیننگ کی نیکی اور رحم دلی انگریزوں نے مشہور کی تھی کہ ان کو "نرم دل کیننگ" (CLEMENEY CANNING) کا لقب دے دیا تھا اور اسی سے وہ مشہور تھا۔ مگر نرم دلی کے باوجود وہ اس قدر قسی القلب ثابت ہوئے کہ واجد علی شاہ کے "خاصہ" کے لیے ۸ پہر تک حکم نہیں دیا۔ کہاں نرم دلی کی اس قدر شہرت اور کہاں ایک ہندوستانی والیٔ ملک کے ساتھ یہ شقادت!

۶۰ واجد علی شاہ: "حزن اختر" ص ۳۴۵، ۳۲۲

۶۱ واجد علی شاہ: "دیوان مبارک" (قلمی) ص ۵۳۸

میں جناب مہدی علی مرزا صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے "دیوان مبارک" سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ مہدی علی صاحب پرنس کام بخش بہادر کے پوتے ہیں، جنھیں میں نے مٹیا برج اور کلکتے میں بارہا دیکھا تھا۔ مہدی علی مرزا صاحب کا شجرہ حسب ذیل ہے

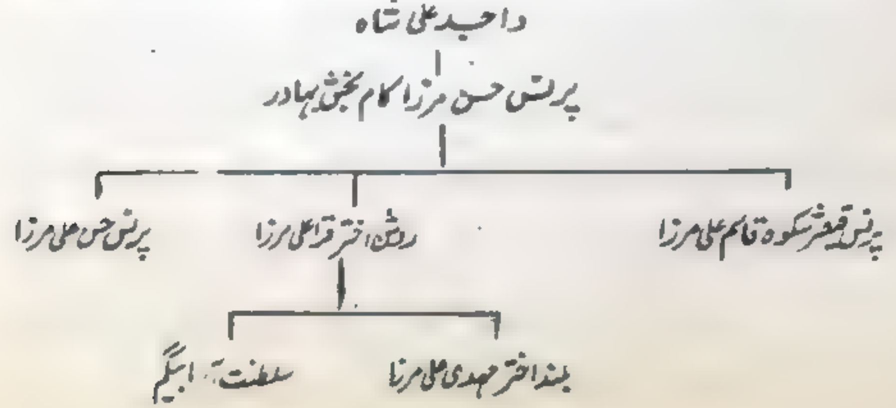

۶۲ھ واجد علی شاہ: "دیوان مبارک" (قلمی) ص ۴۰- ۵۳۹

۶۳ھ انتزاع سلطنت کے وقت جو نیا عہد نامہ واجد علی شاہ کے دستخط کے لیے اوٹرم نے پیش کیا تھا اس میں "۱۲ لاکھ سالانہ مصارف ذات بادشاہ (اور) تین عملۂ شاگرد پیشہ مجموعی پندرہ لاکھ" تھا۔ جس کو اس وقت واجد علی شاہ نے منظور نہیں کیا تھا۔ اب صرف ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر ہوئی تھی، اسی لیے بادشاہ بقیہ تین لاکھ روپیہ سالانہ کا ذکر کر رہے ہیں۔

۶۴ھ کتاب "نقول محبت نامجات" (قلمی) ص ۷۵

۶۵ھ "قیصر التواریخ" جلد دوم ص ۱۸ ۴

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ اپنی ہندو رعایا میں بھی کس قدر ہر دلعزیز تھے۔

۶۶ھ اس سے بھی بادشاہ کو جو نفرت انگریزوں سے تھی وہ ثابت ہوتی ہے۔

۶۷ھ کمال الدین حیدر حسینی "قیصر التواریخ" جلد دوم ص ۲۱ - ۴۲۰

۶۸ھ واجد علی شاہ: "دیوان مبارک" ص ۶۹۲

شادانی صاحب

نظیر صدیقی

میرے والدین ۱۹۴۷ء کے اواخر میں اپنے وطن بہار کو خیرباد کہہ کر ڈھاکہ آگئے تھے۔ میں اس وقت گورکھپور میں آئی اے کا طالب علم تھا۔ جب میں آئی اے کے فائنل امتحان سے فارغ ہو کر جون ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ آیا تو میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ آیندہ تعلیم کے لیے اپنی دیرینہ آرزو کے مطابق علی گڑھ جاؤں یا والدین کے اصرار کے مطابق یہیں رہ جاؤں۔ ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کے باعث فیصلہ اور بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اسی کشمکش کے عالم میں میں نے سوچا کہ چلو شادانی صاحب سے مل لو، ممکن ہے ان سے مل کر اپنا مسئلہ حل ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف اپنا مسئلہ حل کرنے کے لیے میں ان سے ملنا چاہا۔ دراصل ایک مدت سے میرے دل میں شعر و ادب کے دوسرے باکمالوں کی طرح انہیں بھی دیکھنے اور ان سے ملنے کی آرزو موجود تھی۔ اپنی تعلیم کے معاملے میں ان کے مشوروں سے مستفید ہونے کا خیال ان سے ملنے کا مزید بہانہ ثابت ہوا۔

ایک دن اپنے ایک عزیز کے ساتھ شادانی صاحب سے ملنے کی مہم سر کرنے کے لیے صبح کے دس گیارہ بجے گھر سے نکل پڑا۔ خاصا چکر لگانے کے بعد جب ہم دونوں اس بنگلے کے گیٹ تک پہنچ گئے جسے شادانی صاحب کی قیام گاہ بتایا گیا تھا تو ہم گیٹ کے پاس پہنچ کر رک گئے اور اس کا انتظار کرنے لگے کہ کوئی شخص ہم سے کہے کہ آئیے اندر آجائیے۔ اتنے میں گیٹ کے سامنے والے کمرے سے ایک صاحب نکل کر برآمدے میں آئے۔ کرتے اور پاجامے میں ملبوس، آنکھوں پر عینک، پاؤں میں چپل، صاف رنگ چھریرا جسم، نکلتا ہوا قد، انھوں نے ایک لمحہ ہم دونوں کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کچھ پوچھنا چاہتے

ہو تو پوچھ لو۔ لیکن چونکہ ہم خود پوچھے جانے کے منتظر تھے' اس لیے خاموش رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صاحب مڑ کر پاس کے تخت پر بیٹھ گئے' اور بکھرے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کرنے لگے۔

میں نے اپنے عزیز سے کہا: غالباً شادانی صاحب یہی ہیں۔ آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں پوچھ کر آتا ہوں"۔ چنانچہ گیٹ کھول کر ڈرتا' جھجکتا برآمدے میں گیا۔ ان صاحب نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں نے سلام کیا اور کہا" میں شادانی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے دھیمی آواز میں بولے" Shadani is my name" میں نے کہا قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں! انھوں نے فوراً میرے شانے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر مجھے اپنے قریب بٹھالیا اور مجھ سے وہ تمام باتیں پوچھنے لگے جو ایسے موقع پر کسی اجنبی سے پوچھی جاتی ہیں' میں نے جواب دینے سے پہلے اپنے عزیز کو برآمدے میں بلاکر اپنا اور ان کا تعارف کرادیا۔ شادانی صاحب بڑے لطف و مرحمت کے ساتھ گفتگو کرتے رہے لیکن شعر وادب سے متعلق کوئی بات نہ ہوئی گو اس وقت وہ کوئی ادبی ہی کام کرنے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے جو کاغذات بکھرے ہوئے تھے ان پر ادھر ادھر نظر ڈالنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لکھنوی شاعری کے متعلق کچھ لکھ رہے تھے۔ دراصل یہ وہی مضمون تھا جو کئی سال بعد" لکھنوی شاعری کی چند خصوصیات" کے عنوان سے نگار" میں شائع ہوا۔ اگرچہ ان کی باتوں میں یہ اشارہ کہیں بھی نہ تھا کہ اچھا بھئی اب تم جاؤ اس وقت معروف ہوں پھر کبھی آجانا' تاہم میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔

پہلی ملاقات میں شادانی صاحب کی دو چیزوں نے مجھے بہت متاثر کیا' ایک تو ان کی شفقت آمیز پذیرائی نے' دوسرے ان کی خوش گفتاری نے' گزشتہ دس بارہ سال کے اندر میں نے انہیں ہر اجنبی کے ساتھ خواہ وہ کسی طبقے یا کسی درجے کا ہو اسی خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے دیکھا ہے جو پہلی ملاقات میں مجھ سے روا رکھی گئی تھی۔ ان کے متعلق یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ وہ اپنے نئے ملنے والوں کی پذیرائی میں بچھ بچھ جاتے ہیں کیونکہ عموماً وہ اپنے ملنے والوں کو نہ تو چائے سے پوچھتے ہیں نہ پان سے نہ سگریٹ سے لیکن اس کے باوجود وہ اجنبیوں سے اس طرح ملتے ہیں جیسے وہ ان پر یا ان کے وقت پر بار نہیں ہیں' ان کی گفتگو شروع تو ہوگی رسمی باتوں ہی سے لیکن ان باتوں میں بھی بظاہر ایسا خلوص ہوگا کہ ان کے رسمی ہونے کا احساس پیدا ہی نہ ہوگا۔ لفظ' بظاہر' میں نے اس لیے استعمال کیا کہ ظاہر ہے ہر اجنبی کے ساتھ اخلاق برتنا جس قدر آسان ہے اخلاص برتنا اتنا ہی مشکل۔ لیکن شادانی صاحب کی ایک صفت یہ ہے کہ ان کے اخلاق پر اخلاص کا

گمان ہونے لگتا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں سے بڑی خندہ پیشانی اور خوش دلی سے باتیں کرتے ہیں۔

بعض بڑے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے ملنے جائیے تو محسوس ہوگا جیسے یک طرفہ ملاقات ہو رہی ہے یا یہ کہ دو شریف آدمیوں کے درمیان ملاقات نہیں ہو رہی بلکہ قوم کے لیڈر اور اخبار کے رپورٹر کے درمیان انٹرویو ہو رہا ہے۔ آپ نے کچھ پوچھا تو انھوں نے جواب دے دیا۔ نہ پوچھا تو نہایت بدنما قسم کی خاموشی طاری ہے۔ شادانی صاحب سے ملاقات کے دوران یہ صورت حال کبھی پیش نہیں آنے پاتی۔ ان سے ملنے والا کتنا ہی کم سخن اور شرمیلا کیوں نہ ہو وہ اس مسئلے سے ہرگز دوچار نہ ہوگا کہ اب کیا کہیں اور کیا پوچھیں شادانی صاحب اپنے ملنے والے کی دو چار باتوں سے گفتگو کا کوئی موضوع نکال لیں گے اور اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہتے چلے جائیں گے، بیچ بیچ میں ملاقاتی کو بھی کچھ کہنے کا موقع دیتے رہیں گے، اس بات کے درپے ہرگز نہ ہوں گے کہ ملنے والا انہیں بڑا ذہین اور ظریف مان کر اٹھے مگر ان کی باتیں ذہانت اور ظرافت سے خالی کبھی نہ ہوں گی۔ شادانی صاحب کی ظرافت، برجستہ جوابی سے زیادہ بذلہ سنجی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ان کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ لوگوں پر فقرہ چست کرنے کی بجائے لطیفہ چست کرتے رہتے ہیں۔ انھیں لطیفے بے شمار یاد ہیں اور برمحل یاد آتے ہیں۔ ان کی صحبت میں کوئی شخص کوئی لطیفہ سنائے تو کہیں گے اے صاحب یہ تو کچھ بھی نہیں، پھر وہ اسی انداز کا مگر اس سے زیادہ دل چسپ لطیفہ سنائیں گے۔ ایک شام میں ان کے گھر پر بیٹھا بات چیت کر رہا تھا۔ ان کی بھتیجی نجم (جو اس وقت تک ان کی بہو نہیں بنی تھیں) بھی موجود تھیں۔ موضوع گفتگو کی مناسبت سے میں نے شادانی صاحب کو ایک لطیفہ سنایا۔ حسب معمول انھوں نے اپنی مخصوص تمہید کے ساتھ اس سے بہتر لطیفہ سنانا چاہا تو نجم چڑ کر بولیں "پاپا آپ کبھی تو کوئی لطیفہ خوشی اور حیرت کے ساتھ سن لیا کیجیے" اس جملے سے ہم سبھی محظوظ ہوئے اور شادانی صاحب کچھ دیر تک فخر کی ہنسی ہنستے رہے۔

شادانی صاحب اپنی گفتگو میں لطیفے تو کثرت سے بیان کرتے ہیں لیکن ایسے فقرے بہت کم کہتے ہیں جن میں لطیفوں کی سی خوبصورتی، دل چسپی اور یاد رہ جانے کی صلاحیت ہو۔ بہر حال اس وقت مجھے ان کا ایک فقرہ یاد آ رہا ہے جو برسوں سے میرے ذہن میں پیوست ہے۔ ہوا یہ کہ آج سے کئی سال پہلے پاکستان کی مرکزی حکومت کی طرف سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام اردو کا کورس ان بنگالی طلبہ کے لیے قائم کیا گیا جو مدرسۂ عالیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں اردو میں اتنی مہارت حاصل ہو جائے کہ مدرسوں

اور اسکولوں میں اردو کے مدرس کے فرائض انجام دے سکیں اور اس طرح ان کے کسب معاش کی ایک صورت نکل آئے۔ باوجود اس کے کہ مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہی ہے، بنگالی طلبہ کی اردو بہت کمزور ہوتی ہے۔ میں اس زمانے میں بی۔اے کا طالب علم تھا۔ ایک دن شام کے چار بجے جب یونیورسٹی کی کلاسیں ختم ہو چکیں تو شادانی صاحب اپنے بعض رفقائے کار کے ساتھ شعبے سے نکلے اور گھر کی طرف چلے۔ میں ان حضرات کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس زمانے میں متذکرہ طلبہ کا امتحان ہوا تھا۔ شادانی صاحب اور ان کے رفقائے کار ان طلبہ کے نتائج کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ جب شادانی صاحب نے سنا کہ طلبہ کی اکثریت نے پرچے بہت خراب کئے ہیں تو انھوں نے کہا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان طلبہ کے نتائج کس طرح پیش کئے جائیں۔ اگر یہ پاس نہ کریں تو برا ہے اور پاس کر جائیں اور زیادہ برا ہے۔

شادانی صاحب کی موجودگی کسی بزم کو بے کیف نہیں ہونے دیتی۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی اجتماع میں بدنما خاموشی کے راہ پانے کا امکان نہیں۔ بات بات پر کوئی لطیفہ یا واقعہ یا کہانی بیان کر کے لطف صحبت کو برقرار رکھنے کا جیسا سلیقہ انھیں آتا ہے وہ ادیبوں اور شاعروں میں بھی کم یاب ہے۔ ان کی آواز اتنی صاف ستھری دل کش اور دور رس واقع ہوئی ہے کہ بات شروع کرتے ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور اپنی خوش گفتاری کے سہارے طویل واقعہ یا طویل کہانی بھی اس قدر خود اعتمادی اور خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والوں کی دل چسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ کسی جلسے یا مشاعرے کی صدارت کوئی اور کر رہا ہو جب بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز شادانی صاحب ہی رہا کرتے ہیں اور اگر وہ خود صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہوں تو صبر آزما شاعروں اور مقرروں کے باوجود سامعین کو بے کیف ہونے دیتے ہیں نہ بے قابو۔ خصوصاً مشاعروں کی صدارت میں ان کی دو چیزیں سامعین کو شعرا کے کلام سے بھی زیادہ مزا دے جاتی ہیں، ایک تو شعرا کا تعارف، دوسرا انھیں کی زمینوں میں فی البدیہہ اشعار۔

شادانی صاحب مشاعرے کے کامیاب صدر ہی نہیں کامیاب شاعر بھی ہیں! اچھے سے اچھے شاعر کا مشاعرے کے نقطۂ نظر سے کامیاب شاعر ہونا ضروری نہیں۔ لیکن قدرت کی فیاضیوں نے شادانی صاحب کو اپنے زمانے کا ایک ممتاز شاعر بنانے پر قناعت نہیں کی بلکہ انھیں اس نعمت سے بھی نوازا جس کے بغیر آج کل خوش گو شعرا بھی مشاعروں سے بے آبرو ہو کر لوٹتے ہیں۔ شادانی صاحب کو کبھی اپنی خوش آوازی پر ناز تھا۔ اپنی اس آواز کے مقابلے میں جو ان کا ساتھ چھوڑ چکی ہے وہ اپنی موجودہ آواز کو یکسر ہیچ سمجھتے ہیں۔ لیکن آج تک وہ پڑھتے ترنم

ہی سے ہیں۔ ان کے پڑھنے کا انداز ایسا ہے جو نہ کسی اور کے انداز کی تقلید ہے اور نہ جس کی تقلید کوئی اور کر سکتا ہے۔ اگرچہ ان کے موجودہ ترنم میں کوئی دل کشی اور دل کشائی باقی نہیں لیکن اتنی جان اب بھی ہے کہ اسے سننے کے بعد خدا سے یہ دعا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ خدایا انھیں تحت اللفظ پڑھنے کی توفیق عطا کر۔ جس طرح وہ جذبات میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں اسی طرح جذبات میں ڈوب کر پڑھتے بھی ہیں۔ ان کی شاعری کا عاشقانہ رنگ اور ان کے پڑھنے کا والہانہ طرز دونوں کی ہم آہنگی مشاعروں میں تاثیر و تاثر کی وہ فضا چھوڑ جاتی ہے جس سے لطف اندوز ہونا اتنا ہی آسان ہے جتنا اسے بیان کرنا دشوار۔

شادانی صاحب اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں خوش گفتار ہونے کے علاوہ بڑے اچھے مقرر بھی واقع ہوئے ہیں۔ اس باب میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فارسی اور انگریزی میں ان کی گفتگو اور تقریر اردو سے کسی طرح کم رواں اور فصیح نہیں ہوتی۔ ڈھاکے میں انھیں فارسی بولنے اور لکھنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی یہاں تک کہ بی اے آنرز اور ایم اے کے طلبہ کو فارسی پڑھاتے وقت بھی نہیں۔ اس کے باوجود جب وہ دو مرتبہ پاکستانی وفد کے ساتھ ایران گئے یا ڈھاکہ میں شاہ ایران کی تشریف آوری کے زمانے میں بعض ایرانی افسروں اور شاعروں سے گفتگو کا موقع آیا یا کبھی کبھار ڈھاکے میں ایرانی سفیر سے ملنا ہوا تو ان مواقع پر انھوں نے فارسی میں اسی سہولت اور سلاست کے ساتھ گفتگو کی جو اہلِ زبان کا حصہ ہے۔ ان کے ایک رفیق کار ایک سال ایران میں رہ کر آئے۔ وہاں رہنے کے اثر سے فارسی میں ان کی زبان خاصی رواں ہو گئی۔ ان کی واپسی کے دو تین سال بعد شادانی صاحب کو ایک مرتبہ ایرانی سفیر کو اپنے گھر پر مدعو کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس صحبت میں انھوں نے اپنے دو رفقائے کار کو بھی شریک کر لیا۔ ان میں سے ایک وہ تھے جو کبھی ایران تو نہیں گئے لیکن عربی اور فارسی کے مشہور عالموں اور اردو کے ممتاز ادیبوں میں سے ہیں۔ دوسرے وہ جو ایک سال ایران رہ آئے تھے۔ اس تقریب میں ایرانی سفیر سے ساری گفتگو شادانی صاحب کو کرنی پڑی۔ ان کے دونوں رفیق کار سامعین کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جب ایرانی سفیر چلا گیا تو ان صاحب نے جنھیں ایران سے آئے ہوئے دو تین ہی سال ہوئے تھے، شادانی صاحب سے کہا کہ صاحب آج مجھے محسوس ہوا کہ فارسی بولنے کی تھوڑی سی مہارت جو میں نے ایران میں حاصل کی تھی ڈھاکہ آکر کھو چکا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اپنی مہارت کیونکر برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

شادانی صاحب فارسی میں صرف گفتگو کرنے پر قادر نہیں، انھیں فارسی میں تقریر کرنے اور فی البدیہہ

شعر کہنے پر بھی قدرت حاصل ہے، اور اس قدرت کا مظاہرہ خود ایران میں کر آئے ہیں۔ پاکستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے انھوں نے ایران کی سیر کے مختلف مواقع پر جو فی البدیہہ اشعار کہے انھیں میرے مضمون "شادانی صاحب کی بدیہہ گوئی" میں ملاحظہ فرمائیں۔

شادانی صاحب نے انگریزی پرائیویٹ طریقے پر پڑھی۔ لیکن اس زبان میں بھی ان کی گفتگو اور تقریر اتنی ہی رواں ہوتی ہے جتنی انگریزی کے کسی سند یافتہ فاضل اور کہنہ مشق مقرر کی ہو سکتی ہے وہ ایک بلند پایہ مقرر ہی نہیں باکمال مباحث بھی ہیں اور اس حیثیت سے شہر کے تعلیمی حلقوں اور تہذیبی اداروں میں نہایت مقبول و محترم ہیں۔ کسی مباحثے میں ان کی شرکت مباحثے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس دن کا ایک واقعہ بن جاتی ہے۔ یوں تو ان کی برجستہ تقریریں بھی پر لطف اور پر مغز ہوتی ہیں لیکن جب انہیں کسی مقررہ پروگرام کے تحت کسی متعینہ موضوع پر تقریر کرنا ہوتی ہے یا مباحثے میں حصہ لینا ہوتا ہے تو وہ اپنے موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی میں خاصی محنت کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے ذاتی غور و فکر اور دوسروں سے تبادلۂ خیال کی بدولت انہیں جتنے نکات و دلائل ہاتھ آتے ہیں کاغذ پر نوٹ کرتے جاتے ہیں، تقریر کرتے یا مباحثے میں بولتے وقت اس کاغذ کو سامنے رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کی طرح ان کی تقریریں بھی مختصر ہوں یا طویل شروع سے آخر تک دلچسپ اور جاذب توجہ ہوتی ہیں۔ جہاں اپنے موضوع کی موافقت میں ان کے دلائل نہایت مضبوط اور منطقی ہوتے ہیں وہاں مخالفین کے نقطۂ نظر اور طریق استدلال پر ان کی ضرب کاری اور ان کا وار بھر پور ہوتا ہے۔ اپنے مضامین کی طرح اپنی تقریروں میں بھی وہ دنیا کے مشہور ادیبوں اور مفکروں کے افکار و اقوال کا حوالہ کم دیتے ہیں یا بالکل نہیں دیتے البتہ ان کی کوئی تقریر دلچسپ مثالوں اور لطیفوں سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کی مثالیں اور ان کے لطیفے صرف ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم نہیں کرتے بلکہ زبردست منطقی حربے کا کام دیتے ہیں۔

شادانی صاحب پیشے کے اعتبار سے پروفیسر ہیں لیکن اگر وہ پروفیسر نہ بھی ہوتے جب بھی دیکھنے میں پروفیسر ہی معلوم ہوتے۔ شاید یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو اور میں ٹھیک سے اس کی وضاحت بھی نہیں کر سکتا بس یوں سمجھیے کہ جس طرح بعض آدمیوں کی صورت شکل، وضع قطع، طور طریق، رفتار و گفتار اور حرکات و سکنات کو دیکھ کر ان پر مفکر یا شاعر ہونے کا گمان ہوتا ہے حالانکہ ان خصوصیات کے اعتبار سے یہ بات مقرر نہیں ہے کہ مفکروں یا شاعروں کو ایسا یا ویسا ہونا چاہیے، اسی طرح شادانی صاحب کو دیکھ کر ان پر پروفیسر ہونے کا گمان ہوتا ہے، یہ اور بات کہ حسن اتفاق سے وہ پروفیسر ہیں بھی۔

شادانی صاحب شعبۂ اردو و فارسی کے صدر اور سینئر پروفیسر ہونے کے باعث تین مرتبہ تین تین سال کے لیے فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی رہ چکے ہیں۔ ڈین کی حیثیت سے انھیں یونیورسٹی کے سارے اساتذہ اور طلبہ (جن کا تعلق آرٹس سے تھا) سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ ان کے معاملات و مسائل سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے تھے۔ آفس ہی نہیں گھر پر بھی اساتذہ اور طلبہ کی یورش رہا کرتی تھی۔ اساتذہ اپنے اپنے شعبے یا اپنی اپنی تنخواہ و ترقی سے متعلق مسائل لے کر پہنچتے اور ان مسائل کے حل میں شادانی صاحب کی مدد کے طالب ہوتے۔ طلبہ عموماً امتحان کی تاریخ کے آگے بڑھانے کا مسئلہ لے کر آتے۔ آپ سبھی جانتے ہیں کہ اساتذہ سے نبٹنا اتنا دشوار نہیں جتنا طلبہ سے، خصوصاً اس دور کے طلبہ سے جو ہر وقت ہڑتال اور ہنگامے کے موڈ میں رہا کرتے ہیں اور جس سے ناراض ہو جاتے ہیں اس کا جیتے جی جنازہ تک نکال دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے جب کبھی شادانی صاحب کے آفس یا گھر پر طلبہ کے ہجوم کو آتے دیکھا تو گھبرا گیا کہ نہ جانے ان کی جلو میں کون سی آفت شادانی صاحب کے سر پر آنے والی ہے لیکن میں نے خود شادانی صاحب کو کبھی گھبراتے نہ دیکھا۔ طلبہ کا وفد نرم لہجے میں گفتگو کر رہا ہو یا گرم لہجے میں شادانی صاحب اطمینان و اعتماد کا دامن کبھی نہ چھوڑتے۔

ایک ایسے ہی موقع کا ذکر ہے میں شعبۂ اردو میں بیٹھا ہوا تھا۔ شادانی صاحب کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی موجود تھے۔ ٹفن کا گھنٹہ بجتے ہی تقریباً دس بارہ طلبہ کا گروہ شعبے میں در آیا اور کسی قدر بپھرے ہوئے انداز میں اپنی شکایت بیان کرنے لگا۔ ایک کا جملہ ختم ہوتے ہی دوسرا پہلے طالب علم کی تائید میں بولنا شروع کر دیتا۔ خلاصۂ فریاد یہ تھا کہ چونکہ نماز پڑھنے کا کمرہ طالبات کے کومن روم کے مقابل ہے اس لیے لڑکیوں کی چیں چیں میں سے نماز پڑھنے میں بڑی خلل اندازی ہوتی ہے۔ شادانی صاحب نے انھیں یقین دلایا کہ یا تو نماز کا کمرہ بدل دیا جائے گا یا طالبات کا کومن روم۔ اس کے بعد انھوں نے کہا اگر آپ لوگ ایک لطیفہ سنتے جائیں "ایک مرتبہ ایک شخص کسی میدان میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کے سامنے سے مجنوں کا گزر ہوا۔ نمازی جلدی سے نماز ختم کر کے مجنوں کو ملامت کرنے لگا کہ دیکھتا نہیں میں نماز پڑھ رہا ہوں اور تو میرے سامنے سے گزر گیا۔ اس پر مجنوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا میں تو اپنے مجازی محبوب (لیلیٰ) کے خیال میں اس قدر محو تھا کہ مجھے اپنے اردگرد کا احساس باقی نہ رہا۔ تعجب ہے کہ تجھے محبوب حقیقی کے حضور میں کھڑے ہونے کے باوجود میرے گزرنے کا احساس کیونکر ہوا۔ یہ لطیفہ سن کر تمام طلبہ کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جیسے وہ مذکورۂ بالا شکایت لے کر آنے پر شرمندہ بھی ہوں اور ایک بڑے

پتے کی بات سیکھ کر واپس جانے پر شادماں بھی۔

ملنے ملانے کے معاملے میں شادانی صاحب بڑے ارزاں اور سہل یاب ہیں جس کا جی چاہے اور جس وقت جی چاہے ان سے گھر پر یا یونیورسٹی جا کر مل لے چنانچہ اکثر ان کے یہاں طلبہ، اساتذہ، اجنبی اور احباب کا تانتا بندھا رہتا ہے جو انھیں اتنی مہلت بھی نہیں دیتے کہ وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے کوئی وقت مخصوص کر لیں۔ کبھی کبھی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ریڈیائی تقریر میں صرف ایک دن یا چند گھنٹے باقی رہ گئے اور تقریر تیار نہ ہو سکی۔ ایسے نازک مرحلوں پر میں نے انھیں اپنے پڑوسی ہادی صاحب (ڈھاکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار) کا کمرہ دو ایک گھنٹے کے لیے مستعار لیتے یا پھر دھان منڈی (شادانی صاحب کی قیام گاہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک علاقہ ہے جہاں وہ اپنا مکان بنوا رہے تھے۔) جا کر پناہ گزیں ہوتے پایا۔ ملاقاتیوں کے اس مسلسل حملے کی روک تھام کے لیے ایک مرتبہ انھوں نے "ملاقات کے اوقات" کی تختی برآمدے میں لگا دی لیکن اس تختی کا وہی حشر ہوا جو ہمارے یہاں بہت سے قوانین کا ہوا کرتا ہے یعنی لوگ اپنے چلن کو قانون بنا لیتے ہیں۔ قانون کو چلن نہیں بننے دیتے۔

جس طرح معمولی سے معمولی آدمی کے لیے شادانی صاحب تک رسائی مشکل نہیں، اسی طرح معمولی سے معمولی ادبی جلسوں اور مشاعروں میں انھیں شرکت یا صدارت پر آمادہ کر لینا بھی دشوار نہیں۔ ان کی یہ وسیع الاخلاقی بعض اوقات خود مجھ پر گراں گزرتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کاش وہ اس قدر ارزاں اور سہل یاب نہ ہوتے۔ ان کے جاننے والے اور ماننے والے معاشرتی، اقتصادی اور ادبی اعتبار سے کتنی ہی معمولی سطح کے لوگ کیوں نہ ہوں وہ حتی الامکان ان کی تالیف قلب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ میں نے انھیں ڈھاکہ کے ایسے ادیبوں اور شاعروں کی عیادت کے لیے جاتے دیکھا ہے جن کی ادبی شہرت اور اہمیت ڈھاکہ تک محدود ہے یا اتنی بھی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خوبی اور اس قسم کی خوبی ہر اچھے انسان میں ہونی چاہیے لیکن عام طور پر ان لوگوں میں کہاں ہوتی ہے جو شادانی صاحب کے مقام اور مرتبے کو پہنچ جاتے ہیں۔

شادانی صاحب دبلے پتلے نازک ساخت اور کمزور جسم کے آدمی ہیں اس کے باوجود ان میں نہ جسمانی ہمت کی کمی ہے اور نہ اخلاقی جرأت کی۔ لوگوں کو ان کی اخلاقی جرأت کا ثبوت ان کی تحریروں میں بھی ملتا رہا ہے اور ان کی تقریروں میں بھی۔ ان کے ادبی فیصلوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان فیصلوں میں جو اخلاقی جرأت پائی جاتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ انھیں اپنی اخلاقی جرأت کی بدولت کبھی جیل جانے یا سنگسار ہونے کی نوبت نہیں آئی مگر یہ کیا کم ہے کہ وہ اپنے برابر والوں اور اپنے سے

بڑوں کے درمیان ہوا کا رخ دیکھ کر بات نہیں کرتے بلکہ وہ سب کچھ کہہ گزرتے ہیں جو ان کے ضمیر کا تقاضا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر (ڈاکٹر محمود حسن) ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر پر آئے قدرتی طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے بعض معاملات کا ذکر چھڑ گیا اس سلسلے میں شادانی صاحب نے انھیں ایک واقعہ سنایا کہ جب یونیورسٹی کے فلاں پروفیسر نے ایگزی کیوٹو کونسل کے جلسے میں اپنے ایک رفیق کار کے متعلق کہا کہ وہ فلاں عہدے (غالباً ریڈرشپ یا سینیر لکچرشپ) کے لیے موزوں نہیں ہیں کیونکہ انھیں تعلیمی زندگی سے علیحدہ ہوئے بیس برس ہو گئے اس دوران میں وہ اپنا علم یقیناً بھول بھال گئے ہوں گے تو میں نے (شادانی صاحب) نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "اپنے ایک رفیق کار کے متعلق اس طرح اظہار خیال کرتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیئے" اس پر پروفیسر موصوف نے کہا "لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ایک حقیقت ہے"۔ جواب میں میں (شادانی صاحب) نے کہا" اگر یہ حقیقت ہے تو اس سے بدتر حقائق میں آپ کے متعلق جانتا ہوں"۔

ڈھاکہ میں برٹش کونسل سنٹر کی طرف سے آئے دن مختلف موضوعات پر مباحثے یا تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک مرتبہ وہاں "مشرقی پاکستان کی تہذیب کے نئے میلانات" کے عنوان سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے کئی پروفیسروں کی تقریریں ہوئیں جن میں شادانی صاحب بھی تھے۔ جلسہ صوبائی اسمبلی کے اسپیکر کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ تمام مقررین ایسے میلانات کا ذکر کر رہے تھے جن کا تعلق مشرقی پاکستان کی تہذیب سے اتنا نہ تھا جتنا مقررین کے تخیل سے۔ جب شادانی صاحب کی باری آئی تو انھوں نے اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تو مشرقی پاکستان کی تہذیب میں کوئی نیا میلان نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر اس میں کوئی نیا میلان ہے تو یہ ہے کہ اب پہلے کی بہ نسبت شراب زیادہ پی جاتی ہے، جوا زیادہ کھیلا جاتا ہے، گھوڑ دوڑ جو پہلے بند تھی اب جاری ہو گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں انھوں نے عوام سے لے کر خواص بلکہ حکومت کے حکام اعلیٰ تک کو رگڑ ڈالا۔ اور تو اور خود برٹش کونسل پر سخت نکتہ چینی کر گئے۔ ان کی اخلاقی جرأت کے اس مظاہرے سے سب لوگ دم بخود رہ گئے۔

اونچے طبقے کے لوگوں کی طرف سے جسمانی ہمت کا اظہار بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اکثر حالتوں میں پڑھے لکھے شائستہ اور مہذب لوگوں کی طرف سے جسمانی ہمت کا اظہار ایک بے تکی حرکت معلوم ہوتا ہے لیکن ضرورت پڑ جائے تو شادانی صاحب اس سے بھی باز نہیں آتے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی کار میں اپنی

لڑکی اور بھتیجی کے ساتھ نیو مارکیٹ ڈھاکے کا نیا بازار جو بانار سے زیادہ تفریح گاہ کی حیثیت رکھتا ہے) گئے۔ واپسی میں دونوں لڑکیاں پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ ڈرائیور اور شادانی صاحب اگلی سیٹ پر بیٹھے، جب کار چلنے لگی تو ایک آوارہ منش نوجوان نے جو کار کے سامنے سے گزر رہا تھا شادانی صاحب کی لڑکی کا ہاتھ چھو دیا۔ ان کی بھتیجی نے ان سے کہہ دیا۔ نوجوان کی اس حرکت پر شادانی صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ فوراً کار سے اتر پڑے اور تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے نوجوان کو پکڑ کر پیٹنا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے، جب وہ نوجوان خوب پٹ چکا تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کرکے دونوں کو الگ کر دیا۔ تماشائی اس نوجوان کو زجر و ملامت کرنے لگے اور شادانی صاحب کار میں بیٹھ کر گھر چلے آئے۔ نوجوان پر پٹنے کا اثر کیا ہوا یہ تو وہ جانے لیکن اسے پیٹنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ شادانی صاحب کا ایک ہاتھ کلائی کے قریب سوج گیا اور کئی روز تک اس میں تکلیف رہی۔

زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کے نہ صرف خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں بلکہ مزاج و میلان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ شادانی صاحب بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ میں نے اپنے گزشتہ دس گیارہ سالہ تعلقات کے دوران شادانی صاحب کو ہمیشہ معتدل مزاج پایا۔ لیکن غالباً وہ ہمیشہ ایسے ہی نہیں تھے۔ کبھی ان کی طبیعت میں تیزی و تندی بھی تھی اور خوب تھی، بعض اوقات اب بھی وہ تیزی و تندی اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ رسالہ "خاور" کی ادارت کے زمانے میں ایک دن چپراسی کی کوتاہیوں سے برہم ہو کر انھوں نے میرے دوست ارشد کاکوی کی موجودگی میں کہا تھا کہ افسوس ہے اب بوڑھا ہو گیا ہوں ورنہ اس شخص کو درخت سے باندھ کر بری طرح پیٹتا۔ اسی طرح جب کبھی وہ گھر کے ملازم یا دھوبی وغیرہ پر خفا ہوتے ہیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی مرمت کیے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ ایک مرتبہ ان کے باورچی نے انھیں پہلے سے اطلاع دیے بغیر یک بیک ملازمت چھوڑ کر ان کے یہاں سے جانا چاہا۔ اس پر وہ اس درجہ برہم ہوئے کہ میری اور ایک اور شخص کی موجودگی میں اسے مارنے کے لیے جوتا اٹھا لیا۔ ہم دونوں نے بیچ بچاؤ کرکے انھیں خاموش کیا۔ اسی طرح ایک دفعہ وہ اپنے گھر میں بے وقت ریڈیو بجائے جانے پر اس قدر غصے میں آئے کہ ریڈیو کو اٹھا کر پٹک دیا۔ وہ چکنا چور ہو کے رہ گیا۔ لیکن ہنگامی غیظ و غضب کے باوجود مزاج کے اعتبار سے ان کی زندگی کا موجودہ دور نرمی و ملائمت، ضبط و تحمل اور عفو و درگذر کا دور ہے۔

شادانی صاحب کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ اپنے شعر و ادب پر تنقید گوارا نہیں کرتے۔ میں نے انھیں تنقید گوارا کرتے ہی نہیں بلکہ عملی طور پر تسلیم کرتے بھی دیکھا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق (ڈھاکہ) کے جلسوں

میں اعتراضات کی بنا پر انھوں نے اکثر اپنے مضامین میں حذف و اضافہ سے کام لیا ہے اور جب کبھی میں نے یا ارشد کاکوی نے ان کے کسی شعر یا شعر کے کسی ٹکڑے سے بے اطمینانی ظاہر کی ہے تو انھوں نے اکثر اس شعر میں ترمیم کرلی ہے۔ وہ اپنے شعر و ادب کے معاملے میں نہ تو معترضین کی طرف سے اپنے کان بند رکھتے ہیں اور نہ خود اپنی آنکھیں۔ ایک دفعہ مجھ سے گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ آج میں یہاں وہاں سے "نشاطِ رفتہ" دیکھ رہا تھا تو مجھے پہلی مرتبہ کئی خامیوں کا احساس ہوا۔ وہ خامیاں زیادہ تر ابتدائی کلام میں ہیں مگر ان خامیوں تک میرے نقادوں کی نظر نہ پہنچ سکی، وہ تو میرے بے عیب شعروں میں عیب ڈھونڈتے رہ گئے۔

شادانی صاحب نے میری خواہش پر اپنی کتابوں کا ایک سٹ رسالہ نگار لکھنو کے پاس تبصرے کے لیے بھیجوا دیا تھا۔ نیاز صاحب نے نہایت ناموافقانہ اور غیر منصفانہ تبصرے لکھے جنھیں پڑھ کر شادانی صاحب کے ایک رفیق کار کو طیش آگیا اور انھوں نے کہا کہ میں ان تبصروں کا جواب لکھوں گا اور نیاز صاحب کو ایسا آڑے ہاتھوں لوں گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ اس پر شادانی صاحب نے کہا بیکار ہے، ایک چیز یاد رکھیے، میرے ایک دوست تھے بلا کے ذہین لیکن علم کے لحاظ سے صفر۔ ان کا ایک جملہ میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہے جب کبھی میں کسی سے بگڑتا تو کہتا "اچھا دیکھیں گے ہمارے ہاتھ میں قلم ہے"۔ اس پر وہ کہا کرتے "میاں اپنی تعمیر کی کوشش کرو دوسروں کی تخریب سے کیا فائدہ"۔

اپنی تعریف و تحسین میں اپنے شاگردوں اور مداحوں سے مضامین لکھوانا ادیبوں اور شاعروں کی ایسی کمزوری ہے جس سے بہت کم ادیب اور شاعر مبرا ہیں۔ میں ذاتی طور پر بعض ممتاز و مستند ادیبوں کی اس کمزوری سے واقف ہوں لیکن میں نے شادانی صاحب کی ذات میں اس کمزوری کا شائبہ تک نہیں پایا۔ ان کے شاگردوں اور مداحوں میں اچھے سے اچھے لکھنے والے موجود ہیں، ان میں سے بعض اس بات کے آرزومند بھی تھے کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھ ڈالیں لیکن شادانی صاحب نے ان کے اس خیال کی ہمت افزائی کبھی نہیں کی۔ میں جو ان کا ایک شاگرد ہونے کے باوجود ان سے ان پر یہ کتاب لکھنے کی رضامندی حاصل کرسکا تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ ان کی رضامندی کے باوجود اس[1] کتاب کے لیے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں مجھے ان کی طرف سے کتنے صبر آزما اور

---

[1] میرا ارادہ ان پر ایک کتاب لکھنے کا تھا۔ میں نے کئی ابواب مکمل بھی کر لیے تھے، یہ مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے لیکن بوجوہ اب یہ کتاب کبھی شائع نہ ہوگی (ن۔ ص)

ہمت شکن بلکہ دل شکن مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ وہ کسی سے اپنے اوپر لکھنے کی تمنا کیا معنی، لکھنے میں تعاون تک نہیں کرتے۔ ایران سے کئی مرتبہ فرمائشیں آئیں کہ اپنے حالاتِ زندگی اور اپنی تصانیف کے نام بھیج دیجیے تاکہ فلاں کتاب میں شامل کیے جا سکیں۔ لیکن ایسے نیازمندوں کی طرف ان کا رویہ ہمیشہ بے نیازی کا رہا۔ ہندوستان اور پاکستان میں اردو شعر و ادب کے بعض مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے ان سے بارہا حالاتِ زندگی اور کلام بھیجنے کی درخواست کی لیکن جواب میں وہی خاموشی اور بے نیازی جو یقیناً کسی پندار کا نتیجہ نہیں بلکہ نام و نمود کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کے پاس حالاتِ زندگی اور کلام سے متعلق جو فرمائشیں آئیں ان میں سے بعض کی تعمیل خود میں نے کی ہے۔

شادانی صاحب کی ذات اور زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر وہ فخر کر سکتے ہیں اور بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ وہ ذہین آدمی ہیں، منفرد شاعر ہیں، ممتاز محقق ہیں، اپنے رنگ کے واحد افسانہ نگار ہیں، اردو اور فارسی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں، انگریزی بولنے اور لکھنے پر قادر ہیں، تحریر و تقریر دونوں کے دھنی ہیں۔ بعض قابلِ فخر استادوں کے شاگرد اور بہت سی مشہور و ممتاز شخصیتوں کے استاد رہ چکے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں علم و ادب کے جتنے مشاہیر ہیں وہ سب کے سب شادانی صاحب کو محترم گردانتے ہیں۔ علمی مباحث اور ادبی مسائل میں ان کی رائیں وقعت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس وقت تک کئی یونیورسٹیوں کی طرف سے کتنے ہی پی، ایچ، ڈی کے مقالوں کے ممتحن رہ چکے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں اور کانفرنسوں میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت سے جب بھی ایران گئے تو وہاں اربابِ علم و ادب سے لے کر ارکانِ حکومت تک ان کی زباندانی اور بدیہہ گوئی سے محظوظ و متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن شادانی صاحب ان میں سے کسی بات پر فخر کرنا تو ایک طرف ان کا ذکر تک نہیں کرتے۔ ضمناً ذکر آ گیا تو آ گیا ورنہ وہ اپنی کارکردگی اور اپنے کارناموں کو اپنی گفتگو کا موضوع ہرگز نہیں بناتے۔ البتہ بعض اوقات کسی مسئلے کے متعلق اظہارِ خیال کرتے وقت یا اپنا کوئی تازہ شعر سناتے وقت تمہید کے طور پر اتنا ضرور کہتے ہیں کہ اس معاملے کا ایک پہلو ایسا ہے جو غالباً اب تک کسی کے ذہن میں نہیں آیا یا نہیں آیا ہوگا یا یہ کہ اس شعر میں جو خیال ادا کیا گیا ہے وہ شاید ہی کسی اور کے یہاں ہے۔ میرے ان کے درمیان جب ایسے مواقع آئے ہیں تو میں نے بعض اوقات ان کی تمہید سے اختلاف کی جرأت کی ہے لیکن انھوں نے کبھی میری اس جرأت کا برا نہیں مانا بلکہ بڑی خوش دلی کے ساتھ میرے خیال سے متفق ہو گئے۔

شعر گوئی کا تجربہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ شاعر کے ذہن میں کبھی ڈھلا ڈھلایا شعر آجاتا ہے اور کبھی صرف شاعرانہ خیال جسے شاعر کی ذہنی کاوشیں شعر کی شکل عطا کرنے میں کبھی کامیاب ہو جاتی ہیں اور کبھی ناکام رہ جاتی ہیں، چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ شادانی صاحب کے ذہن میں کوئی خوبصورت خیال آنکلا جو بعد میں کبھی شعر بنا اور کبھی نہ بن سکا۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے اپنے ایک ایسے ہی شعر کا نفس مضمون سنایا جو ابھی نہیں کہا گیا تھا بلکہ جو آج تک نہیں کہا گیا۔ نفس مضمون یہ تھا کہ انسان کو محبت میں مجبوریوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن دوسری چیزوں کو نہیں مثلاً چاند اور چکور، شمع اور پروانہ ان کی محبت میں کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ شادانی صاحب نے یہ نفس مضمون اسی تمہید کے ساتھ سنایا جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ میں نے کہا خیال خوبصورت تو ضرور ہے لیکن نادر ہرگز نہیں اس پر انھوں نے مجھ سے مثال چاہی میں نے جواب میں سیماب اکبرآبادی کا یہ شعر پڑھ دیا ؎

بھڑک اٹھی ہے کیوں دنیا مری ان کی محبت پر
یہ شورش کیوں خلاف شمع و پروانہ نہیں اٹھی

شعر سن کر فرمایا۔ ہاں خیال تو وہی ہے مگر پیرایۂ بیان خوبصورت نہیں لفظ بھڑکنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح ایک دن انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا ؎

ہوا یہ ہم کو نیا تجربہ محبت میں
کہ دل ہی اب نہیں لگتا کسی کی صحبت میں

اور کہا کہ اگرچہ بات سامنے کی ہے مگر اب تک کہی نہیں گئی میں نے کہا جرأت کا یہ مصرع آپ کے شعر سے بہت قریب ہے ؏ جی کہیں لگتا نہیں جب دل کہیں لگ جائے ہے۔ کہنے لگے ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ جرأت نے تو بالکل وہی بات کہہ دی۔

ڈھاکہ کے نوخیز ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تہذیب و تربیت میں یہاں کی ادبی انجمن حلقۂ ارباب ذوق کو اور حلقۂ ارباب ذوق کی افادیت اور اہمیت میں شادانی صاحب کے تعاون کو بڑا دخل رہا ہے۔ حلقے کا طریق کار یہ ہے کہ اس کے ہفتہ وار جلسے میں دو چیزیں پڑھی جاتی ہیں۔ ایک نثر میں دوسری نظم میں اور ان پر حاضرین کی طرف سے بڑی آزادی کے ساتھ اظہارِ خیال ہوتا ہے۔ اس بے لاگ بحث و تمحیص میں استادوں اور بزرگوں کے ساتھ بھی کسی قسم کی اور رعایت نہیں کی جاتی۔ چنانچہ حلقے کا یہ طریق کار

بزرگوں کے لیے بڑی حد تک ناقابل برداشت ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شادانی صاحب کے سوا باقی تمام بزرگانِ ادب بہت جلد حلقے سے کنارہ کش ہو گئے لیکن شادانی صاحب شروع سے لے کر اب تک حلقے سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی تحریروں کے ساتھ بھی حلقے والے وہی سلوک کرتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے لیکن انھوں نے کبھی اس کا برا نہیں مانا بلکہ بسا اوقات وہ حلقے میں کچھ پڑھتے وقت اس بات کی تاکید کرتے سنے گئے کہ ان کے مضمون یا نظم پر تنقید کرنے میں پاس خاطر سے ذرا بھی کام نہ لیا جائے۔ شادانی صاحب اپنی تحریروں پر حلقے والوں کی الٹی سیدھی تنقید صرف سننے اور سہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ جب کبھی اور جہاں کہیں اپنے آپ کو معترضین سے متفق پاتے ہیں وہاں اپنی تحریروں میں ردو بدل بھی کر لیتے ہیں، یہ اور بات کہ انھیں اس کی ضرورت شاذ و نادر ہی پیش آتی ہے ان کا قول ہے کہ کوئی شخص خواہ اس کا علم کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو اعتراضات سے بالاتر نہیں ہوتا۔ سیکھنے کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ یہ خیال اور اس قسم کا خیال شادانی صاحب کی عالی دماغی بلند ظرفی اور وسیع النظری پر دلالت کرتا ہے لیکن حلقے کو ان کی ذات سے صرف ان کی عالی دماغی، بلند ظرفی اور وسیع النظری کا ثبوت نہیں ملا ہے بلکہ مستقل فائدے بھی پہنچے بلکہ حلقہ ان کے بغیر جسد بے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ حلقے کے جلسوں میں شادانی صاحب کئی طرح کے فرائض انجام دیتے ہیں مثلاً اگر کسی مسئلے پر دو حضرات آمادۂ جنگ ہیں تو اس جنگ کی روک تھام شادانی صاحب کریں گے۔ اگر کسی مضمون یا نظم کے ساتھ اربابِ حلقہ ناانصافی کر رہے ہیں تو اس ناانصافی کی تلافی شادانی صاحب کریں گے۔ اگر کسی اچھے شعر کو غلط نقطۂ نظر سے برا شعر ثابت کیا جا رہا ہے تو اس غلط نقطۂ نظر کی تصحیح شادانی صاحب کریں گے۔ اگر کسی برے شعر کو برا کہنے کی صحیح وجہ نہیں بتائی جا رہی ہے تو وہ صحیح وجہ شادانی صاحب فراہم کریں گے۔ اگر کسی مضمون کے متعلق بہت کچھ کہنے کے باوجود بعض اہم پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو ان اہم پہلوؤں کی طرف شادانی صاحب توجہ دلائیں گے۔ اگر بحث کے دوران میں زبان و بیان کا کوئی پیچیدہ مسئلہ پیدا ہو جائے تو اس کا حل شادانی صاحب پر منحصر ہوگا۔ اگر عروض و قافیہ اور قواعد سے متعلق کوئی اعتراض کیا گیا ہے تو اس کی صحت یا عدم صحت کی تصدیق شادانی صاحب سے طلب کی جائے گی۔ اگر کوئی صاحب اپنے مافی الضمیر کو الجھے ہوئے انداز میں بیان کر کے حاضرین کو الجھا رہے ہیں تو ان کی گفتگو کے ماحصل کو سلجھے ہوئے انداز میں شادانی صاحب بیان کریں گے۔ اگر دو صاحب کسی فن پارے کی خوبی یا خامی کے بارے میں بالکل متضاد باتیں کہہ رہے ہیں تو دونوں کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے دونوں کو درمیانی راہ

اختیار کرنے کی ترغیب دینا شادانی صاحب کا کام ہوگا۔ غرض کہ حلقے میں ہر نازک موقع پر شادانی صاحب آڑے آتے ہیں، ان کی وجہ سے حلقے کی جنگ صلح میں اور تلخی شیرینی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

شادانی صاحب صحیح زبان لکھنے اور بولنے کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس پر اس حد تک قادر بھی کہ زبان وبیان کے معاملے میں ان کی تحریر وتقریر سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ زبان اور محاورے کی تحقیق ان کا محبوب مشغلہ رہی ہے لیکن زبان محاورے اور تلفظ کے معاملے میں حد درجہ محتاط ہونے کے باوجود وہ تند مزاج بالکل نہیں کسی کی زبان یا تلفظ میں بڑی سے بڑی غلطی دیکھ کر انہیں ذہنی کوفت جس قدر بھی ہوتی ہو لیکن اس کا اظہار الفاظ یا اشارے میں کبھی نہیں ہونے دیتے۔ میں نے انہیں غلط زبان بولنے والوں پر کبھی مسکراتے یا پیٹھ پیچھے تفریحاً مذاق اڑاتے بھی نہیں دیکھا۔ ان کا یہ ضبط وظرف اس لحاظ سے حیرت انگیز ہے کہ عموماً زبان کی غلطیوں کو وہ لوگ بھی معاف نہیں کرتے جو خود صحیح زبان بولنے پر پوری قدرت نہیں رکھتے۔

شادانی صاحب کا ذاتی کتب خانہ کتابوں کے باب میں ان کے ذوق اور سلیقے دونوں کا آئینہ دار ہے علم وادب کے معاملے میں وہ زندوں سے زیادہ مردوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، اسی لیے ان کے کتب خانے میں قدیم کا عنصر جدید سے زیادہ ہے۔ ان قدیم کتابوں میں اردو اور فارسی کے بعض بڑے نایاب نسخے بھی ہیں۔ شادانی صاحب ہمیشہ علمی نوادر کی ٹوہ میں رہا کرتے ہیں، اس سلسلے میں کباڑیوں کی دکانوں کا پھیرا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ کباڑیوں سے سودا چکانے میں بڑی سیاست سے کام لیتے ہیں، جو کتابیں جتنی نادر اور نایاب ہوتی ہیں انہیں بظاہر اتنی ہی بے دلی اور بے اعتنائی سے دیکھ کر رکھ دیتے ہیں تاکہ کباڑیے کو پتا نہ لگنے پائے کہ ان کتابوں کا کوئی قدردان آنکلا ہے پھر دو چار فالتو کتابیں چن کر کباڑیے سے دام پوچھتے ہیں، وہ دام بتانے سے پہلے ان نادر اور نایاب کتابوں کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہیے تو انھیں بھی دے دوں اس پر شادانی صاحب کچھ اس طرح منہ بنا کر رضامندی، اظہار کرتے ہیں جیسے مجھے ان کتابوں سے کیا لینا لیکن تم کہتے ہو تو خیر انھیں بھی لے لیتا ہوں۔ اس طرح شادانی صاحب کو بہت سی نادر ونایاب کتابیں بہت ہی سستے داموں ہاتھ لگ گئی ہیں۔ ان کے کتب خانے میں تھوڑی سی انگریزی کتابیں بھی ہیں لیکن سچ پوچھیے تو ان کا کتب خانہ عبارت ہے اردو اور فارسی کتابوں سے۔ ان کی دلچسپی اردو اور فارسی ادبیات پر ہی مرکوز رہی ہے۔ ان کے یہاں اردو اور فارسی کی کلاسیکل کتابوں کے علاوہ لغات کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے اگر آپ ان کے گھر پر کسی لفظ یا محاورے کے متعلق ان سے کوئی استفسار کریں تو پہلے وہ کوئی مختصر سا

جواب دیدیں گے۔ اس کے بعد اٹھ کر بیسیوں مرتبہ اپنے کمرے میں جائیں گے اور اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی کے مستند جدید و قدیم لغات ایک ایک کرکے لے آئیں گے اور آپ کے سامنے انبار لگا دیں گے۔ جب تک وہ زیر بحث لفظ یا محاورے کو مختلف لغات میں نہ دیکھ لیں گے اور آپ کو نہ دکھا دیں گے اس وقت تک انھیں تشفی نہ ہوگی، چاہے آپ کی تشفی ان کے مختصر جواب ہی سے کیوں نہ ہوگئی ہو۔ اس باب میں بعض اوقات میں نے ان کی سرگرمی کو اپنے اور دوسروں کے لیے صبر آزما بھی پایا ہے۔

شادانی صاحب کو رسالوں سے کوئی خاص دل چسپی نہیں، ان کے پاس بہت سے رسالے تحفۃً آتے رہتے ہیں، جو نہیں آتے انھیں منگاتے بھی نہیں۔ وہ رسالوں کو سرسری طور پر یہاں وہاں سے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کے یہاں پرچے محفوظ بھی نہیں رہتے لیکن محفوظ نہ رہنے کی ساری ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ ان کے یہاں کتابیں ضرور محفوظ رہتی ہیں کیونکہ وہ الماریوں میں رکھی جاتی ہیں اور الماریاں مقفل رہا کرتی ہیں۔ شادانی صاحب کتاب مانگنے والوں کو مایوس نہیں کرتے یا نہیں کر پاتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی بعض قیمتی اور نایاب کتابوں سے ہاتھ دھولینا پڑا ہے لیکن اس کے باوجود استفادہ کرنے والوں پر ان کے کتب خانے کا دروازہ کبھی بند نہیں رہا۔

شادانی صاحب کا مطالعہ نہایت وسیع بھی ہے اور نہایت محدود بھی۔ اردو اور فارسی کے ادب العالیہ، لغت، قواعد اور عروض وغیرہ پر وہ عالمانہ عبور اور محققانہ نظر رکھتے ہیں لیکن دنیا کے ادب العالیہ سے ان کی واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ خود اردو کے موجودہ ادب سے بھی کچھ زیادہ واقف نہیں، انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمنی، امریکی ادیبوں اور شاعروں میں سے انھوں نے کسی ایک کا بھی مکمل مطالعہ نہیں کیا ہے۔ وہ یورپ اور امریکہ کے ادب کی نئی تحریکوں، شاعری کے نئے تجربوں، تنقید کے نئے اسکولوں، افسانے، ڈرامے اور ناول کی نئی تکنیکوں اور فکر و فن کے نئے مسائل سے بڑی حد تک بے خبر ہیں، ان میں سے جتنی چیزیں موجودہ اردو ادب میں آچکی ہیں وہ ان سے بھی پوری طرح آگاہ نہیں۔ فلسفہ، نفسیات، عمرانیات اور مذہبیات جن کا موجودہ دور کے ادبیات سے بڑا گہرا تعلق ہے ان کی توجہ کو جذب نہ کرسکے لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود وہ ہر جگہ اپنے وزن و وقار کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں بلکہ بسا اوقات ان لوگوں سے زیادہ کامیاب رہے ہیں جن کا مطالعہ ان سے بدرجہا زیادہ وسیع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ

ان کا اکتسابی علم بہت محدود ہے لیکن ان میں فطری بصیرت ہرگز مفقود نہیں۔ قدرت نے انھیں وہ رس ذہن اور نکتہ رس طبیعت ودیعت کی ہے پھر یہ کہ وہ ذاتی غور و فکر سے جن نتائج تک پہنچے ہیں انھیں اس قدر خود اعتمادی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ سننے والا ان کے خیالات سے متفق نہ ہونے کے باوجود ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

مطالعہ اسی وقت مفید ثابت ہوتا ہے جب مطالعہ کرنے والے میں اخذ و استفادہ کا سلیقہ موجود ہو۔ شادانی صاحب کو مطالعے کا بے پایاں شوق نہ سہی لیکن مطالعے سے اخذ و استفادہ کا جیسا سلیقہ انھیں آتا ہے ویسا دوسروں میں کم پایا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے دوران سفر میں عزیز احمد کا ناول شبنم پڑھا جس کا مرکزی خیال ان کے نزدیک یہ ہے کہ جس طرح محبت مستقل وصال میں زندہ نہیں رہتی اسی طرح مسلسل فراق میں بھی زندہ نہیں رہتی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وصال میں محبت جلد فنا ہو جاتی ہے اور فراق میں اس کا خاتمہ بتدریج ہوتا ہے۔ اس خیال کو انھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں ادا کیا:

وصال مرگِ محبت ہے اور فراق میں بھی
سسک سسک کے محبت کا دم نکلتا ہے

اسی طرح ایک مرتبہ انھوں نے ایک جدید فرانسیسی ماہر نفسیات آندرے تری دوں کی مختصر مگر قابل قدر کتاب (PSYCHO - ANALYSIS AND LOVE) میں پڑھا کہ بھوک کی مانند محبت انسان کی بالکل غیر ارادی خواہش ہے۔ ہم کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں لیکن اپنے آپ کو محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ بالارادہ کسی سے محبت کر سکیں۔ کسی کو چاہنے اور نہ چاہنے میں انسان کے اختیار اور ارادے کو مطلق دخل نہیں۔ آندرے تری دوں کے اس نظریے سے شادانی صاحب نے جو نتیجہ اخذ کیا اس نے اس بے مثال شعر کی شکل اختیار کی:

دل جدھر جھکا، جھکا اور جہاں رکا، رکا
کوئی بے وفا نہیں، کوئی باوفا نہیں

ایک مرتبہ ایک انگریزی افسانہ ان کی نظر سے گزرا جس میں مصنف نے یہ دکھایا تھا کہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ناجائز تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی ذمہ داری ایسے حالات پر ہے جن میں کوئی بھی مرد یا عورت اس لغزش سے بچ نہیں سکتی۔ دونوں کے تعلقات کا نتیجہ ایک بچے کی پیدائش کی

صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ سماج ان دونوں کو نہایت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور انھیں سزا دینے کے درپے ہے اس پر دونوں صرف اس بات کی خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ ہمیں جو سزا چاہو دے لو لیکن پہلے ہماری روداد تو سن لو تاکہ تمھیں ہمارے گناہ کی مقدار (MAGNITUDE) کا صحیح اندازہ ہو جائے اس افسانے نے شادانی صاحب کے ذہن پر جو تاثر چھوڑا وہ اس بے پناہ شعر کی تخلیق کا باعث ہوا ؎

گناہ کا اپنے معترف ہوں یہ التجا ہے کہ پاکبازو
کرو مجھے سنگسار لیکن گناہ کی داستاں تو سن لو

شادانی صاحب کے مطالعے کے ان نتائج کو دیکھ کر مجھے بارہا خیال آیا کہ اگر انھیں دنیا کے ادب العالیہ سے گہری دل چسپی ہوتی تو اس دور میں اردو ادب اور اردو شاعری کو جتنا فائدہ ان سے پہنچتا اتنا شاید کسی اور سے نہ پہنچتا۔ جو لوگ یورپ اور امریکہ کے ادب سے مستفید ہو کر اردو ادب کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں مجھے ان کی ذہانت اور صلاحیت سے انکار نہیں لیکن بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ لوگ کچے مال کا کاروبار کر رہے ہیں۔

شادانی صاحب کے یہاں عام روش سے ہٹ کر چلنے، مروجہ طریقے سے بچ کر سوچنے اور اپنے موضوع پر غیر متوقع سمت سے حملہ کرنے کا جذبہ نمایاں ہے۔ اس جذبے کے زیر اثر بعض اوقات وہ ایسا طریق کار اختیار کرتے ہیں جو نہ صرف نیا ہوتا ہے بلکہ حیرت انگیز طور پر دل چسپ بھی۔ مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے "مخزن فوائد" از نکہت دہلوی کے متعلق ایک تحقیقی مضمون لکھا جس میں منجملہ اور باتوں کے یہ بتایا کہ اس لغت میں فلاں فلاں زبان کے اتنے الفاظ ہیں۔ اس بات پر قاضی عبدالودود جیسا محقق حیران کہ آخر شادانی صاحب کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی جب کہ کسی کتاب یا تذکرے میں اس کا ذکر نہیں۔ ان کے استفسار پر شادانی صاحب نے لکھ بھیجا کہ یہ بات کسی کتاب یا تذکرے سے نہیں بلکہ خود ان الفاظ کو گن لینے سے معلوم ہو گئی۔

ایک مرتبہ میں نے انھیں مسلسل کئی دن تک فرہنگ آصفیہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے پایا۔ ایک دن پوچھ بیٹھا کہ کیا دیکھ رہے ہیں تو مسکرا کے فرمایا جب دیکھتا ہوں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ لغت دیکھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اردو زبان میں کتنی وسعت ہے مثال کے طور پر انھوں نے ایک محاورہ اور اس کے معنی تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ میں یہ جواب سن کر اور

یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ شادانی صاحب کو زبان اور محاورے کی چھان بین کا جنون شروع سے ہے اس لیے ان کے فرہنگ آصفیہ دیکھنے پر زیادہ متجسس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسی زمانے میں شادانی صاحب کلیات انشا کا بھی مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے اس کا مقصد دریافت نہیں کیا۔ لیکن کئی روز بعد یہ بات کھلی کہ فرہنگ آصفیہ اور کلیات انشا کا مطالعہ ایک خاص سلسلے میں کیا جا رہا تھا۔ اس زمانے میں فراق کے متعلق میرا ایک مضمون "نگار" (لکھنؤ) میں شائع ہوا تھا جس میں ایک جگہ یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ اردو کی عشقیہ شاعری ہندو کلچر سے بڑی حد تک بے نیاز رہی۔ شادانی صاحب کو میری اس رائے سے اختلاف تھا اور وہ اس کی تردید میں مضمون لکھنا چاہتے تھے چنانچہ مواد کے لیے کئی لکھنوی شعرا کے دواوین کے علاوہ فرہنگ آصفیہ کی جلدوں کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کر گئے تاکہ انہیں ہندو کلچر سے متعلق اردو زبان کے الفاظ و محاورات اور ان کے ذریعے ہندوانہ رسم و رواج کا علم ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ شادانی صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ مذکورہ بالا موضوع پر اور جتنی بھی کتابیں دیکھتا لیکن فرہنگ آصفیہ سے ہرگز رجوع نہ کرتا۔ یہاں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس موضوع پر شادانی صاحب نے محنت تو بہت کی لیکن مضمون نہیں لکھا۔

اسی زمانے میں شادانی صاحب کو شیفتہ کی تنقید نگاری پر بھی لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اردو شعرا کے تذکروں میں شیفتہ کے تذکرہ "گلشن بیخار" کو تنقیدی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت دی گئی ہے اور شیفتہ کے متعلق بڑے نقاد ہونے کا دعویٰ کیا جاتا رہا ہے۔ شادانی صاحب نہ تو "گلشن بیخار" کی انتقادی حیثیت کے قائل ہیں اور نہ شیفتہ کی انتقادی صلاحیت کے۔ انھوں نے شیفتہ اور "گلشن بیخار" کے بارے میں اردو نقادوں کے دعووں کو غلط ثابت کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ انہیں کا حصہ تھا اور بس۔ شادانی صاحب نے دیکھا کہ شیفتہ کی انتقادی صلاحیت و اہمیت سے متعلق سارے دعوے بڑی حد تک غالب کے ان دو ایک شعروں پر مبنی ہیں جو شیفتہ کی سخن فہمی کی تعریف میں کہے گئے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے مقالے میں سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ غالب نے اپنے معاصرین کی تعریف میں جو کچھ کہا اور لکھا ہے وہ تنقیدی نقطۂ نظر سے ذرا بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے غالب کی نثر و نظم کے ہزاروں صفحات پڑھ کر غالب کی تعریفوں کے حد درجہ مبالغہ آمیز اور ذاتی غرض پر مبنی ہونے کی اتنی مثالیں بہم پہنچائی ہیں کہ ان کی موجودگی میں شادانی صاحب کی رائے سے اختلاف کرنا ممکن ہی نہیں۔ شیفتہ کے متعلق

اردو نقادوں کا دعویٰ یہ بھی رہا ہے کہ انھوں نے "گلشنِ بیخار" میں ہر شاعر کے متعلق اپنی رائے لکھی ہے۔ شادانی صاحب نے گن کر بتایا کہ شیفتہ نے ۶،۶ میں سے صرف ۶، شاعروں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور یہ رائے بھی بڑی حد تک اگلے تذکرہ نویسوں سے ماخوذ ہے۔

غالب نے انشائے ابوالفضل کے متعلق بڑی پست رائے کا اظہار کیا ہے حالانکہ غالب کا طرزِ انشا بڑی حد تک ابوالفضل ہی کا رہینِ منت ہے۔ شادانی صاحب نے غالب کے فارسی اسلوب پر ابوالفضل کے اثرات دریافت کرنے میں پانچ سال تک محنت کی جس کا ماحصل یہ ہے کہ غالب کے جملہ مخصوص الفاظ، فقرے اور ترکیبیں وغیرہ ابوالفضل کی دین ہیں۔ اس باب میں انھوں نے جس عرق ریزی اور جگر کاوی سے مواد فراہم کیا ہے وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے لیکن افسوس[1] کہ اس مواد نے ابھی تک مضمون کی شکل اختیار نہیں کی۔

میں نے فراق کی کتاب "اردو کی عشقیہ شاعری" شادانی صاحب سے لے کر پڑھی تھی اس میں سرورق کے بعد والے صفحے پر شادانی صاحب نے پنسل سے لکھ چھوڑا ہے کہ اس کتاب کے کن صفحات میں کن شعرا کے کتنے اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے اور ان شاعروں کے نقل کردہ اشعار کی مجموعی تعداد کیا ہے اس حساب کتاب کی بنا پر شادانی صاحب فراق کے بارے میں بڑے اعتماد سے کہا کرتے ہیں کہ وہ اپنے مضامین میں اپنی شاعری کا پروپیگنڈا خوب کرتے ہیں۔ یہ بات اور لوگ بھی کہا کرتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اتنی سی بات کے لیے دوسروں نے وہ زحمت گوارا نہ کی ہوگی جو شادانی صاحب نے اپنے لیے روا رکھی۔

شادانی صاحب بڑے ذہین آدمی ہیں لیکن انھوں نے اپنی ذہانت کو ریاضت کا بدل کبھی نہیں بننے دیا۔ جو کام جس قدر محنت چاہتا ہے اس پر وہ اتنی محنت ضرور صرف کرتے ہیں۔ جب کچھ لکھنا شروع کرتے ہیں تو دن کو دن سمجھتے ہیں نہ رات کو رات۔ فرصت کا ہر لمحہ اپنے موضوع سے متعلق کتابوں اور مقالوں کو پڑھنے، ان پر غور کرنے اور مضمون لکھنے کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ وہ کسی کام کو بیدلی سے جوں توں ختم کر کے رکھ دینے کے قائل نہیں۔ میں نے بعض اوقات انھیں بعض اَن پڑھ آدمیوں کے پاسپورٹ اور ویزا کا فارم

---

[1] اب یہ مضمون صحیفہ لاہور کے غالب نمبر حصہ اول میں آگیا ہے (ن۔ص)

بھرتے دیکھا ہے اور اس صبر و سکون اور احتیاط و انہماک کے ساتھ، جیسے یہ ناخوشگوار کام کسی غیر کا نہیں اپنا ہی ہے۔

جلد بازی اگر موجودہ زمانے کا مرض ہے تو شادانی صاحب موجودہ دور میں رہنے کے باوجود اس مرض سے ہمیشہ محفوظ رہے ہیں۔ کوئی موقع ہو، کوئی بات ہو، کوئی کام ہو میں نے کبھی انہیں عجلت سے کام لیتے ہوئے نہیں پایا۔ ان کاموں کی بات اور ہے جن کے لیے انہیں وقت بہت کم دیا گیا ہو یا مصروفیتوں کے باعث ان کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہو اور اس میں بھی کام کا سرانجام ناگزیر ہو۔ عام طور پر وہ ہر کام خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی اتنے اطمینان اور انہماک سے کرتے ہیں جیسے اسی کام کے لیے دنیا میں آئے ہیں اور اس کی تکمیل سے پہلے واپس جانے کا نہ امکان ہے نہ ارادہ۔ اس باب میں ان کی افتادِ طبیعت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض اوقات وہ کسی کام میں اتنی چھان بین اور اتنا اہتمام کرنے کی نیت باندھ لیتے ہیں کہ کام شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔

شادانی صاحب قلم برداشتہ لکھنے کے عادی نہیں، ان کے مسودے میں کاٹ چھانٹ بہت ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی وقت کی تنگی کے باعث ریڈیائی تقریر اس طرح لکھتے ہیں کہ اسے صاف کرنے کی ضرورت نہ پڑے اور مسودہ جوں کا توں ریڈیو آفس بھیج دیا جائے۔ لیکن ان کے ادبی مضامین کے مسودے ایڈیٹروں کے پاس بھیجنے کے لائق نہیں ہوتے، بیشتر اوقات اپنے مضمون کی نقل آپ کرتے ہیں۔ میں نے انھیں بارہا نجی خطوط کا بھی مسودہ کرتے دیکھا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایسے خطوط کا مکتوب الیہ کوئی بڑا ادیب یا شاعر ہو۔ عموماً جب وہ کسی کو طویل خط لکھتے ہیں تو خواہ اس خط کا مکتوب الیہ کوئی کم سواد پبلشر ہی کیوں نہ ہو پہلے اس کا مسودہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ طلبہ کو سرٹیفیکیٹ دیتے وقت پہلے اسے معمولی کاغذ پر شکستہ خط میں لکھ لیتے ہیں پھر اپنے شعبے کے پیڈ پر اسے نقل کر کے یا ٹائپ کر کے طالب علم کے حوالے کرتے ہیں

شادانی صاحب نہایت خوش خط واقع ہوئے ہیں، ان کا شکستہ خط (گھسیٹ) بھی صفائی اور حسن سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ ان کے دوست ذوالفقار علی بخاری (سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان) نے ان کے حسنِ خط کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا "کرنی ورمنٹ ہوئے تمہارا خط ملا۔ کیا معشوقانہ خط پایا ہے تم نے" پروفیسر حامد حسن قادری نے شادانی صاحب اور شاداں بلگرامی کے خط میں مشابہت پائی تھی۔ شادانی صاحب کو اپنے اور میرے خط میں مشابہت نظر آتی۔ ایک دن کہنے لگے۔ میرے تمہارے خط میں بڑی

مشابہت ہے۔ اگر میرے تمھارے خط کے نمونے ایا۔ ساتھ رکھ دیے جائیں تو بادی النظر میں شاید ہی کوئی ان کے فرق کو محسوس کر سکے۔ شادانی صاحب کی اس دریافت سے پہلے میرا ذہن اس مشابہت کی طرف منتقل نہ ہوا تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ ان کا خط میرے خط سے بہتر ہوتا ہے۔ یہ اعتراف ازراہ انکسار نہیں بلکہ بربنائے حقیقت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شادانی صاحب کے ایک مکتوب الیہ کو میرے خط پر شادانی صاحب کے خط کا دھوکا ہو چکا ہے۔ کئی سال پہلے شادانی صاحب کی آنکھ میں کچھ تکلیف پیدا ہو گئی تھی جو کافی عرصے تک رہی جس کی وجہ سے وہ لکھ سکتے تھے نہ پڑھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے مختلف لوگوں کے نام بہت سے خطوط مجھ سے لکھوائے۔ ایک دن اپنے ایک عزیز کے نام پوسٹ کارڈ لکھوا کر بھیجا اس سے پہلے کسی اور سے خط لکھوا کر بھیج چکے تھے جس میں آنکھ کی تکلیف کے باعث خود خط لکھنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ ان کے عزیز نے میرے ہاتھ کا لکھا ہوا خط پڑھ کر جواب میں لکھا کہ "آپ (شادانی صاحب) کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ خدا کرے آپ کی آنکھ کی تکلیف بالکل رفع ہو چکی ہو"۔ مجھے شادانی صاحب کے عزیز کی یہ خوشی دیکھ کر ان کی آنکھ کی صحت کے بارے میں شبہ پیدا ہو گیا۔

شادانی صاحب کا حافظہ کسی زمانے میں بہت مضبوط تھا اب اس (مضبوطی) کے آثار تو رہ گئے ہیں لیکن مضبوطی باقی نہیں رہی۔ یعنی انھیں جو کچھ یاد تھا اس میں سے بہت کچھ اب بھی یاد ہے لیکن اب جو کچھ وہ یاد رکھنا چاہتے ہیں انھیں یاد نہیں رہتا۔ لطائف اور اشعار انھیں آج بھی بہت یاد ہیں اور برمحل لطیفہ سنانے یا شعر پڑھ دینے کا ایسا ملکہ ہے کہ سننے والے حیران رہ جاتے ہیں اور اپنے دلوں میں انھیں غیر معمولی حافظے کا آدمی سمجھ بیٹھتے ہیں لیکن دوسری طرف ان کی یادداشت کا عالم یہ ہے کہ روزمرہ زندگی میں وہ کئی ضروری کام خواہ اپنے ہوں یا دوسروں کے بھول جانے کے باعث نہیں کر پاتے۔ اپنی موجودہ ملازمت یعنی لکچرر ہونے سے پہلے میں کچھ عرصے تک کیشیر کی حیثیت سے بھی ملازمت کر چکا ہوں۔ یہ ملازمت میرے لیے کس درجہ ناقابل برداشت تھی اس کا اندازہ اس بات سے کر لیجیے کہ میری زندگی کا ایک ڈیڑھ مہینہ جو اس ملازمت میں گزرا اسے میں آج تک اپنی زندگی میں شمار نہیں کر سکا ہوں۔ چنانچہ قدرتی طور پر میری خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اپنے آپ کو اس جانگسل ملازمت یا روح فرسا مصیبت سے نجات دلواؤں۔ اتفاق سے اس زمانے میں ایک مقامی کالج میں اردو لکچرر کی جگہ خالی تھی اور کالج کی مالی حالت کی بنا پر کچھ عرصے تک خالی رہنے والی تھی۔ میں نے شادانی صاحب سے کہا کہ کالج کے پرنسپل سے میری پیشگی سفارش کر دیجیے تاکہ جب تقرر کا وقت آئے تو میرا ہی تقرر ہو۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ آفس (ڈمین آفس)

جاکر پرنسپل سے فون (اس وقت تک شادانی صاحب کے گھر پر ٹیلیفون نہ تھا) پر بات کرلوں گا۔ لیکن ایک عرصے تک میری سفارش کرنا بھولتے رہے، جب میں شام کو ان کے یہاں یہ معلوم کرنے کے لیے جاتا کہ میری سفارش کی گئی یا نہیں تو کہتے "او آج بھی بھول گیا، اچھا کل ضرور کہہ دوں گا"۔ آخر کار میں نے سفارش کے لیے یاددہانی ترک کردی۔ اور تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ رہا۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد شادانی صاحب نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ آج اس کالج کے پرنسپل مجھ سے ملنے آئے تھے میں نے تمھاری سفارش کردی ہے انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وقت آنے پر تمھیں لے لیں گے۔ شادانی صاحب کی سفارش رائگاں نہ گئی اور پرنسپل صاحب کا وعدہ شرمندۂ ایفا ہوکر رہا۔

اگر بھولنا ایک بدسلوکی ہے تو یہ بدسلوکی وہ صرف دوسروں سے نہیں اپنے آپ سے بھی روا رکھتے ہیں۔ شادانی صاحب تقریباً تیس سال سے نزلے میں مبتلا ہیں۔ پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب ولایت گئے تھے تو وہاں کا تحفہ اس مرض کی شکل میں لیتے آئے تھے۔ دوسری مرتبہ جب سنہ ۱۹۵۶ء میں ولایت گئے اور نزلے کے علاج کے لیے وہاں کے ممتاز ڈاکٹروں سے رجوع کیا تو انھوں نے اس مرض کو لاعلاج قرار دیا۔ شادانی صاحب ولایت سے مایوس واپس آئے لیکن یہاں میری خواہش پر ایک مقامی ڈاکٹر سے جس کا میں بڑا معتقد ہوں علاج کرانے پر آمادہ ہو گئے، دو ڈھائی مہینے اس کے زیر علاج رہے لیکن اس کا کیا علاج کہ جو مرض ان کے لیے وبال جان بن کر رہ گیا ہے، اس کے معالجے میں ان کی باقاعدگی کا حال یہ تھا کہ دو روز کی دوا کئی روز میں ختم کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مرض مریض کے ساتھ رہ گیا بلکہ مرض کا ساتھ نہ چھوڑنے کی ذمہ داری بھی مریض پر رہ گئی۔

شادانی صاحب کے ساتھ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ کوئی چیز کے لیے اپنے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گئے اور وہاں جاکر بھول گئے کہ کس چیز کے لیے اس کمرے میں آئے ہیں۔ اتنا ہی سچا مگر اس سے زیادہ ناقابل یقین واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کسی سے ملنے کے لیے اپنے گھر سے عظیم پور کالونی گئے اور وہاں جاکر بھول گئے کہ کس سے ملنا ہے۔ مجبوراً رکشا والے (اس زمانے میں ان کے پاس کار نہ تھی) کو حکم دیا کہ نیل کھیت واپس لے چلو۔ اپنے حافظے کے ہاتھوں وہ کسی مشاعرے میں مشاعرے سے ایک روز قبل پہنچ گئے اور یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل اور اگزیکیوٹو کونسل کے بعض جلسوں میں جلسوں کے بعد۔ وہ اپنی آیندہ مصروفیات کو یاد رکھنے کے لیے ڈائری میں درج کرلیتے ہیں لیکن بعض اوقات انھیں ڈائری دیکھنا

ہی یاد نہیں رہتا۔ با ایں ہمہ انھیں از خود رفتہ یا حواس باختہ آدمی نہیں کہا جا سکتا، اُن کو دیکھ کر اور ان سے مل کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ہوش و حواس مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کی ایک پہچان یہ تصور کی جانے لگی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی باب میں ابنارمل ضرور ہوتے ہیں۔ یعنی کہیں نہ کہیں ان کی کوئی چول ضرور ڈھیلی ہوتی ہے مگر میں نے شادانی صاحب کو ہر جگہ ہر حال میں نارمل پایا۔ وہ اپنی خوبیوں اور کمزوریوں دونوں کے اعتبار سے نارمل واقع ہوئے ہیں۔ محبت ہو یا نفرت، غم ہو یا غصہ، مسرت ہو یا ملال امید ہو یا اندیشہ، غرض ہر معاملے میں ان کے یہاں تناسب اور توازن کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ ان کی شخصیت میں بے اعتدالی کے نقوش چاہے خفی ہوں یا جلی کہیں نظر نہیں آتے۔

شادانی صاحب میں ایک بات ایسی ہے جو خصوصاً ادیب اور شاعر قسم کے لوگوں میں شاذ و نادر پائی جاتی ہے، وہ یہ کہ شادانی صاحب نہ پان کھاتے ہیں، نہ شراب پیتے ہیں۔ نہ چائے کے عادی ہیں نہ سگریٹ کے شوقین، ان میں سے کسی چیز کی عادت انھیں کبھی نہیں رہی۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں شعر و ادب سے لطف اندوز ہونے تک کے لیے ان چیزوں کا استعمال ضروری خیال کیا جاتا ہو اگر بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ شادانی صاحب ان چیزوں کے بغیر شعر کیونکر کہہ لیتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن غالباً یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان چیزوں کے استعمال اور شعر و ادب کی تخلیق کے درمیان روایتی رشتہ جتنا بھی ہو بنیادی ربط کوئی نہیں۔

شادانی صاحب کو فلم دیکھنے سے دلچسپی ضرور ہے لیکن وہ اس کے بہت دلدادہ نہیں۔ اردو سے زیادہ انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں۔ اس ملک کے تقریباً تمام پڑھے لکھے معقول آدمی ایسا ہی کرتے ہیں اور جو ایسا نہیں کرتے ان میں میرا بھی شمار ہے۔ شادانی صاحب فلم دیکھنے سے زیادہ کرکٹ میچ سننے کے شائق ہیں۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں فٹ بال سے زیادہ کرکٹ ہی کھیلتے تھے، اب کرکٹ کھیلنے اور دیکھنے کی بجائے سننے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سننے سے دلچسپی ہے کہ دن دن بھر سنتے رہتے ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو جب پاکستانی ٹیم نے نیوزی لینڈ والوں کو ڈھاکے میں شکست دی تو شادانی صاحب کا دل خوشی کے مارے ناچ اٹھا، کہنے لگے پاکستانی کھلاڑیوں کو سونے کا ہار پہنانا چاہیے، سونے کا ہار

ان لوگوں نے پاکستان کے نام کو جتنا روشن کیا ہے اتنا کسی نے نہیں کیا۔ ہماری سفارت اور حکومت نے بھی نہیں۔ ریڈیو اناؤنسر نے جس جذباتی انداز میں پاکستانی ٹیم کی جیت کا اعلان کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت ضرور ہے مگر افسوس کہ اس محبت سے کام لینے والی لیڈرشپ موجود نہیں۔

شادانی صاحب کے رہنے سہنے کا اسلوب اور ان کی زندگی کا معیار وہی ہے جو ان کے رتبے کے آدمی کا ہونا چاہیے۔ کار، ٹیلیفون، ریڈیو، ریڈیوگرام، گراموفون، ٹیپ رکورڈر، ریفری جیریٹر غرض ان کے یہاں زندگی کے وہ سارے لوازم موجود ہیں جن کی وجہ سے آدمی اونچے طبقے کے افراد میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن ان کے بعض عقیدت مندوں اور شاگردوں ہی کا خیال ہے کہ شادانی صاحب نے ان لوازم کی فراہمی میں خاصی تاخیر سے کام لیا ہے جس کا سبب ان کی ضرورت سے زیادہ جزرسی اور کفایت شعاری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خرچ کے معاملے میں وہ اگر بخیل نہیں تو دریادل بھی نہیں۔ لیکن یہ بات کہہ کر میں ان کی کسی کمزوری کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔ دریادلی ممدوح کے حق میں اتنی اچھی ثابت نہیں ہوتی جتنی مداحوں کی لغت میں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دنیوی امور میں شادانی صاحب فن کار سے زیادہ دنیادار ہی نظر آتے ہیں۔ زندگی کی راہ میں بڑی احتیاط کے ساتھ قدم رکھتے ہیں۔ اپنے ایک ایک پیسے کی نگرانی اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے روپے اپنی نگرانی آپ کر سکیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ادنیٰ درجے کی چیزوں پر اکتفا کر لیتے ہوں گے۔ ان کی ضرورت اور ان کے ذوق کی ساری چیزیں ان کے حسن ذوق کی آئینہ دار ہوتی ہیں، البتہ نام و نمود یا شان و شوکت کے مظاہرے کے لیے خواہ مخواہ سخاوت یا ضیافت پر نہیں اتر پڑتے۔ شعبۂ فارسی و اردو کا صدر ہونے کے باوجود تقسیم بند کے کچھ عرصے بعد تک آنے جانے کے لیے سائکل ہی سے کام لیتے تھے۔ جب ہرنیا کے آپریشن کی بدولت سائکل کا استعمال ان کے لیے ممنوع ٹھہرا تو ایک مدت تک رکشا کے علاوہ بس پر بھی آتے جاتے رہے۔ آج سے کئی سال پہلے جب ان کے یہاں ٹیلیفون لگا تو ان کے شاگرد ارشد کاکوی نے مجھ سے ازراہ مذاق کہا تھا کہ 'شادانی صاحب کے یہاں ٹیلیفون اب لگا ہے حالانکہ اس کی ضرورت اور استطاعت پہلے سے موجود تھی۔ ضرورت تو تھیں ریفری جیریٹر اور کار کی بھی ہے جنھیں وہ اب تک بیکار سمجھ رہے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے زندگی اور زمانے کا سرد و گرم بہت

چکھا ہے پھر بھی کھانے پینے کی چیزوں کو ان کی نوعیت کے مطابق ٹھنڈا اور گرم کر کے نہ کھانا کھانے کے ساتھ زیادتی ہے خصوصاً جب کہ ایسا کرنے کی استطاعت موجود ہو۔" اب جب کہ وہ کار پر چلتے ہیں اور کھانے کو اس کی نوعیت کے مطابق رفری جیریٹر میں ٹھنڈا کر کے کھاتے ہیں تو ان کے بعض یونیورسٹی کے دوستوں کو اصرار ہے کہ وہ اپنے موجودہ مکان کو چھوڑ کر یونیورسٹی کے بنوائے ہوئے کسی نئے بنگلے میں آجائیں اور اپنے پرانے طرز کے فرنیچر اور کتابی الماریوں کو فروخت کر کے گھر کو آرائش و زیبائش کے جدید سامانوں سے آراستہ کریں لیکن شادانی صاحب " ماڈرن" سے " الٹرا ماڈرن" بننے کے لیے تیار نہیں جب کہ اس میں خرچ بھی زیادہ پڑتا ہو۔

شادانی صاحب کی زندگی میں امراض اور حوادث کو بڑا دخل رہا ہے۔ وہ مریض پیدا ہوئے اور زندگی میں کئی بار سخت بیماریاں اٹھا چکے ہیں۔ دو مرتبہ آپریشن سے بھی دوچار ہو چکے ہیں۔ ایک دفعہ ہرنیا کے سلسلے میں آپریشن کرنا پڑا۔ دوسری مرتبہ ایک غدود کا پیٹھ میں آپریشن۔ گزشتہ تیس برس سے نزلہ ایسا دامن گیر ہے جو غالباً ان کے دم کے ساتھ رہے گا۔ اس کی وجہ سے آئے دن بغیر کسی نوٹس کے ان کی طبیعت ناساز ہو جاتی ہے، بے طرح چھینکیں آنے لگتی ہیں، بخار آجاتا ہے، سر میں شدید درد پیدا ہو جاتا ہے اور ناک سے ریزش کا سلسلہ ہر دس منٹ پر ایک رومال بھگو کر رکھ دیتا ہے۔ نزلے کے حملے کا اثر انھیں کسی کام کے قابل نہیں چھوڑتا۔ بعض اوقات اپنے گھر پر بھی ملاقاتیوں سے ملنا ان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ لیکن صحت کی اس مسلسل خرابی اور پیرانہ سری کے باوجود وہ دیکھنے میں مریض یا مضمحل نہیں معلوم ہوتے بلکہ جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے چست و تندرست اور شگفتہ و شاداب نظر آتے ہیں۔

شادانی صاحب کئی بار جان لیوا حادثوں سے بال بال بچے ہیں۔ ایک مرتبہ لڑکپن میں جب کہ دس بارہ سال کی عمر تھی، سنبھل میں ایک تالاب کے جزیرہ نما حصے پر بیٹھ کر مچھلی مار رہے تھے، تفریحاً تالاب میں دو ایک طرف پاؤں ڈالا تو گھٹنے بھر پانی پایا۔ تیسری سمت جو پاؤں ڈالا تو بالکل ڈوب گئے۔ جیسے ہی ڈوبے کسی نے فوراً غوطہ لگا کر انھیں کھینچ نکالا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جہاں ڈوبے تھے وہاں پانی کے نیچے کنواں تھا۔ گویا کنواں تالاب میں ڈوبا ہوا تھا اور شادانی صاحب کنوئیں میں ڈوبے۔ ڈیرہ دون میں ایک مرتبہ تانگے پر بیٹھے کہیں جا رہے تھے موٹر سے تصادم ہو گیا۔ سخت چوٹ آئی۔ آج تک

انگلیاں ٹیڑھی نظر آتی ہیں اور تالو پر جو سلائی ہوئی تھی اس کا نشان بھی موجود ہے۔ ایک مرتبہ ٹرین میں سفر کر رہے تھے، ٹرین کسی پہاڑی مقام سے گزر رہی تھی پٹری کے دونوں طرف بہت گہرا غار تھا۔ ٹرین پٹری سے اتر گئی۔ لیکن خدا کا شکر کہ گری نہیں۔ جنوری ۱۹۵۷ء کی بات ہے "نکڑ" کے عنوان سے ایک سچی کہانی مکمل کر لے دن کے دو بجے گھر سے یونیورسٹی آ رہے تھے کہ انجینئرنگ کالج کے سامنے ایک جیپ ان کی رکشا سے ٹکرا گئی۔ کولھے اور بائیں پیر میں معمولی چوٹ لگی، وہ رکشا کے جس جانب گرے تھے اگر اس کی دوسری طرف گرتے تو اس حادثے کے ٹریجڈی بننے میں کوئی کسر باقی نہ رہتی۔ مئی ۱۹۵۸ء میں جب لیڈر ایکس چینج پروگرام کے ماتحت امریکہ کا سفر کر رہے تھے انھوں نے میرے نام اپنے ایک خط میں لکھا۔" امریکہ کے دوران قیام میں چھوٹے چھوٹے حادثے تو کئی پیش آئے لیکن رات تو بس خیری ہو گئی۔ سڑک پار کر رہا تھا، دونوں طرف سے کاریں آ جا رہی تھیں اس لیے دوڑ کر چلا۔ سڑک میں ذرا نشیب تھا۔ پاؤں پھسل گیا اور بری طرح گرا۔ اتنے میں ایک کار بڑی تیز رفتار سے سر پر آ گئی، میں اٹھ کر تیزی سے بھاگا اور جان بچ گئی۔ اپنے کمرے میں آکر اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ کئی جگہ چوٹ لگی ہے۔ دونوں گھٹنے زخمی ہوئے، بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں لہولہان، دونوں ہاتھوں کی گدیاں بری طرح چھل گئیں اور نیل پڑ گئے۔ بائیں شانے میں زور کا جھٹکا آیا جس کی وجہ سے بہت درد ہے، رات بھر سو نہ سکا، مالی نقصان بھی خاصا ہو گیا۔ نیا سوٹ پہنے ہوئے تھا جو بہت قیمتی تھا۔ پتلون میں گھٹنے پر سوراخ ہو گئے گھڑی کی BAND پارہ پارہ ہو گئی جس وقت میں گرا ہوں عینک میرے ہاتھ میں تھی خدا جانے کس طرح صحیح سالم بچ گئی۔ بہر حال 'دلے بخیر گذشت' والا معاملہ ہوا۔"

ذاتی ملاقات ہو، ادبی محفلیں ہوں، تعلیمی یا ثقافتی کانفرنسیں ہوں شادانی صاحب کسی موقع پر کسی شخصیت سے چاہے اس کی شہرت اور عظمت کتنی ہی کیوں نہ ہو مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں۔ بڑے سے بڑے آدمی سے کسی مسئلے میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اس کے اظہار میں اسی بیباکی اور خود اعتمادی سے کام لیں گے جو چھوٹوں سے بات یا بحث کرتے وقت بڑی آسانی کے ساتھ روا رکھی جاتی ہے۔ وہ کسی کی بڑائی اور بزرگی صرف اس بنا پر تسلیم نہ کریں گے کہ ایک دنیا اسے تسلیم کرتی ہے، کسی یگانۂ روزگار کے قول سے صرف اس لیے اتفاق نہ کریں گے کہ وہ کسی یگانۂ روزگار کا قول ہے۔ ان کے نزدیک قول کی صحت اور صداقت سب کچھ ہے قائل کی عظمت اور اہمیت کچھ بھی نہیں۔ لیکن

جہاں وہ بڑوں سے مرعوب نہیں ہوتے وہاں چھوٹوں سے جائز طور پر متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہتے
۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ رسالہ نقوش لاہور کا کوئی تازہ شمارہ آیا ہوا تھا۔ شادانی صاحب چونکہ موجودہ لکھنے
والوں کو بہت کم پڑھتے ہیں اس لیے ایک دن انھیں خیال آیا کہ ذرا دور حاضر کے بعض ممتاز افسانہ نگاروں
کو پڑھ کر دیکھا جائے کہ ان کے یہاں موضوع اور تکنیک کی کون سی ندرتیں کارفرما ہیں۔ چنانچہ "نقوش"
میں کئی ممتاز لکھنے والوں کے افسانے پڑھ گئے۔ ایک دن شام کو مجھ سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے: "مجھے
تو ان مشہور افسانہ نگاروں کے افسانوں میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ البتہ آج "الحمرا" (لاہور) میں
ایک بالکل گمنام افسانہ نگار (افسوس کہ مجھے اس کا نام اور اس کے افسانے کا عنوان یاد نہیں رہا) کا ایک
افسانہ بہت پسند آیا۔ موضوع تو معمولی ہی ہے لیکن اس نے بڑے فن کارانہ انداز میں لکھا ہے اسی طرح
"نیرنگ خیال" لاہور کے تازہ شمارے میں اماس رؤف کا مزاحیہ مضمون "اونٹ" بے حد پسند آیا۔ میں نے
افسانہ اور مضمون دونوں کی تعریف میں ایڈیٹروں کے نام خط لکھے ہیں اور دونوں کے پتے مانگے ہیں۔" مجھے
شادانی صاحب کے خط لکھنے پر بڑی حیرت ہوئی۔ خصوصاً اس لیے کہ وہ نئے لکھنے والوں کو پڑھنے
تک کی زحمت گوارا نہیں کرتے، ان کی تعریف میں ان کو یا ایڈیٹروں کو خط لکھنا تو بڑی بات ہے۔

شادانی صاحب کی شاعری اور سچی کہانیوں سے جو شخصیت برآمد ہوتی ہے وہ نفسیات کی اصطلاح
میں سرتاسر "دروں بیں" ہے۔ ان کی شاعری میں معاصرانہ حالات کی تصویر یا ترجمانی کہیں نہیں
ملتی۔ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس کائنات کے اندر سانس لے رہے ہیں اس سے انھیں
کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ وہ تو اپنی کائنات آپ ہیں۔ اسی طرح ان کی سچی کہانیاں بھی زندگی کے
داخلی پہلو ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں میں بھی لکھنے والا زندگی کے خارجی مسائل اور معاملات سے
دلچسپی لیتا نظر نہیں آتا۔ لیکن جیسا کہ خود ماہرین نفسیات نے تسلیم کیا ہے کوئی انسانی شخصیت نہ تو
سرتاسر "دروں بیں" ہوتی ہے اور نہ یکسر "بیروں بیں"۔ داخلی شخصیتوں میں کسی نہ کسی
حد تک خارجیت پسندی بھی ہوتی ہے اور خارجی شخصیتوں میں کسی نہ کسی حد تک
داخلیت پسندی بھی۔ شادانی صاحب بنیادی اور مجموعی طور پر ہیں تو داخلی ہی شخصیت
لیکن وہ اتنے شدید داخلیت پسند ہرگز نہیں کہ دوسروں کے کام بالکل
نہ آسکیں۔ اگرچہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو لوگوں سے ان کے دکھ درد کا حال پوچھ پوچھ

کر ان کے دکھ درد میں شریک ہو جاتے ہیں یا کسی کی امداد کے معاملے میں اپنی آخری پونجی تک نذر کر دینے میں تامل نہیں کرتے (دنیا میں ایسے ہوتے ہی کتنے ہیں؟) لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر شادانی صاحب کی سعی وسفارش سے کسی کی مقصد برآری ہو سکتی ہے تو وہ اس سے دریغ نہیں کرتے۔ میں نے بعض اوقات نہایت معمولی آدمیوں کی سفارش کے لیے انہیں اپنی مصروفیات کے باوجود ان لوگوں کے پاس جاتے دیکھا ہے جن سے غرض مندوں کی غرض وابستہ تھی۔

امداد واعانت کے معاملے میں ان کی سیرت کا ایک پہلو ایسا ہے جو اب تک میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ جب کوئی شخص اپنوں میں سے کسی کو ملول یا مغموم دیکھتا ہے تو عموماً چاہے وہ اس کے ملال ومصیبت کو دور کرنے کی نیت یا صلاحیت رکھتا ہو یا نہیں لیکن وہ اس کے ملال ومصیبت کی روداد ضرور سننا چاہتا ہے، اس کے برعکس شادانی صاحب کسی کے ملال ومصیبت کو دور کرنے کی کوشش کے باوجود ملال ومصیبت کی نوعیت اور تفصیل معلوم کرنے کی خواہش یا کوشش نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں فرمانے لگے: "دیکھو ایک بات یاد رکھو آں حضرتؐ کسی مصیبت زدہ کی امداد کرنے کے باوجود اس کی مصیبت کا حال دریافت نہیں فرماتے تھے۔ کسی نے ان کے اس طرز عمل کی وجہ پوچھی تو جواب دیا کہ ممکن ہے مصیبت کا بیان مصیبت زدہ کے لیے باعث شرم ہو لہٰذا مصیبت زدوں سے ان کے مصائب کی تفصیل نہیں پوچھنی چاہیئے۔ اس قول کے علاوہ ایک بات اور ہے جس کی وجہ سے میں (شادانی صاحب) کسی کی تکلیف اور پریشانی کا حال دریافت نہیں کرتا۔ وہ یہ کہ فرض کر لو میں کسی تکلیف اور پریشانی کا حال جاننے کے بعد امداد کرنے سے معذور ہوں۔ ایسی صورت میں مجھے اس خیال سے تکلیف ہوگی کہ میں فلاں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور مصیبت زدہ شخص کو اس خیال سے رنج ہوگا کہ میں اس کی مصیبت کو جاننے کے باوجود اس کے لیے کچھ نہیں کرتا۔" غالباً اسی صورت حال سے بچنے کے لیے شادانی صاحب کسی کے ذاتی معاملات ومسائل سے دلچسپی نہیں لیتے لیکن جب کوئی اپنے معاملات ومسائل میں ان کی مدد کا طالب ہوتا ہے تو وہ حتی المقدور اس سے دریغ بھی نہیں کرتے۔

شعر کی خوبی اور خامی کو پرکھنے میں شادانی صاحب کو جو بصیرت اور مہارت حاصل ہے، اس کے پیش نظر انہیں اچھے سے اچھا شعر سناتے ہوئے خواہ وہ اپنا ہو یا کسی اور کا میرے دل میں یہ خوف

ضرور کارفرما رہا ہے کہ نہ جانے یہ شعر ان کی نظر سے صحیح سلامت بچ سکے گا یا نہیں۔ لبا اوقات ان کی تنقید کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ شعر (اگر اپنا ہے) ضائع کر دوں اور اپنی پسند کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بہر حال سینے سے لگائے رکھوں۔ مجھے شعر گوئی کی دقتوں کا اندازہ شعر کہتے وقت اتنا کبھی نہ ہوا جتنا شعر پر شادانی صاحب کے عمل جراحی کو دیکھ کر۔ اگر شعر میں کوئی باریک سے باریک اور خفی سے خفی کوتاہی یا کمی ہے تو شادانی صاحب سنتے ہی جبلی طور پر کہہ دیں گے اس میں کہیں نہ کہیں کوئی کسر ضرور ہے، پھر سوچیں گے اور تھوڑی ہی دیر میں بتا دیں گے کہ اس میں یہ کسر ہے۔ آج سے کئی سال پہلے ایک مقامی انگریزی رسالے کے ایڈیٹر نے مجھ سے فرمائش کی کہ شادانی صاحب سے اردو کی چند اچھی جدید نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے دیجیے۔ اس زمانے میں میں بی اے کا طالب علم تھا۔ ترجمے کے لیے جو نظمیں میں نے انتخاب کیں، ان میں ساحر لدھیانوی کی نظم "تاج محل" بھی تھی۔ سب سے پہلے اسی کو لے کر شادانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شادانی صاحب نے اس کا ترجمہ کرنے کی بجائے اس پر ایسی تنقید شروع کی کہ نہ صرف وہ نظم میری نظر سے گر گئی بلکہ خود میں اپنی نظر سے گر گیا۔ اس وقت اس نظم پر ان کے سارے اعتراضات یاد نہیں صرف اتنا یاد ہے کہ انھوں نے نہ صرف نفس موضوع کے اعتبار سے بلکہ ہیئت کے لحاظ سے بھی اس نظم کو ناقص قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کی ہیئت میں کوئی نظام ORDER نہیں ہے۔ قافیوں کے استعمال میں خوش آہنگی کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ مثلاً ایک شعر ہے ؎

کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے ان کے جذبے
. . . . اپنی ہی طرح مفلس تھے

"اپنی ہی طرح مفلس" پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ پنجابی طرز بیان ہے۔ "اپنی" کی جگہ "ہماری" ہونا چاہیے تھا۔ اس نظم کا ایک مصرع ہے . . . . تشہیر وفا۔ اس پر فرمایا کہ لفظ تشہیر کا استعمال بے محل ہے۔ ع . . . . مقابر رہے بے نام و نمود۔ اس مصرع پر اعتراض کرتے ہوئے کہ غریبوں کے 'مقابر' کہاں سے آئے غریبوں کی قبریں ہوتی ہیں نہ کہ مقابر۔

ایک مرتبہ شوکت سبزواری صاحب اور میں دونوں ان کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ شادانی صاحب رسالہ "آج کل" دہلی کے ایک خاص شمارے کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ وحشت کلکتوی

کی غزل پر نظر ٹھہر گئی۔ ان کا مطلع تھا ؎

خدا کرے یہ مصیبت نہ ہو کسی کے لیے
کہ موت کا سا ہے رنج زندگی کے لیے

شادانی صاحب نے یہ شعر ہم لوگوں کو سناتے ہوئے کہا: "کا سا ہے" نے مصرع کو غارت کر دیا۔ شوکت صاحب نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا "واقعی"۔ اسی غزل کا دوسرا شعر تھا:

ہے کام تجھ کو جو کرنا تجھی کو کرنا ہے
کسے پڑی ہے کہ کوشش کرے کسی کے لیے

شادانی صاحب نے یہ شعر پڑھتے ہی فرمایا: پہلا مصرع یوں بہتر ہو سکتا تھا:
ارباب نظر مانیں گے کہ ترمیم نے شعر کو بہتر بنا دیا۔ اسی غزل کا ایک اور شعر تھا:

فریب خوردۂ عیش جہاں کا ہے یہ حال
کہ روئے عمر بھر اک لحظہ کی ہنسی کے لیے

شعر سنتے ہی شوکت صاحب نے فرمایا کہ دوسرے مصرعے میں 'کہ روئے' کی جگہ 'کہ رویا' بھی تو ہو سکتا تھا۔ شادانی صاحب نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ "فریب خوردۂ عیش" کے اعتبار سے 'کہ رویا' ہی لکھنا چاہیے تھا اگرچہ "فریب خوردۂ عیش" سے ان کی مراد ان تمام لوگوں سے ہے جو فریب خوردۂ عیش ہیں۔ لیکن اس ترکیب سے جمع کا صیغہ نہیں نکلتا۔

زبان، محاورات، شاعری، عروض ان سب میں استادانہ دستگاہ رکھنے کے باوجود انھیں استاد سخن بننے اور شاگرد پالنے کا شوق کبھی نہیں رہا۔ جو لوگ خود اپنے شوق سے ان کے شاگرد بن جاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ انھیں کسی کے کلام پر اصلاح دینے سے کتنی دلچسپی ہے۔ اگر کوئی شاعر ان کے یہاں جاکر انھیں تنہا پاکر اپنے کلام پر اصلاح لے لے تو لے لے ورنہ اس کلام پر ان کی اصلاح ممکن نہیں جو اسی غرض سے ان کے پاس چھوڑ دیا گیا ہو۔ ان کے شاگرد کتنے ہی جوہر قابل کیوں نہ ہوں وہ ان کی ذہنی تربیت پر ریاضت کے عادی نہیں۔ وہ اپنے شاگردوں میں شعر و ادب کے ذوق کو بارآور ہوتے دیکھ کر خوش ضرور ہوتے ہیں، ان کی شعری اور ادبی کاوشوں کو سراہتے بھی ہیں لیکن اپنے شاگردوں کے ذہن و ذوق کی تعمیر میں عملی طور پر معاون نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ

شوق اور صلاحیت رکھنے والے ان سے مل کر ان کی صحبتوں میں بیٹھ کر ان سے سیکھتے بہت کچھ ہیں اگرچہ وہ سکھاتے کچھ بھی نہیں۔

جس زمانے میں میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا شادانی صاحب ایک تو صدر شعبہ ہونے کی وجہ سے دوسرے ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس ہونے کے باعث کلاس بہت کم لیتے تھے۔ پھر بھی مجھے ایم اے میں ان سے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایم اے کے پہلے سال میں انھوں نے ہم لوگوں کو مومن پڑھایا تھا اور دوسرے سال میں اقبال۔ مجھے ان کے پڑھانے کا انداز پسند آیا نہ ایم اے کے لیے مناسب معلوم ہوا۔ مومن ہوں یا اقبال وہ لفظی تشریح سے آگے نہیں بڑھتے۔ غالباً آگے بڑھ بھی نہیں سکتے۔ ان کا علم حد درجہ محدود ہے۔ بنیادی طور پر وہ اردو اور فارسی ادب کے آدمی ہیں لیکن اردو اور فارسی ادب کے معاملے میں بھی ان کی دلچسپیاں زبان، محاورات، قواعد اور عروض تک محدود ہیں بقول نے ادب کے کسی حصے کا بھی تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ وہ کسی ادیب یا شاعر کی بنیادی اور امتیازی خصوصیات پر لکچر دینے سے ہمیشہ احتراز کرتے ہیں نثر نگاروں سے ان کی دلچسپی اور بھی کم ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی کلاس میں کسی نثر نگار کا درس اپنے ذمے نہیں لیتے۔ اس معاملے میں جہاں انھیں اردو کے جدید ادب سے تو کوئی لگاؤ نہیں وہاں انھوں نے اردو کے قدیم ادب کا بھی کوئی خاص مطالعہ نہیں کیا۔ ایک یونیورسٹی پروفیسر کی حیثیت سے ان کا معلمانہ کردار صد درجہ غیر اطمینان بخش ہے۔

لیکن معلم کی حیثیت سے شادانی صاحب کی ایک خوبی ایسی ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے وہ یہ کہ جو بات انھیں معلوم نہ ہوتی یا اگر کسی شعر کا مطلب سمجھنے میں انھیں الجھن ہوتی تو اس کے اعتراف و اظہار میں ذرا بھی تامل نہ کرتے۔ اپنی لاعلمی کو چھپانا ان کی فطرت کے منافی ہے جس کا ثبوت کلاس سے باہر بھی ملتا رہا ہے نہ صرف مجھے بلکہ دوسروں کو بھی۔

آج سے کئی سال پہلے شعبۂ اردو کے لیے ایک ریڈر کے تقرر کا مسئلہ درپیش تھا امیدواروں میں قاضی عبدالودود، مجنوں گورکھپوری، طاہر فاروقی اور شوکت سبزواری تھے۔ تقرر کرنے والی کمیٹی منجملہ اور لوگوں کے ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زبیر صدیقی (صدر شعبۂ عربی کلکتہ یونیورسٹی) فضل احمد کریم فضلی (اس زمانے میں حکومت مشرقی پاکستان کے محکمۂ تعلیمات کے سکریٹری تھے) اور شادانی صاحب

پر مشتمل تھی۔ اس معاملے میں ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زبیر صدیقی کے اختلافات نے ایسی صورت اختیار کی کہ آخر کسی کا تقرر نہ ہوسکا۔ ایک سال بعد دوسری کمیٹی بنائی گئی اور امیدواروں کے نام کمیٹی کے بیرونی ارکان (جن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور سید سلیمان ندوی بھی تھے) کے پاس بھیج دیے گئے۔ دوسرے سال کے امیدواروں میں صرف تین شخص تھے۔ مجنوں گورکھپوری، شوکت سبزواری اور طاہر فاروقی۔ اس زمانے میں شادانی صاحب سے جب کبھی میں نے یا کسی اور نے پوچھا کہ ریڈر شپ کے امیدواروں میں کس کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے تو انھوں نے یہی کہا کہ میں نے طے کرلیا ہے کہ میں کسی کی طرفداری نہیں کروں گا، کمیٹی والے جس کو منتخب کرلیں۔ مجھے تو ایک ریڈر چاہیے اور بس۔ ممکن ہے انھوں نے کسی امیدوار کی طرفداری نہ کی ہو لیکن ان کی گفتگو سے کبھی کبھار اتنا یقیناً ظاہر ہوتا تھا کہ پہلے وہ قاضی عبدالودود کے انتخاب کے متمنی تھے اور دوسرے سال جب انھوں نے اپنا نام واپس لے لیا تو شادانی صاحب کی ذہنی ہمدردیاں طاہر فاروقی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اس زمانے میں ان کا خیال تھا کہ مجنوں گورکھپوری اور طاہر فاروقی میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ ہر ایک میں کچھ خوبیاں ایسی ہیں جو دوسرے میں نہیں۔ اس غیر جانب دارانہ رائے (جو غیر جانب دارانہ ہونے کے باوجود میرے نزدیک غلط تھی اور ہے) کے باوجود وہ طاہر فاروقی کی صورت اور قابلیت سے بہت متاثر معلوم ہوتے تھے۔ ایک دن انھوں نے میرے سامنے ایک صاحب سے طاہر فاروقی کے نورانی چہرے (جب طاہر صاحب کے داڑھی تھی تو ان کا چہرہ واقعی نورانی معلوم ہوتا تھا!) کا تذکرہ اور ان کی کتاب "سیرت اقبال" کی تعریف کی تھی اور اس کے مقابلے میں مجنوں کی کتاب "اقبال" کے لیے انھوں نے قدرے حقارت آمیز لہجے میں "کتابیا" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ معلوم نہیں شادانی صاحب کی ذہنی (عملی نہیں کہہ رہا ہوں) ہمدردیوں کا کرشمہ تھا یا کچھ اور کہ مجنوں گورکھپوری اور شوکت سبزواری کے مقابلے میں طاہر فاروقی کا انتخاب اور تقرر عمل میں آیا۔ ویسے بھی جہاں تک انتخاب کا تعلق ہے شادانی صاحب ہمیشہ اپنے دوست کو ووٹ دینے کے قائل ہیں چاہے اس کا حریف اپنی اہلیت کے اعتبار سے کتنا ہی افضل کیوں نہ ہو۔

شادانی صاحب کو ڈھاکے میں رہتے ہوئے ۳۰ سال گزر گئے۔ لیکن سرزمین بنگال میں اس دیرینہ قیام کے باوجود نہ تو انھوں نے یہاں کی زبان سیکھی اور نہ یہاں کے لباس اور مذاق کو اپنایا۔ بول چال، رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں وہ یوپی کے نمائندے نظر آتے ہیں۔

بنگلا انھیں نہیں آتی۔ لنگی وہ نہیں پہنتے۔ کھانے میں آج بھی انھیں چاول سے زیادہ روٹی اور مچھلی سے زیادہ گوشت مرغوب ہے۔ اپنے گھر پر ہمیشہ کرتا اور پاجامہ پہنتے ہیں باہر جاتے وقت یا تو شیروانی میں ہوتے ہیں یا سوٹ میں۔ ادھر کئی سال سے وہ شیروانی سے زیادہ سوٹ میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ میں خود شیروانی کا شائق ہونے کے باوجود کچھ ایسا محسوس کرتا رہا ہوں کہ آدمی سوٹ میں جس قدر چاق و چوبند نظر آتا ہے اتنا شیروانی میں نہیں۔ اب اسے سوٹ کی خوبی کہہ لیجیے یا میرے نقطۂ نظر کا کرشمہ کہ شادانی صاحب پر یہ بات تو دونوں ہی سجتے ہیں لیکن وہ سوٹ میں بڑے چاق و چوبند دکھائی دیتے ہیں جیسے ان کی عمر کچھ کم ہو گئی ہو اور ان کی جسمانی چستی اور ذہنی شگفتگی نسبتاً بڑھ گئی ہو۔

شادانی صاحب ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز اردو ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں اور جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے وہ یقیناً یہاں کی ممتاز ترین شخصیت ہیں۔ ان کی اس بزرگی کا اعتراف اور احترام ہر جگہ ہر حلقے میں ہے لیکن وہ اپنی اس بزرگی اور بلند اخلاقی کے باوجود ڈھاکے میں ہر دل عزیز شخصیت کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ صاف لفظوں میں یوں سمجھیے کہ وہ مقبول اتنے نہیں جتنے نامقبول ہیں۔ ان کی اس نامقبولیت کا ایک بڑا سبب تو وہی حسد اور جلن ہے جو ابنائے زمانہ ارباب کمال سے روا رکھتے آئے ہیں۔ دوسری وجہ غالباً یہ ہے کہ اگرچہ وہ کسی کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتے پھر بھی ان کی بعض باتوں سے بعض لوگوں یا حلقوں کی دل آزاری ہو ہی جاتی ہے۔ مثلاً مشاعروں میں ان کی بدیہہ گوئی سے سامعین جس قدر محظوظ ہوتے ہیں بیشتر شعرا کی طبیعت اتنی ہی مکدر ہوتی ہے ایسے شاعروں کا خیال یہ ہے کہ شادانی صاحب انھیں نیچا دکھانے کی غرض سے انھیں کی زمینوں میں فی البدیہہ شعر کہتے ہیں۔ بعض کو یہ شکایت رہی ہے کہ شادانی صاحب کے فی البدیہہ اشعار اس تاثر کو زائل کر دیتے ہیں جو ان کے کلام سے سامعین کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ شادانی صاحب کی عدم مقبولیت میں غالباً ان کی اس بت شکنی کو بھی دخل رہا ہے جس کا ثبوت انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں دیا ہے۔ اظہار خیال کے سلسلے میں وہ آج بھی اپنی صاف گوئی اور بے باکی سے باز نہیں آتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض حلقے ان کے صرف دو ایک جملوں سے ہمیشہ کے لیے ان سے بد دل اور بیزار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے ڈھاکے کے نواب خاندان کے ایک شاعر بیدار بخت بیدار پر جو داغ کے شاگردوں میں سے تھے، اپنی ریڈیائی تقریر میں لکھ دیا تھا کہ ان کی موت نواب خاندان کے کئی اور

شاعروں کی شاعری کی موت ثابت ہوئی یا پھر اپنی ایک انگریزی ریڈیائی تقریر میں جس کا موضوع مشرقی پاکستان کی معاشرتی زندگی تھا انھوں نے کچھ ایسی حقیقتوں کی طرف اشارے کر دیے تھے جن کی وجہ سے یہاں کے باشندوں میں خاصی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی نامقبولیت جہاں ان کے متعلق لوگوں کی بدگوئی اور افواہ تراشی میں ظاہر ہوتی ہے وہاں بعض اوقات اس کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض جلسوں اور تقریبوں میں یا تو انھیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا بادل ناخواستہ مدعو کیا جاتا ہے۔ شادانی صاحب کی حساس طبیعت لوگوں کے اس رویے سے ناواقف نہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے ایک عزیز شاگرد کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ اب میں ڈھاکے میں ایک NECESSARY EVIL ہو کر رہ گیا ہوں۔

شادانی صاحب کے والد مرحوم اپنی اولادوں میں سب سے زیادہ شادانی صاحب ہی کو عزیز رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری سال شادانی صاحب کے ساتھ گزارے اور ان ہی کے مکان پر مرض الموت کی تکلیفیں جھیلتے ہوئے دنیا سے گزر گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے شادانی صاحب نے ان کی عافیت و سہولت کا ہمیشہ لحاظ رکھا۔ کئی سال پہلے شادانی صاحب دھان منڈی میں اپنا مکان بنوا رہے تھے۔ مکان بنوانے کے سلسلے کی ساری ذمہ داری ڈونڈھوپ مرحوم کے سر تھی۔ جب مکان کے دو تین کمرے بن گئے تو انھوں نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔ مگر ناشتہ اور کھانا شادانی صاحب کے یہاں سے جایا کرتا تھا جو عموماً نوکر لے جایا کرتا تھا۔ میں نے کئی بار شادانی صاحب کو بھی ناشتہ یا کھانا لے جاتے دیکھا۔ ان کی جائے قیام نیل کھیت سے دھان منڈی کا فاصلہ ایک ڈیڑھ میل سے کم نہ ہوگا۔ شادانی صاحب وہاں جانے کے لیے نہ پورا لباس پہنتے نہ رکشہ کرتے۔ کرتے اور پاجامے میں پیدل نکل جاتے۔ گرمیوں کے موسم میں جس دن گرمی زیادہ پڑتی سر پر ہیٹ رکھ لیتے۔ نئے اور نامکمل مکان میں کچھ عرصے تک رہنے کے بعد مرحوم پھر شادانی صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ وہ پرانی وضع کے آدمی تھے "اسی بنا پر اس آرام و آسودگی کے آرزومند بھی جو گھر کی بہو بیٹی اور پوتے نواسے کی خدمت گزاری کا نتیجہ ہوتی ہے نہ کہ ملازموں کے فرائض کی انجام دہی کا۔ لیکن مرحوم کو یہ نعمت میسر نہ تھی۔ ان کے بیشتر کام نوکر کے ہاتھوں انجام پاتے تھے اور اس دیس کے نوکروں میں فرض شناسی اور سلیقہ شعاری کم پائی جاتی ہے، چنانچہ قدم قدم پر ملازم کی بدولت بدمزگی کا سامنا رہا کرتا تھا۔ آقا اور ملازم کی زبانوں کے فرق

سے بھی کوفت انگیز صورت حال پیدا ہوتی رہتی تھی۔ مرحوم بنگالی اردو، بول نہیں پاتے تھے۔ ملازم ان کی شستہ اردو ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا تھا۔ نتیجتاً ان کا کام ان کی خواہش کے مطابق نہ ہوتا۔ ملازم کی بدسلیقگی یا بے وقوفی سے انھیں زیادہ تکلیف پہنچ جاتی تو ان کے صبر وضبط کا پیمانہ چھلک پڑتا اور وہ ملازم کو ڈانٹ بتا کر خود وہ کام کر دیا کرتے جس کی مرحوم کو ضرورت ہوتی۔

مذہبی عقائد کے اعتبار سے شادانی صاحب اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کپے مسلمان اور عمل کے اعتبار سے بیسویں صدی کے مسلمان ہیں لیکن ان کے والد انیسویں صدی کے انسان بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اسی لیے صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند۔ آخر عمر تک تیسوں روزے رکھتے رہے۔ شادانی صاحب روزہ نہ رکھنے کے باوجود ان کے افطار وسحری کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں بارہا یہ دیکھنے میں آیا کہ افطار سے کچھ دیر قبل شادانی صاحب ان کے لیے آم، انناس، یا کوئی اور پھل خود اپنے ہاتھوں سے کاٹ رہے ہیں۔ مرحوم مجھ سے بہت گھل مل گئے تھے۔ اگر شادانی صاحب گھر پر نہ ہوتے تو دو دو گھنٹے تک ان سے گفتگو رہا کرتی۔ ان کی باتوں سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ اپنے گھر کے افراد میں سے کس کے مداح تھے اور کس کے شاکی۔ یہاں ان کے اس راز کو رسوا کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر اتنا بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ میں نے ان کی زبان سے شادانی صاحب کی کوئی شکایت کبھی نہیں سنی بلکہ میں نے انھیں شادانی صاحب کی خدمت گزاری اور سعادت مندی کا ہمیشہ مداح و معترف پایا۔

شادانی صاحب کی سیرت، میں انجم کے ذکر سے مفر نہیں ـــــ انجم جو آن کے ایک عزیز ترین دوست کی بیٹی ہیں اور اب ان کی بہو بن چکی ہیں اس وقت بھی جب وہ شادانی صاحب کے اعزہ میں نہ تھیں انھیں اپنے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھیں۔ دبلی پتلی مگر متناسب جسم کی یہ حسین وجمیل لڑکی اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر شادانی صاحب کی ذہنی اور ادبی زندگی میں بھی دخیل رہی ہے۔ عرصے کی بات ہے شہید ملت لیاقت علی خاں کی یادگار میں ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے ایک مشاعرہ نشر ہونے والا تھا۔ شادانی صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ نزلہ زوروں پر تھا اس لیے نظم نہ کہہ سکے تھے لیکن عین مشاعرے کے روز جب کہ شادانی صاحب کی طبیعت نسبتاً زیادہ خراب تھی، بخار اور درد سر کی وجہ سے تکیے سے سر اٹھانا دشوار تھا، مشاعرے سے دو تین گھنٹے پیشتر انجم بضد ہو گئیں کہ بابا! آپ کو مشاعرے میں شرکت کرنی ہی

ہوگی۔ شادانی صاحب نے ہزار سمجھایا کہ بھلا میں مشاعرے میں کیونکر شریک ہوسکتا ہوں۔ طبیعت اس قدر ناساز ہے نظم بھی نہیں کہی ہے اور نہ اس وقت نظم کہنا ممکن ہے، لیکن جب انجم شادانی صاحب کی ان تمام معذوریوں کے باوجود اپنے اصرار پر قائم رہیں تو انھوں نے کہا۔ اچھا کاغذ قلم اٹھاؤ اگر نظم ہوگئی تو مشاعرے میں جاؤں گا ورنہ نہیں۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر شادانی صاحب نے نظم کہہ ڈالی میں ریڈیو کا مشاعرہ نہ سن سکا۔ دوسرے دن جب شادانی صاحب نے مجھے اس نظم کے متعلق وہ ساری داستان سنائی جو ابھی بیان کی گئی تو میں سوچنے لگا کیا انجم شادانی صاحب کے لیے تخلیقی تحریک کی حیثیت اختیار کرچکی ہیں؟

انجم میڈیکل کالج کی طالبہ ہیں - اس کے باوجود شعر و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتی ہیں جس پر شادانی صاحب کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اور جلا ہوگئی ہے۔ انھیں نثر نگاری یا شعر گوئی سے کوئی تعلق نہیں لیکن ان میں شعر و ادب کے مطالعے کا ذوق، ان کے سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک مرتبہ شادانی صاحب نے "مغالطہ" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا مجھے پڑھ کر سنایا - میں اپنی رائے ظاہر کرچکا تو انھوں نے کہا یہ افسانہ بہت طویل ہوگیا تھا میں نے انجم کے کہنے پر اس کے دو صفحے حذف کر دیے، دراصل وہ دو صفحے غیر ضروری تھے بھی۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ ادب کے معاملے میں انجم کا مشورہ اتنا معقول ہوسکتا ہے کہ اس کی بنا پر شادانی صاحب جیسا محتاط فن کار دو صفحے حذف کر دے۔ لیکن جب میں نے اس حذف شدہ ٹکڑے کو منگا کر دیکھا تو انجم کے مشورے کی معقولیت پر ایمان لانا ہی پڑا۔

یہاں تک شادانی صاحب کی شخصیت کے بارے میں آپ نے جو کچھ پڑھا وہ ۱۹۵۸ء تک لکھا جاچکا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں جب پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا تو اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کے اردو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ جو ناانصافی اور حق تلفی ہوئی اس کی تلافی کے لیے شادانی صاحب نے اپریل ۱۹۵۹ء میں مشرقی پاکستان اردو رائٹرز گلڈ کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کی قیادت شادانی صاحب کے سپرد کی گئی۔ یہ قیادت ان کی شخصیت کے کن نئے گوشوں کو سامنے لائی وہ اپنے اغراض و مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہے۔ یہ تحریک ان کے مزاج و مسلک پر کس طرح اثرانداز ہوئی یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق سردست کچھ لکھنا قبل از وقت ہوگا کیونکہ ابھی تک گلڈ سے متعلق جھگڑے قصہ ناتمام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ قصہ ناتمام نہ ہوتا جب بھی اس کا کیا ٹھکانا کہ مضمون مکمل ہوتا کہ نہ ہوتا۔

پس نوشت

یہ شخصی خاکہ نظیر صدیقی صاحب نے ۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۶۱ء کو مکمل کیا تھا۔ یہ خاکہ نظیر صاحب کی ایک ایسی کتاب کا ابتدائی حصہ ہے جو اب شاید ہی مکمل ہو سکے۔ اس خاکے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا مسودہ شادانی صاحب مرحوم کی نظر سے گزر چکا ہے انھوں نے کہیں کہیں سے بعض عبارتیں قلم زد کر دی تھیں اور ایک جگہ سے تو مسودے کے دو صفحے الگ کر کے ضائع کر دیے تھے۔ نظیر صدیقی صاحب سے جب یہ درخواست کی گئی کہ وہ ان مقامات کو از سر نو لکھ دیں تو انھوں نے فرمایا "اب میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ میں ان باتوں کو دوبارہ لکھوں جن کی اشاعت خود شادانی صاحب کو پسند نہ تھی"۔

خاکے کے مسودے میں ایک جگہ (مطبوعہ ص ۱۳۵) شادانی صاحب نے اپنی جزرسی کا ذکر پڑھ کر مندرجہ ذیل حاشیہ لکھا تھا۔

"اس جزرسی کے باوجود ۳۳ برس یونیورسٹی میں ملازمت کرنے کے بعد بھی اتنا روپیہ پس انداز نہ کر سکے کہ چھوٹا موٹا ایک گھر بنا لیتے۔ باپ سے ترکے میں جو کچھ ملا تھا، اس رقم سے ایک مکان تیار کرایا تھا۔ آخر مصارف سے مجبور ہو کر اسے چالیس ہزار میں بیچ ڈالا۔ وہ رقم بھی سب خرچ ہو گئی۔ اس کے بعد کار فروخت کی۔ پندرہ ہزار روپے یہ بھی مصارف کی نذر ہوا۔ بنک بیلنس نہ ہونے کے برابر ہے۔ کئی نادار عزیزوں کی کفالت میرے ذمے ہے اور بھی کئی ایسے مصارف ہیں جو باہر سے دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتے ـــ یہ صفحہ اور اگلا صفحہ اگر ان واقعات کی روشنی میں لکھا جاتا تو عبارت کچھ اور ہوتی"۔

(ادارہ)

ادب اور اکیسویں صدی

سیّد محمد تقی

انسانی تاریخ آج تک کسی ایسے تجربے سے نہیں گزری کہ کوئی تہذیب، ادب کے بغیر وجود میں آسکی ہو۔ نی اینڈر تھل کے انسان سے لے کر جدید صنعتی عہد تک جتنے بھی تہذیبی نمونے گزرے، وہ سب اپنے مخصوص ادبی رجحانات کے حامل رہے۔ بات کچھ اس نوع کی ہے کہ تہذیب اور ادب کی ماں زبان ہے۔ دونوں کا یہ گہرا رشتہ شروع سے جوں کا توں باقی رہا اور اس میں پختگی ہی پیدا ہوتی گئی۔ دوری نہیں ہوئی۔ لیکن یہاں تہذیب سے مراد تہذیب ہی ہے۔ تمدن، یعنی ابتدائی ضروریاتِ زندگی سے مراد نہیں ہے جو تہذیب اور زبان سے پہلے ایجاد کر لیے گئے تھے۔ لیکن سائنسی دور کے ارتقا کے بعد اس تعلق میں ایک بحران پیدا ہو گیا جو تہذیب اور زبان کو طویل عرصے سے ایک رشتے میں جوڑے ہوئے تھا۔ اس لیے اب یہ سوال معنویت حاصل کر گیا ہے کہ جدید حالات میں ادب پنپ سکے گا یا نہیں۔ اور ہزاروں سال کا یہ تناور درخت کہیں مرجھا کر تو نہ رہ جائے گا۔

ادب انسانی ذہن کے اس حصے میں جنم لیتا ہے جہاں شعور اور جذبات کی گہری آمیزش ہوا کرتی ہے۔ ادب اس تاثر کے لفظی اظہار کا نام ہے جسے ایک حساس ذہن اور خارج کے موثرات اپنے تصادم سے پیدا کرتے ہیں۔ جذبات اور شعور کی یہ آمیزش مختلف سماجوں میں مختلف روپ اختیار کرتی ہے۔ حساس اور باشعور اکائی — فرد — اور خارجی موثرات کی دوئی' بنیادی اساسی اہمیت نہیں رکھتی۔ سماج کا پورا ڈھانچہ خارجی موثرات کے ساتھ حساس اکائی کو بھی اپنے احاطے میں لیے رکھتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کے ملاپ سے جو مشترک حقیقت — ادب — وجود میں آتا ہے، وہ اس سماجی ڈھانچے کی نمایندگی کرتا ہے جس کے دائرے میں حساس اکائیوں اور خارجی

موثرات کا ملاپ یا تصادم ہوتا ہے۔ اس لیے ادب پر اُس عہد کی گہری چھاپ ہوتی ہے جس میں وہ جنم لیتا ہے۔

ہر سماج مستقبل کی طرف بڑھتے ہوئے نت نئے موڑ سے گزرتا ہے۔ اس نوع کا ہر موڑ ایک بحران پیدا کیا کرتا ہے۔ اسی بحرانی دور میں ادب اپنی بلندیوں کو چھوتا ہے۔ سماجی بحران شدید ذہنی اور جذباتی کشمکش پیدا کیا کرتے ہیں۔ یہ خارجی موثرات جب اپنا کردار اور روپ بدل لیتے ہیں تو ان سے حساس اکائیوں کے ذہنی در و بست پر گہری چوٹیں لگتی ہیں۔ یہی گہری چوٹیں تخیل کی بلندی اور خیال کی عظمت پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ سماجی ٹھہراؤ ادب کے لیے سب سے ناساز گار زمانہ ثابت ہوا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے ادب سماجی بحرانوں کے دور میں پیدا ہوئے ہیں۔ اردو ادب اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ اس نے ابتدائی دور، اور آخر کے اسّی نوّے سال کے علاوہ اپنی عمر کا بڑا حصّہ شدید سماجی کشمکش کے دوران گزارا ہے۔ سماجی بحرانوں اور کشمکش نے اردو کو میر و غالب دیے جن کی کامیابی اِس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ روایت کو خارجی تجربے کے ساتھ سمونے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔

بہر حال تمام ادب سماجی ڈھانچوں یا تہذیبی نمونوں کے سائے میں پلتے ہیں۔ تہذیب، شعور کے حوالے اور نسبتیں متعین کرتی ہے۔ جس سے حساس اکائیوں کے شعوری ڈھانچے کی ایک خاص کیفیت وجود میں آتی ہے۔ اسی کیفیت سے ادیب یا شاعر کے جذبات امتزاج حاصل کرتے ہیں۔ اور خارجی موثرات کے نتیجے میں لفظی جامہ پہن کر ادب بن جاتے ہیں۔ اِس طرح ہر ادب پر متعلقہ تہذیبی نمونے کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ تاریخ کے تمام ادب اپنے اپنے تہذیبی نمونوں کے رجحانات کی بڑی کامیاب نمایندگی کرتے ہیں۔ وہ ایک آئینہ ہیں جس میں جھانک کر ہم مختلف تہذیبی نمونوں کے خد و خال تلاش کر سکتے ہیں۔

تاریخ کے نئے موڑ پر

سولھویں سترہویں اور اٹھارویں صدی کے سائنسی انقلاب نے تاریخ کے لیے ایک ایسا موڑ پیدا کر دیا جس کی مثال اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اس سائنسی انقلاب سے پہلے تک

انسانوں نے جتنے تہذیبی نمونے دیکھے وہ اپنے بنیادی ذہنی ڈھانچے میں یکساں تھے۔ یہ ذہنی ڈھانچا اس تصور سے بنتا ہے جو کائنات کی بابت کوئی تہذیب صحیح باور کرتی ہے۔ سولھویں صدی سے پہلے تک کا کائناتی تصور اپنے جوہر میں سکون نواز تھا۔ اور تمام تہذیبی نمونے جو ماضی میں گزرے، اسی سکون نواز تصورِ کائنات کی بنیاد پر قائم تھے۔ بہت سے وہ حضرات جو تہذیبی اضافیت کے قائل ہیں یہ حقیقت آسانی سے نظر انداز کر جاتے ہیں کہ جدید دور سے پہلے جتنی تہذیبیں گزریں وہ کائنات کے سکون نواز تصور پر قائم تھیں۔ کائنات کا حرکت نواز تصور سولھویں صدی میں ابھرا اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں پختہ ہو کر ایک ایسے اساسی ذہنی انقلاب کا سبب بن گیا جس کی مثال ماضی کے تجربوں میں موجود نہیں ہے۔ یہ سب سے بڑا انقلابی موڑ تھا، جس سے تاریخ گزری، اور اس لیے اس نے وہ تمام بنیادیں بدل کر رکھ دیں، جن پر پرانی تہذیبوں کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔ نئی تہذیب اپنے مزاج، کردار، بناوٹ اور وسعت میں پرانی تہذیبوں سے مختلف ہے۔ سولھویں، سترھویں اور اٹھارویں صدی میں جو انقلاب آیا تھا وہ زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر جانا چاہتا ہے۔ حیات کے بہت سے شعبوں کو وہ پہلے ہی اپنے دائرے میں لے چکا ہے۔ اور ان پہلوؤں کو اپنی زد میں لا رہا ہے۔ جو ابھی تک اس کے عمل سے باہر رہے ہیں، پچھلی دو ڈھائی صدیوں میں یہ تجربہ بار بار ہوتا رہا کہ زندگی کے وہ شعبے جو پہلے سائنسی انداز نظر کی زد سے باہر رہے، آخر وہ تشریح قبول کر گئے جو سائنسی طرز کی تحقیق کی رو سے صحیح تھی۔ ادب اور شاعری نئے سائنسی انقلاب سے پہلے تک اپنی جداگانہ دنیا رکھتی تھی۔ ارسطو نے ادب کو خطابیات کے تحت رکھ کر اپنی منطق کے سخت اصولوں کی قید سے آزاد رہنے کی سہولت مہیا کر دی تھی۔ لیکن انیسویں اور بیسویں صدی کی ادبی تنقید، ادبی قدروں کو فکر کے نئے پیمانوں سے ناپتی ہے۔ تاہم آج بھی ادب کو وجدان کے حوالے کر کے چور دروازوں کے ذریعے فکری دائروں سے نکلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سولھویں صدی سے پہلے تک تہذیب کا اضافی نظریہ تاریخی جواز ڈھونڈ سکتا تھا۔ اس وقت تک کی ہر تہذیب اپنا اپنا ادب لیے الگ بیٹھی تھی۔ لیکن نئی دنیا جو اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے یک تہذیبی مزاج رکھتی ہے، ادب کے متنوع نمونوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ یہ یک ادبی دور بہت سے ادبی اختصاصات کی موت کا سبب بنے گا۔ اکیسویں صدی یک تہذیبی یک ادبی۔

صدی ہوگی۔ لیکن مستقبل میں اتنے دور تک چلنے سے پہلے اس نقطے پر یہ الجھا ہوا سوال سلجھانا پڑے گا کہ فکر کے نئے بہاؤ میں ادب اپنا انفرادی تعین باقی رکھنے میں کامیاب ہوگا یا نہیں۔ ادب نے اب تک وجدان یا انفرادی جینیس، جیسی تا حال تشریح طلب اصطلاحوں کے سہارے اپنی زندگی کا جواز ڈھونڈا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وجدان اور انفرادی جینیس کب تک ابہام کی نقاب اوڑھ کر فکر کی منطقی تحقیق سے بچی رہیں گی۔ اب ایک طرف تو صورت یہ سامنے آرہی ہے کہ بہت سے ادبی دیوان خانوں کے کھنڈروں پر یک ادبی۔ محل کی دیواریں اُٹھ رہی ہیں، اور دوسری طرف فکر کا سیلاب، وجدان اور انفرادی جینیس کے اُن زمان خوردہ ستونوں کو اپنے گھیرے میں لے رہا ہے جو اب تک تہذیب کے خود مختار میناروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ کیا اس نظری اور سائنسی دار و گیر میں ادب اپنی خود مختار حیثیت اور انفرادیت بچانے میں کامیاب ہو سکے گا۔

ادب کو جدید منطق؟ اور سائیکالوجی سے سب سے بڑا خطرہ لاحق ہونے کو ہے۔ سائیکالوجی اور جدید منطق فکر، انسانی ذہن کے کسی گوشے کو ادب کا منبع خیال کر کے اپنی بے رحمانہ سائنسی جرح و بحث سے جدا رکھنے پر راضی نہیں ہے۔ اس لیے کیا یہ خیال کیا جائے کہ ادب کے ماں باپ، یعنی وجدان اور انفرادی جینیس، سائنسی تشریح قبول کر کے ادب کی ماورائیت کی موت کا اعلان کر دیں گے۔ پھر سائنس کا مزاج شروع سے یہ رہا ہے کہ وہ پہلے تو کائنات کے مبہم پہلوؤں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کی فکری تشریح کرتی ہے اور اس فکری تشریح کے سہارے جو اصول وضع ہوتے ہیں ان کی روشنی میں اسی قسم کے کائناتی مظاہر اپنی لیبورٹری میں بنا لیتی ہے، جن کی تشریح میں اسے بہت سے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ تو سوال یہ ہے، کیا حیاتیات کے رازوں کو فاش کر کے بیالوجی و سائیکالوجی، وجدان و انفرادی جینیس کے معمے سلجھا کر اس لیبورٹری میں ادب پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں گی۔ یعنی کیا مستقبل یعنی مثلاً بائیسویں صدی میں شاعر اور نثر نگار مشینیں وجود میں نہ آجائیں گی۔ گویا کیا تاریخ مستقبل کا جو رُخ اختیار کرے گی، وہ کچھ اس طرح کا نہ ہوگا کہ اکیسویں صدی۔ یک ادبی صدی۔ اور بائیسویں صدی ادب اور شعر ساز کارخانوں کی صدیاں ہوں گی۔ جو اس طرح ادب گھڑا کریں گے جس طرح آج کے کارخانے انسانی ضرورت کی اشیا تیار کرتے ہیں۔

مستقبل کے یہ امکانات ناقابلِ قیاس نہیں ہیں لیکن مجھے یہاں ادب پر قدرے مختلف انداز سے سوچنا ہے۔ پرانی ادبی روایت، جو ماضی کے تمام ادبوں میں مشترک قدر کے طور پر موجود رہی، کائنات کے سکونیاتی فلسفے کی بنیاد پر کھڑی تھی۔ ادب ہمیشہ مابعدالطبیعیات کے سائے میں پلا کرتا ہے۔ جدید ادب کو بھی مابعدالطبیعیات کے ساتھ چلنا ہے مگر جدید عہد میں مابعدالطبیعیات یا تو سرے سے ختم ہو گئی ہے یا اس انداز پر بدل گئی ہے کہ اب اس کی صورت پہچانی بھی مشکل ہو رہی ہے۔ نئی فکر نے انسانوں سے سوچ کے آخری حوالے، جو مابعدالطبیعیات مہیا کرتی تھی، چھین لیے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ آئنسٹائن نے ماجرا کر یہ کہہ دیا کہ "ہاں کائنات عدم ہی سے پیدا ہوئی ہے"۔ یعنی ایک ایسا تصور جو قدیم فکر کے لیے محض ناقابلِ قیاس تھا؛ دوسری ارتیابیت اس منزل پر پہنچ گئی کہ آخر میں یقین صرف 'انا' کا رہ گیا۔ اور معاملہ سالپسزم پر آ رکا ہے۔

کائنات کا یہ بے روح تصور جو ماضی کے منظّم، بامقصد اور متعین کائناتی نظام کی جگہ آیا ہے۔ ادب پر گہرے اثرات ڈال رہا ہے۔ ایک ایسی کائنات جو خیال کش فاصلوں پر مشتمل ہونے کے باوجود کسی متعین مفہوم اور مقصد کا اتباع نہ کرتی ہو۔ مایوسی بھی، کرب بھی، اور ذہن کی بے چینی بھی۔ یہ مایوسی، کرب، اور بے چینی ہی وہ سوتے ہیں جن سے ادب پھوٹتا ہے۔ اگر اکیسویں اور بائیسویں صدی کی بیالوجی انسانی نمونوں کو لیبورٹری میں گھڑنے میں کامیاب ہو سکی تو بیالوجی کے باہر کا وہ کرب جو کائنات کے ڈھانچے سے پیدا ہوگا، اس مفروضہ کرب سے لازماً الگ اہمیت کا حامل رہے گا جو لیبورٹری میں پیداشدہ مواد کے مجموعوں سے وجود میں آسکے گا۔ اس لیے ادب اپنے مقام کو کسی حد تک ضرور باقی رکھے گا۔ لیکن بیسویں، اکیسویں، بائیسویں اور ان کے بعد کی صدیاں جس ادب کو باقی رکھ سکیں گی وہ اس ادب سے مختلف ہوگا جس سے ہم اب تک متعارف رہے ہیں۔

جدید صنعتی عہد سے ادب کا حلیہ کافی بدل گیا ہے۔ لیکن یہ سمجھنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے کہ ادب سائنسی دور کا ساتھ نہ دے سکے گا۔ اس لیے کہ ادب فرد کے کرب کی نمایندگی کرتا ہے اور یہ کرب، فرد کے ساتھ اس کے اساسی ذہنی و جذباتی عنصر کی طرح باقی رہتا ہے۔ اس لیے آنے والے سائنسی معاشرے۔ اگر وہ بھیانک بموں کی تباہیوں سے بچ گئے۔ ادب سے ضرور

نباہ کریں گے۔ لیکن سائنسی ماحول کا یہ ادب انسانی ذہن و جذبات کے مبہم گوشوں کا سہارا نہ لے گا۔ جن کی تشریح سائنسی دائرے میں شامل ہو چکی ہوگی۔ نیا ادب سائنسی ماحول میں پروان چڑھے گا اس لیے اس کی قدریں ماضی کے انداز سے مختلف ہوں گی۔ یہ ادب نئی تہذیب کا ادب ہوگا۔ جو انسان گیری اور کائنات گیری کی خصوصیات کا حامل ہونے کے ساتھ ہی جذبات کے اُن باریک تر ریشوں سے گزرے گا جنھیں پرانے ادب نے سوچنے کی جرأت بھی نہ کی تھی۔ چھونے کی منزل تو بہت بعد میں آتی ہے۔

اوراقِ پارینہ

اُردو کے ان پڑھ شاعر

(۳)

مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

یہ[1] حال ہو گر سب پہ عیاں بہتر ہے ۔۔۔ حق گوئی کرے جو، وہ زباں بہتر ہے
گر حکم ہو مجلس میں ابھی نظم کروں ۔۔۔ اس شک سے حسین کا امتحاں بہتر ہے

منکر ہو جہاں میں اس کا کیونکر کوئی ۔۔۔ ڈھونڈھے سے نہ ملے جس کا ہمسر کوئی
میزان خرد میں ہم نے تولا سو بار ۔۔۔ لیکن نہ ملا نبی سے بہتر کوئی

رباعیوں کے بعد سلاموں کا نمونہ پیش کرنا ضروری ہے ۔ اس سے صرف اتنا مطلب ہے کہ حسین اس صنف سخن میں بھی اپنے ہم عصر شعرا کے ساتھ ہیں ۔ ان سلاموں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کہیں کہیں پر تو حسین نے ایسے ایسے لطیف شعر نکالے ہیں جو ان کی پختہ کلامی اور کہنہ مشقی پر دال ہیں ۔

یا علی! جام و سبو پیمانہ میرا ہو گیا ۔۔۔ اس فقیر مست کا کوثر پہ پھیرا ہو گیا

---

[1] سابقہ قسط کے آخر میں صادق علی حسین کا ترجمہ تھا جو موجودہ قسط میں مکمل ہو رہا ہے۔
(ادارہ)

یا محمد یا محمد لب پہ، کپڑے گیروے
آپ کے روضے پہ اس صورت سے پھیرا ہوگیا

جب دیے تختے لحد میں، میں پکارا یا علی
اب نقاب الٹے ہوئے آؤ اندھیرا ہوگیا

جب شب عاشورہ پچھلے سے سجا شہ کا علم
ضو سے پنجے کی، بیاباں میں سویرا ہوگیا

کیا ضیا دیتے چراغ مرقد خیرالوریٰ
شام کے لشکر سے دنیا میں اندھیرا ہوگیا

مر کے جینے سے نصیری کے ہے اک شک یا علی
جو خدا سمجھا وہ کیا بندہ بھی تیرا ہوگیا

غم میں بیٹوں کے یہ فرماتی تھیں زینب بار بار
ڈوبنے سے ان ستاروں کے اندھیرا ہوگیا

کٹ گئی عاشور کی شب رو رو اذاں کہتی تھیں ماں
ہم شبیہ مصطفےٰ اٹھو سویرا ہوگیا

قبر والو! قم باذن اللہ کا مطلب یہ ہے
کٹ گئی شب روز محشر کا سویرا ہوگیا

قتل گہ میں ہیں یہ دونوں وقت ملتے ماں کے بین
گھر میں آؤ اب علی اصغر اندھیرا ہوگیا

لے چلی جنت میں تجھ کو مدح آل مصطفےٰ
لے حسیںؔ لے خوش ہو اب فردوس تیرا ہوگیا

پڑے ہیں عرش کے ٹوٹے ستارے ضوفشاں ہوکر
زمین کربلا! چمکے گی اب تو آسماں ہوکر

ہوئے تیغ عباس جری کا تیز دھارا ہے
پھریرے فوج اعدا کے اڑیں گے دھجیاں ہوکر

شب معراج ہے، ہیں عاشق و معشوق میں باتیں
قیامت کر رہا ہے آج پردہ درمیاں ہوکر

کھلا بعد ولادت مرتضیٰ کے چشم و ابرو سے
یہی اک روز بت کعبے میں توڑیں گے جواں ہوکر

پیا ہے ناریوں کا خوں، بڑھی ہے آب میں گرمی
ابھر آئے ہیں جوہر تیغ کے سب مچھلیاں ہوکر

گئے باغِ جناں ظہر تک، جن جن کو جانا تھا
کھڑے ہیں شہ اکیلے، یوسفِ بے کارواں ہوکر

چلے ہیں لے کے یہ کہتے ہوئے شبیرؑ خیمے سے
بعینہٖ مرتضیٰ ہوتے علی اصغر جواں ہوکر

کہا شہ نے کہ اصغر حجت ناطق کا پوتا ہے
سوالِ آب اعدا سے کرے گا بے زباں ہوکر

حسینؔ نقش قدم پر کاملوں کے پاؤں رکھتے ہو
چلے ہو پیچھے پیچھے تم بھی گرد کارواں ہوکر

علم دار جری جب لے کے خیمے سے علم نکلے
تن کفار کانپے خوف سے اعدا کے دم نکلے

نجف ہو، سامرہ ہو، کربلا ہو، یا خراساں ہو
الٰہی جس جگہ سجدہ کروں میں وہ حرم نکلے

کھلے وہ پھول جنت میں بجھے وہ شعلۂ دوزخ
غم شہ میں یونہی اک اور آنسو چشم نم نکلے

علی اصغر گلے پر تیر کھا کر مسکراتے ہیں
جوانوں سے نبی کے گھر کے بچے بھی نہ کم نکلے

خدا کے خاص یہ بندے ہیں، اس کو صبر کہتے ہیں
کریں منہ سے نہ اُف شبیرؑ اور اکبر کا دم نکلے

وغا کے شوق میں حضرت الٹ کے جب نقاب آئے
خبر دی گرد نے اٹھ کر کہ ابن بوتراب آئے

کھلیں آنکھیں ہوا دل خوش لحد میں جان سی آئی
پئے تعظیم اٹھا میں جب سرہانے بوتراب آئے

پڑا ہے تیغ شہ کاٹھی میں رہنا اس کا مشکل ہے
گلے کٹ جائیں گے لاکھوں کے کیوں یہ بے نقاب آئے

یہی اک ایک سے کہتی تھیں بانو روزِ عاشورہ
کہیں سے میرے اصغر کے لیے اک جام آب آئے

ولادت سے امام عصر کے دنیا ہوئی روشن
جہاں میں آپ یوں آئے کہ جیسے آفتاب آئے

وہ اعدا میں پڑی ہل چل وہ تارا سا علم چمکا
پھٹا وہ گرد کا پردہ وہ ابن بوتراب آئے

جہاں میں چھا گئی تھی چار سو جو کفر کے باعث
مٹانے کو اسی ظلمت کے بارہ آفتاب آئے

کہا شبیرؑ نے اعدا سے تم مجبور سمجھے ہو!
جو چاہوں میں تو مجھ تک بڑھ کے خود دریا کا آب آئے

نبی زادوں کے لاشے بے کفن ہیں دشتِ غربت میں
حسینؔ کیوں کر نہ دنیا میں بھلا اب انقلاب آئے

اوروں کو تو مضموں کے دیے لعل و گہر بھی
دیکھو تو ذرا معجزۂ نفس نبی کو!
زینب کے پسر نیچوں پر ہاتھ رکھے ہیں
ساقی ہیں دیے جیسے کہ مداحوں کو اپنے
جبریل کے پر تیغ سے کاٹے کہ نہ کاٹے
یہ کہہ کے تیمم کو اٹھے رن میں نمازی
اس شیر کی دریا پہ ہوا بندھ گئی ایسی

اے فاطمہ زہرہ کے قمر! کچھ تو ادھر بھی
ہیں پاؤں بھی بالائے ہوا ہاتھ میں در بھی
ابرو پہ بھی بل پڑتے ہیں ترچھی ہے نظر بھی
ویسا ہی چھلکتا ہوا اک جام ادھر بھی
ہے دست علی میں درِ خیبر کی سپر بھی[1]
شب کٹ گئی، ظاہر ہوئے آثار سحر بھی
عباس کی تلوار سے اڑنے لگے سر بھی

ماں کہتی ہے منکا بھی ڈھلا، سانس بھی اکھڑی
کچھ دیر میں دنیا سے ہے اصغر کا سفر بھی

حسینؔ کو غزل گوئی کا شوق کم ہے کبھی کبھی تفنن طبع کے طور پر کہتے ہیں۔ وہ کلام بھی اتنا تھا کہ اگر وارستہ مزاجی جمع کرنے کی اجازت دیتی تو اب تک ضخیم دیوان جمع ہو گیا ہوتا مگر ان کا یہ رنگ کہ غزل کہی، لکھوائی اور لاپروائی سے ڈال دی، کہیں دب دبا کر رہ گئی تو خیر ورنہ ضائع ہو گئی۔ جناب تمنّا نے ۱۴ - ۱۵ غزلیں تلاش کر کے برائے تذکرہ عنایت فرمائی ہیں۔ ہمارا خیال تھا انتخاب درج تذکرہ کرتے مگر حسینؔ کی بے توجہی کلام عاشقانہ کو رواج دینے کی اجازت نہ دے گی اور آنے والے زمانے کے لیے پرچوں یا تذکروں میں جو کلام محفوظ ہو جائے وہی مناسب ہوگا اور ایک اُمّی شاعر کی یاد تازہ کرتا رہے گا، لہٰذا دستیاب شدہ غزلیں بجنسہٖ لکھی جاتی ہیں۔

کس سمت منہ چھپا کے وہ تیر نظر گیا
دل کا بھی خون ساتھ کلیجے کے کر گیا
لچکی کمر جو اُن کی تو بوسے کے شوق میں
بل کھا کے پیچ زلف کا خود تا کمر گیا

---

[1] جنگ خیبر کی طرف اشارہ ہے۔

کیا کیا دبایا نام سے تو نے فشار کے
اے قبر آج تک تو نہ دردِ جگر گیا
خود ہی تو توڑتے ہیں مرے دل کے آبلے
اور خود ہی پوچھتے ہیں کہ دردِ جگر گیا
ظالم نے ہاتھ سینے پہ رکھا جو ناز سے
سمجھا یہ میں کہ زخم کلیجے کا بھر گیا
کیوں مسکرا کے اس نے دوبارہ نگاہ کی
اک تیر اور زخمِ جگر میں اتر گیا
کیوں کر نہ دونوں کروٹیں بدلوں میں بار بار
اک تیر دل سے ایک جگر سے گزر گیا
جوشِ جنوں نے چاک گریبان کر دیا
اب دیکھ لیں وہ پردۂ زخمِ جگر گیا
بس اے حسین بتوں پہ دل کو کرو نثار
اب ان محبتوں کا زمانہ گزر گیا

کسی کو صدمہ و رنجِ فراقِ یار نہ تھا　　ہماری طرح کوئی اور بے قرار نہ تھا
لگا کے ہاتھ میں مہندی، وہ قبر پہ بولے　　پسِ فنا بھی کوئی تیرا غم گسار نہ تھا
زبان بن کے لحد میں یہ استخواں نے کہا　　علاجِ دردِ جگر کا بجز فشار نہ تھا
بڑی ہی خیر ہوئی شب کو تم جو آئے تھے　　جگر کا زخم بھی اس وقت اشک بار نہ تھا
جو رنگ بھی تھا گلوں پہ، تو خونِ بلبل سے
چمن میں کون سے غنچے کا دل فگار نہ تھا

شعلے ہماری آہ کے پتھر میں دیکھیے　　چھالے پڑے ہوئے دلِ مضطر میں دیکھیے
باقی نہیں ہے نام کو جسم نزار میں　　میرے لہو کو اپنے ہی خنجر میں دیکھیے
مجھ نیم جاں کو قتل کریں آپ کیا عجب　　رخ آج چاند دیکھ کے خنجر میں دیکھیے

الفت زیادہ ہو گئی دل میں مرے حسینؔ
اب آگے چل کے کیا ہو مقدر میں دیکھیے

چین آئے گی جو دیکھوں گا تصویر یار کی — اب حد نہیں رہی ہے مرے انتظار کی
راحت ہے میرے حق میں اذیت فشار کی — حسرت نکل رہی ہے دلِ بے قرار کی
اکر جلا گئے مری تربت کے سب چراغ — اتنی خوشی تو کی دلِ امیدوار کی
کیوں تیرہ بختیوں کی شکایت بڑھایئے — گل کیجیے نہ شمع ہمارے مزار کی

تم لے حسینؔ جگر سے ذرا تیر کھینچ لو
ہو جائے گی دوا بھی دلِ بے قرار کی

ایسے بھی کہیں درد کے مارے نہیں دیکھے — ہم نے گل و بلبل کے اشارے نہیں دیکھے
جب میں نے کہا مرتا ہوں، منہ پھیر کے بولے — سنتے تو ہیں پر عشق کے مارے نہیں دیکھے
ہر سمت پھرے، خاک اڑایا کیے برسوں — پر نقشِ قدم ہم نے تمھارے نہیں دیکھے
پوشیدہ ہیں کس حد میں مری خاک کے ذرے — پتھر میں بھی اس طرح شرارے نہیں دیکھے
تربت میں مرے بندِ کفن کھول کے بولے — ہم نے دہنِ زخم تمھارے نہیں دیکھے
اب قبر پہ آئے ہو تو اس سمت بھی دیکھو — ہاں، نیچی نگاہوں کے اشارے نہیں دیکھے

بے چین ہے دل فصلِ بہاری میں حسینؔ کا
اب تک کسی گل رو کے اشارے نہیں دیکھے

مندرجہ بالا غزلیں ابتدائے مشق سخن کا نتیجہ ہیں، جن میں عہد شباب کے ولولے اور جذبات جلوہ نمائی کر رہے ہیں۔ اب تھوڑا کلام موجودہ دور کا پیش ہوتا ہے جس سے حسینؔ کی کہنہ مشقی اور شاعری کے عہد جوانی پر روشنی پڑے گی۔ ان غزلوں سے حسینؔ کی طرز ادا، حسنِ بیان، زورِ طبیعت، نزاکت تخیل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فکر طبیب نے، نہ دوا نے بچا لیا — بیمار کو، کسی کی دعا نے بچا لیا
قصہ تمام ہو گیا بس ایک ہاتھ میں — قاتل! تری جفا سے قضا نے بچا لیا
رخ تیر کا پلٹ دیا جھونکوں نے آہ کے — میرا چراغ زیست ہوا نے بچا لیا

منہ پھیرنے ہی کو تھا میں کعبہ کی سمت سے ناقوسِ بت کدہ کی صدا نے بچا لیا
گرداب بحرِ غم میں پھنسا تھا جہازِ دل لیکن یہ شکر ہے کہ خدا نے بچا لیا

ہمارے گھر میں آنا صبح سے اور شام ہو جانا
خدا رکھے جوانی ہے، نہ تم بدنام ہو جانا
بکھر کر زلف گہ آتی ہے گہ اٹھتی ہے چہرے سے
نہ دیکھا ہو تو دیکھو صبح ہونا شام ہو جانا
نہیں بھاتا ہے کچھ دنیا کا اے جوشِ جنوں مجھ کو
مگر دیرا ہی کے صبح ہونا شام ہو جانا
سحر کو دیکھنے والوں کی قسمت اور بھی چمکی
وہ پڑنا دھوپ کا اور وہ سنہرے جام ہو جانا
جگر سے تیر تو کھینچا ہے، لیکن یہ بھی کہتے ہیں
بہت دشوار ہے جلدی تجھے آرام ہو جانا

جمع سب عاشق تھے ان کے شوق سب کے دل میں تھا کیا مزہ کیا لطف، دورِ ساغرِ محفل میں تھا
سننے والوں کے برابر اشک بہتے جاتے تھے کس کا عبرت خیز قصہ آپ کی محفل میں تھا
چھوٹ جاتی تھی تڑپنے سے مرے اس کی چھری میں تو ہیں، قاتل بھی میرا ذبح سے مشکل میں تھا
قبر پر روتا تھا کوئی مجھ کو ہوتا تھا فشار! میں تو بعد دفن بھی کچھ دیر تک مشکل میں تھا
ضد تھی قاتل کو نہ تڑپے یہ، نہ اس کو موت آئے عاشقِ ۔خ زیرِ خنجر بھی بڑی مشکل میں تھا
نامہ بر سے یہ حسیں کہتا ہے، لایا کچھ جواب منتظر میں کب سے تھا، تو کون سی منزل میں تھا

زخم دیتے ہیں لہو جب دیکھتا ہوں سوئے دوست
دل سے رکھتی ہے تعلق جنبشِ ابروئے دوست
جب سے ہم زنداں میں ہیں راتوں کو نیند آتی نہیں
یاد کرتے ہیں تمھیں اے ساکنانِ کوئے دوست
اس طرف سے کیا کسی ناشاد کی گزری ہے لاش
بے سبب اُڑتی نہیں ہے آج خاکِ کوئے دوست

عمر بھر خود بھی رہوں گا قبر بھی ہو گی یہیں
دے کے دل میں مول لیتا ہوں زمینِ کوئے دوست
وسعتِ میدانِ دل بھی کر سکا ناوک نہ طے
دیکھ لی بس میں نے حدِ طاقتِ بازوئے دوست
فائدہ میری لحد بننے سے اتنا تو ہوا:
بس رہی ہے آج پھولوں سے زمین کوئے دوست
وقتِ آخر سوچتا ہوں کیوں میں دنیا سے چلا
مجھ سے بد قسمت کا سر ہو اور ہوزانوئے دوست
فاتحہ پڑھ لو ذرا قبرِ شکستہ پر مری
اس طرف بھی دیکھ لو اے ساکنانِ کوئے دوست
اس طرح سیرِ گلستاں سے تعلق دل کا ہے
ہر کلی ہر پھول سے آتی ہے مجھ کو بوئے دوست
کاش وقتِ نزع چہرے سے الٹ دیتے نقاب
کیوں جنازے پر مرے کھولے گئے گیسوئے دوست
مجھ کو پروانوں کے جل جانے پر آتی ہے ہنسی
شمعِ تربت کو سمجھتے ہیں چراغِ کوئے دوست
درد بن کر رہ گیا ہے جب سے الٹی ہے نقاب
دل سے جاتا ہی نہیں دم بھر خیالِ روئے دوست
منہ چھپائے ہیں لحد کے سونے والے خاک میں
کیا کفن کے پارچوں میں ہے نقابِ روئے دوست
ٹوٹتی ہے میری رگ رگ ہچکیوں سے موت کی
اڑ گیا ہے بوئے گل کی طرح رنگِ روئے دوست
کس طرف ہے جلوۂ شمع طرب افزائے بزم
صبحِ صادق کی سفیدی ہے نقابِ روئے دوست

مجھ پہ تلواریں لگانے کی ادا کو دیکھیے!
پھوٹ نکلا جلد سے خونِ رگِ بازوئے دوست
ڈھونڈنے پر میرے اُن کو آرہی ہے کچھ ہنسی
دل کا چلتا ہے پتا اب تو تہِ زانوئے دوست
دل کی الجھن لے حسینؔ ہر طرح سے باقی رہی
طولِ شامِ ہجر سے بھی بڑھ گئے گیسوئے دوست

ہے وقتِ سحر باغ میں وہ آئے ہوئے ہیں — وصلِ گل و بلبل سے بھی شرمائے ہوئے ہیں
میں نے جو کہا وصل میں زلفیں ہیں پریشاں — اب تک وہ اسی بات پہ شرمائے ہوئے ہیں
اب ہجر کی بھی ہوگی کسی کو نہ شکایت — تصویر کے کھنچنے سے وہ شرمائے ہوئے ہیں
کچھ دیر ابھی اور نہ احباب اٹھائیں — وہ میرے جنازے پہ حسینؔ آئے ہوئے ہیں

زخم کھولے ہیں اگر آنکھ، تو بے زار نہ ہو
یہ نئی ضد کہ کوئی طالبِ دیدار نہ ہو
اس کے لڑنے میں ہے اک حسن بگڑنے میں ادا
بچپنا کیسا، جو ہر بات میں تکرار نہ ہو
حال قیدی کا نہ ہو دیکھنے والا کوئی!
آنکھ کھولے ہوئے گر روزنِ دیوار نہ ہو
مصلحت ہے کہ یونہیں غش میں رہیں طالبِ دید
وہ جو دامن کی ہوا دیں کوئی ہشیار نہ ہو
دیکھو انگڑائی نہ لو، بندِ قبا ٹوٹ نہ جائیں
سو رہو، رات بہت ہے ابھی ہشیار نہ ہو
دم نکلتا ہے، مگر کچھ نہیں وسواس کی جا
اے حسینؔ پاس وہ آجائیں جو آزار نہ ہو

وقتِ زینت دور رکھا کر ستم گر آئینہ — حسنِ عالم سوز سے چٹکا ہے اکثر آئینہ

دیکھتے ہیں دوست میری سانس آخر وقت ہے　　رکھ دیا ہے لاکے اک منہ کے برابر آئینہ

یہ بھی تدبیر اپنی اپنی یہ بھی اپنی اپنی چال　　میں نہ دیکھوں، اور دیکھے اس کو دن بھر آئینہ

آج وہ زلفیں بناتے ہیں نئے انداز سے　　لاکے رکھا ہے مرے دل کے برابر آئینہ

وقتِ زینت چاہیے ہر ہر ادا کی دیکھ بھال　　ان کے کاشانے میں ہو قد کے برابر آئینہ

آتش دل کا پتا دیتے ہیں آہوں کے شرر　　عکس تو باہر ہے اور ہے گھر کے اندر آئینہ

کیوں شب وصلت پسینے سے ہو صاف اس رخ کی کم　　خوشنما ہوتا ہے زیر آب بھی ہر آئینہ

پہلے دیکھی شکل اپنی پھر یہ بولا وہ حسین　　میری آنکھیں کشتیاں ہیں اور سمندر آئینہ

عشق کے ہاتھوں ہے رُو زرد اور آنکھیں ہیں پر آب
اے حسینؔ دیکھو تو اب صورت دکھا کر آئینہ

درازی اور کچھ گر آپ کے گیسو میں بڑھ جائے
تو دل فرطِ مسرت سے مرے پہلو میں بڑھ جائے

یہی ضد ہے تو مجھ پر شوق سے ناوک لگا قاتل
بڑھے مشقِ ستم بھی، زور بھی بازو میں بڑھ جائے

مثالِ خانۂ دل جل اٹھیں سب آنکھ کے پردے
ذرا سی اور حدت گر مرے آنسو میں بڑھ جائے

زیادہ ہو اگر سرمے کی تحریر آنکھ کی حد سے
تو پھر دونا اثر چلتے ہوئے جادو میں بڑھ جائے

ہلالِ عیدِ قرباں جان کر سب شوق سے دیکھیں
چمک اتنی تو اس کے خنجرِ ابرو میں بڑھ جائے

بھروں آہیں جو فرقت میں تو جنبش ہو پہاڑوں کو
کسی دریا پہ گر روؤں تو اک آنسو میں بڑھ جائے

لگاتا ہے وہ جب تیرِ نظر تو میں یہ کہتا ہوں!
الٰہی اور اک ناوک مرے پہلو میں بڑھ جائے

نہ دیں مجھ کو تسلّی اور نہ وصلت کا کریں وعدہ
وہ خالی مسکرا ہی دیں تو دل پہلو میں بڑھ جائے
شبِ وصلت کی راحت لے حسینؔ ہے عارضی بالکل
وہ پہلو سے اٹھیں تو درد پھر پہلو میں بڑھ جائے

کلیجہ کھائے عاشق اور مضطر ہو کے نکلیں گے
جو اپنے گھر سے وہ خورشید خاور ہو کے نکلیں گے
گلے میں بے خودی سے دوڑ کر میں باہیں ڈالوں گا
وہ محشر میں اگر میرے برابر ہو کے نکلیں گے
یہیں ڈر ہے کہ کمسن ہیں نہ تابِ ضبط لائیں گے
انھیں ضد ہے کہ لاشوں کے برابر ہو کے نکلیں گے
کھلا رہنے دو منہ میرا کفن سے کیوں چھپاتے ہو
سنا ہے وہ جنازے کے برابر ہو کے نکلیں گے
حسینؔ ان کو اگر صورت دکھائے گا نہ وہ ظالم
تو اس محفل سے آئینے مکدر ہو کے نکلیں گے

ناوک وہی ناوک ہے جو تا حدِ نظر جائے
اتنی تو ہو طاقت کہ تصور سے گزر جائے
پہلو میں جو تم ہو تو دلِ زار ابھر جائے
انجمن میں کمی کچھ ہو تڑپنے کا اثر جائے
اللہ کرے خیر سے یہ رات گزر جائے
منہ دیکھ کے بیمار کا آجاتا ہے رونا
چہرے کی طرح سے کہیں چل نہ اتر جائے
گھبرا کے مرے دل پہ لگاتے ہیں وہ ناوک
ان کو ہے یہی ضد کہ یونھیں رات گزر جائے
ہم چاہتے ہیں یہ کہ وہ زلفیں نہ بنائیں
مطلب یہ ہے کم بخت نہ مرتا ہو تو مر جائے
خط اس نے جو لکھا تو پر تیر پہ لکھا
پانی کے نکلنے سے کہیں آگ نہ بڑھ جائے
بڑھ جائے گی سوزش مرے چھالوں کو نہ توڑو
نزدیک ہے دل تک نہ کہیں خون جگر جائے
پیکاں کا چھنکتا ہوا پہنچا ہے کہاں زہر

مثلِ حسرت بلبلوں کے نقشِ دل پر پھول ہے
خار ہر شے ہے گلستاں کی یہ دل پر پھول ہے

کہتی ہے بلبل کہ دیکھے کوئی حدِ شوقِ دید
شاخ پر کب ہے؟ مرے تارِ نظر پر پھول ہے
رات دن ہم دیکھتے ہیں باغِ عالم کی بہار
شب کو تارے صبح کو خورشیدِ خاور پھول ہے
کس لیے ساقی کلائی دیکھتا ہے بار بار
دستِ نازک سے اٹھا کر دیکھ ساغر پھول ہے
میرے آنسو کی دورنگی دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آنکھ میں موتی ہے اور دامن پہ گر کر پھول ہے

کھینچا ہے جو پیکاں تو سرک جاؤ ادھر سے
اب خون نہیں آگ نکلتی ہے جگر سے
کہتے ہیں وہ شانہ مرا تربت میں ہلا کر
کیا آنکھ نہ کھولو گے شبِ ہجر کے ڈر سے
لگ جائے کہیں آگ قفس میں تو غضب ہو
ہم آہ بھی کرتے نہیں صیاد کے ڈر سے
گھر جانے کے ساماں ہوئے بننے لگے گیسو
تیور بھی بدلنے لگے آثارِ سحر سے
بکھرے ہوئے گیسو بھی چھپائیں گے اسے کیا
جاگے ہیں کہیں رات کو ظاہر ہے نظر سے

حقیرؔ، حافظ فتح محمد

حافظ فتح محمد نام، حقیرؔ تخلص۔ مولد تو بریلی توابع لکھنؤ ہے لیکن مسکن خاص لکھنؤ تھا۔ چوک میں ٹکسال کے نام سے جو محلہ مشہور ہے وہیں رہا کرتے تھے۔ سلسلۂ نسب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ اسی اظہار کے لیے اپنے نام کے آخر میں لفظ "فاروقی" کا اضافہ کرتے تھے۔ یہ نابینا بلکہ کور مادرزاد تھے۔ اس لیے صحیح معنوں میں حافظ کہلانے کے مستحق ہیں۔ کلام اللہ حفظ تھا۔ قرآن خوانی اور کتب فروشی کر کے اوقات بسر کرتے تھے۔ حافظہ بے حد قوی تھا۔ ایک بار جو بات گوش زد ہوئی پھر کبھی فراموش نہ ہوئی۔ یہی سبب ہے کہ مذہبی معلومات بہت وسیع تھیں۔ علمائے دین کی صحبت نے مسئلے مسائل

اور علم مناظرہ میں ہوشیار کردیا تھا۔ حافظ صاحب اکثر بازاروں اور مجمعوں میں غیر مقلدین سے مناظرہ و مباحثہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ تقریر بہت صاف وشستہ اور فصیح ہوتی اور اس سے اُمیت کا پتا نہ چلتا۔ صاحب تصانیف بھی ہیں ایک رسالہ علم مناظرہ میں "شریعت آرہ" کے نام سے تصنیف کیا تھا جو اُن کی حیات میں طبع ہوکر شایع ہوا تھا اور اب نایاب ہے۔ دوسری تصنیف نعتیہ دیوان ہے جسے مطبع آفتاب عالم تاب نے "کلام بے نظیر" کے نام سے چھاپا تھا۔ یہ دیوان بھی اب نہیں ملتا۔ حقیر کی ذات میں ایک حیرت انگیز صفت پائی جاتی تھی جس سے ان کے جاننے والے حد درجہ متعجب ہیں۔ یہ تو بتایا جاچکا ہے کہ حقیر کی معاش کا دارومدار قرآن خوانی اور کتب فروشی پر تھا۔ اکثر تجارت کے سلسلے میں بیرونجات اور مقامی میلوں ٹھیلوں میں شریک ہونے اور دکان لگانے کا اتفاق ہوا کرتا جہاں کتابوں کی خریداری کو ہر قسم اور ہر مذاق کے لوگ آتے، کوئی خریدار کسی مذاق اور کوئی کسی مضمون کی کتاب مانگتا۔ حافظ صاحب کو کتابیں نکالنے کا کچھ ایسا ملکہ ہوگیا تھا کہ ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر صاحب فرمائش کی مطلوبہ کتاب نکال دیتے اور انتخاب میں کبھی غلطی نہ ہوتی۔

انھوں نے کسی زبان کا کوئی حرف نہیں پڑھا تھا مگر قدرت نظم حاصل تھی، چوں کہ طبیعت پر مذہبی رنگ غالب تھا اس لیے جب شاعری کی لہر آتی تو حمد و نعت میں کچھ کہہ لیا کرتے اور اس کلام سے دینی جوش و مذہبی عقائد واضح ہوتے۔

حقیر گندم گوں گول ہاتھ پاؤں کے پستہ قد آدمی تھے۔ حاجیوں کی وضع کا ٹخنوں تک لمبا کرتا اور ڈھیلی مہری کا شرعی پائجامہ، دو پلی ٹوپی، خاص وضع تھی جو کسی فصل کسی موسم اور کسی زمانے میں نہ بدلی، جاڑا، گرمی، برسات ایک طرح بسر ہوئی۔ ۷-۱-۱۹۰۱ء میں تہتر برس کی عمر پاکر فوت ہوئے۔ جناب عشرت کے ذریعے سے جو کلام دستیاب ہوا بجنسہ درج تذکرہ ہوتا ہے۔ اس مخمس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیر صرف اردو زبان ہی میں نظم کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے بلکہ فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے جسے عالموں کی صحبت کا فیض سمجھنا چاہیے۔ خمسہ ملاحظہ ہو:

ہیں ارض و سما سب تہِ فرمانِ محمد ہے ظلِ خدا سایۂ دامانِ محمد
کس طرح نہ مخلوق ہو قربانِ محمد لولاک کہ نازل شدہ در شانِ محمد
جز دیست ز اوصاف فراوانِ محمد

نعت نبوی خامہ سے کس طرح رقم ہو اللہ ہو قرآں میں خود جس کا ثنا گو
تعریف لکھے اس کی نہیں تاب بشر کو از بندۂ بے چارہ چہ آید صفتِ او
جبریل امیں، است ثنا خوانِ محمد

مشتاق ہوا خالق اکبر شبِ معراج بلوایا انھیں حق نے فلک پر شبِ معراج
نبیوں کو ہوئی عید میسّر شبِ معراج بر عرش چو افتاد گذر در شبِ معراج
گشتند ملائک ہمہ قربانِ محمد

دروازے سے اس کے پھرا کب کوئی تہی دست مجذوب ہو، سالک ہو یا ہووے کوئی مست
محروم ز فیضش نہ کسے شیخ نہ شاب ست در ذاتِ شریفش ہگی رحمتِ حق ست
بر جملہ خلائق بود احسانِ محمد

ادیان و ملل جملہ نبیوں کے ہوئے پست پر دینِ محمد ہی رہا سب میں زبردست
شک نیست دریں قول کہ ایں شعر بجا ہست او ہر چہ بفرمود درست ست بحق ست
از جان و دلم تابعِ فرمانِ محمد

سرمہ جسے منظور ہو بینائی کی خاطر جا کر درِ دولت پہ نبی کے ہو وہ حاضر
ہو روشنی آنکھوں میں لگا لینے سے ظاہر خاک قدم او ست بہ از کحلِ جواہر
شاہانِ جہانند غلامانِ محمد

کچھ دل میں حقیر اپنے نہیں خوفِ جہنم بخشائیں گے خالق سے مجھے شافع عالم
افعال نہیں نیک ہوئے مجھ سے کسی دم ہر چند ز حسنات تہیدست ترا ہم
غم نیست کہ دستِ من و دامانِ محمد

خبیر

اس اُمّی شاعر کا نام دریافت نہ ہو سکا مگر حسین آباد لکھنؤ میں رہتا تھا۔ غدر

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہوا۔ خاندان میں دست کاری کا پیشہ ہوتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کی جانب بالکل توجہ نہ تھی۔ خبیرؔ بھی خاندانی دستور کے مطابق پڑھا لکھا نہ تھا۔ خراد کا کام کرکے زندگی گزار دی اور اس پیشے سے جو کچھ پیدا کیا اس سے اپنی اور اہل و عیال کی بسر کی۔ لکھنؤ کی شاعرانہ آب و ہوا نے اس کے قلب و دماغ پر پورا اثر ڈالا تھا۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ جب اپنے کام سے فارغ ہوتا تو شعر گوئی کی طرف توجہ کرتا۔ جو کچھ کہتا فکر کے ساتھ اور سوچ سمجھ کر کہنے کی سعی کرتا۔ کلام میں لکھنؤ کا قدیم رنگ غالب ہے۔ کنگھی چوٹی، گل و بلبل، رخ و کاکل و لب و دنداں کے مضامین کا والہ و شیفتہ معلوم ہوتا ہے۔ مشاعروں کی شرکت سے ہمیشہ محترز رہا لیکن اہل فہم کو اپنی غزلیں سنانے کا بے حد شوقین تھا۔ جہاں جاتا شعر و شاعری کا چرچا ضرور کرتا اور اپنا تازہ کلام پڑھ پڑھ کے سناتا۔ غزل پڑھتے وقت ایک کیفیت سی طاری رہتی جس سے اس کا دلی ذوق و شوق ظاہر ہوتا۔ خواجہ عشرت کی دکان پر (جسے شاعری کا مرکز کہنا بےجا نہیں) سخن سنجوں اور سخن فہموں کا جمگھٹا رہتا۔ اکثر تحقیق الفاظ اور شعر و شاعری کا ذکر جاری رہتا۔ خواجہ صاحب کے اخلاقِ حمیدہ نے شعرا کو گرویدہ کر لیا ہے۔ اب بھی روزانہ شام کو علم و ادب کے شائق جمع رہتے ہیں۔ خبیرؔ بھی جب چوک آتا تو خواجہ صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ خواجہ صاحب اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے توجہ سے کلام سنتے اور اچھے شعروں کی داد دیتے اور وہ شاد شاد مکان واپس جاتا۔ دس بارہ برس ہوئے فکرِ روزگار میں کانپور چلا گیا۔ ان دنوں وہاں طاعون کی کثرت تھی۔ روز سیکڑوں جانیں تلف ہو رہی تھی۔ خبیرؔ کی موت بھی اسے لکھنؤ سے لگا لے گئی تھی۔ کانپور پہنچتے ہی بخار میں مبتلا ہوا۔ چڈھے میں گلٹی نکل آئی اور اس وقت جب شہر میں موت کا بازار گرم ہو رہا تھا اس اُمّی شاعر نے ۵۰ برس سے زیادہ عمر پاکر غربت میں قضا کی۔ بڑی کوشش سے چند متفرق اشعار دستیاب ہوئے جو درج کیے جاتے ہیں۔

رنگ چوکھا ہے مری جان نہ پرہیز کرو — اپنی مہندی میں کرو خون بھی شامل میرا
زخم کہتے ہیں تڑپنے میں مزا آتا ہے — دل یہ ڈرتا ہے کہ ڈر جائے نہ قاتل میرا

خبیرؔ اک دن اٹھا لائیں گے اپنے دل کے ذرّوں کو
کسی دن تو گزر ہوگا زمین کوئے قاتل پر

لوٹتے سانپ کلیجے پہ عدو کے کیا کیا
گر مرے سوگ میں وہ بال پریشاں ہوتے
گلوں کا رنگ پڑ جاتا ہے پھیکا شرم کے مارے
اگر گلگشت کو سوئے چمن وہ جا نکلتا ہے

خلیفہ، اچھے

اچھے نام، خلیفہ تخلص۔ دہلی میں مو تراشی کا پیشہ کر کے بسر اوقات کرتا تھا۔ حد سے زیادہ ظریف الطبع وشگفتہ مزاج واقع ہوا تھا۔ ضلع جگت میں کافی مہارت تھی۔ کوئی کلام تلازمے سے خالی نہ ہوتا۔ انھیں ظرافتوں اور چلبلی طبیعت نے مرزا رفیع السودا کی طرح مزاج میں شعلہ خوئی پیدا کر دی تھی۔ ذرا ذرا سی کبیدگی میں ہجوئیں کہہ ڈالنا کوئی بات ہی نہ تھی۔ قوت نظم بہت بڑھی چڑھی تھی۔ اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کے نمونے پیش کرتا۔ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے کلام کا اکثر حصہ ضائع ہو جاتا۔ کسی کی عنایت و مہربانی سے جو کچھ لکھ گیا وہ محفوظ رہا۔ جو ضابطۂ تحریر میں نہ آسکا اور حافظے سے اتر گیا وہ تلف ہوا۔ بعض ان پڑھ شاعروں کی طرح اس کا حافظہ قوی نہ تھا۔ شعر نظم کر کے بہت جلد بھول جاتا، ہمیشہ صاف صاف کہتا، چونکہ ظریف تھا لہٰذا کلام میں بھی سید انشا کے مانند ظرافت کا عنصر غالب رہتا۔ شوخ طبیعت اپنی شرارت سے باز نہ رہتی۔ ایک مرتبہ کسی نامی پہلوان سے اَن بن ہو گئی۔ پہلوان کو اپنی تہمتنی اور بھرے بھرے بازوؤں پر گھمنڈ، خلیفہ کو طبع خدا ساز پر غرہ، پھر تو ایسی خبر لی کہ پہلوان صاحب کو اکھاڑے سے بھاگتے ہی بنی دو ہی انچھروں میں پہلوانی کے سارے کرتب فراموش ہو گئے۔ خلیفہ کی تصنیف کی ہوئی ہجو کے اشعار بچے بچے کی زبان پر تھے جو دہلی کے گلی کوچوں میں شور مچاتے پھرتے تھے۔

وہ زمانہ بہت دور نکل گیا۔ وہ ہجو نایاب ہو گئی۔ کوشش و تلاش سے چند شعر بھی حاصل نہ ہوئے کہ خلیفہ کی شوخیوں کا نمونہ پیش ہوتا۔ تذکروں میں صرف ایک شعر دیکھا گیا جو نقل ہوتا ہے:

اوندھا پڑے ہے نیچے سدا ہر جوان کے
تا لوگ یہ کہیں کہ کبھی چت ہوا نہیں

متین کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

سارے عالم کی آنکھ پڑتی ہے تیرا ابرو ہلال ہے گویا !!

خلیفہ مرمٹا آخر ادلئے خوبرویاں پر
جوانا مرگ ، مرنے کا بڑا ارمان رکھتا تھا
خلیفہ کو نہ ٹالو اے حسینو ایک بوسے پر
کیا تھا اور جو وعدہ اسے بھی اب وفا کردو
کچھ بھی خسرو کی خطا یا جرم شیریں کا نہ تھا
تو نے اپنی جان دی فرہاد اپنے ہاتھ سے

دلآور، دلاور علی

دلاور علی نام، دلاور تخلص ۔ والد کا نام بہادر علی تھا ۔ قصبہ آنولہ کے رہنے والے بڑے زندہ دل اور شگفتہ مزاج آدمی تھے ۔ آزادی کی ہوا دماغ میں بھری ہوئی تھی ۔ جب تک سر پہ باپ کا ظل عاطفت قائم رہا وطن میں مقیم رہے، ان کے مرتے ہی وطن کی سکونت ترک کردی ۔ عزیزو اقارب تھے ہی نہیں جن کی محبت دامن پکڑتی ۔ نیم پختہ مکان فروخت کرکے اطراف ہند میں سیاحت کرتے پھرے ۔ فن کشتی کے نہایت گرویدہ تھے اور اسے کامل سعی کے ساتھ پہلوانوں کی خدمت کرکے حاصل کیا تھا ۔ گٹھا ہوا ورزشی جسم، چہرے کے خط و خال دلکش، بڑے زور آور جوان تھے ۔ فن کشتی کی بدولت ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیر کی تھی، سنا جاتا ہے بڑے مضبوط اور گویا اسم بامسمیٰ تھے ۔ اوائل شباب سے مطلق العنان رہے جس نے بے اعتدالیوں کے راستے پر لاڈالا ۔ اول اول تو کچھ معلوم نہ ہوا ۔ آخر کار فطرت کا انتقام شروع ہوا ۔ جسمانی طاقت گھٹنے اور کمزوریاں زور پکڑنے لگیں ۔ رفتہ رفتہ مختلف امراض پیدا ہوئے، ہنوز شباب اپنی آخری منزلیں طے کرنے میں مصروف تھا کہ پہلوان قضا کا داؤں چل گیا اور دلآور نے ۳۵ یا ۴۰ سال کی عمر میں داعی اجل سے شکست قبول کرتے ہوئے گوشۂ قبر آباد کیا ۔

دلآور کو شاعری کا بہت شوق تھا مگر اس شوق کو قیام نہ تھا ۔ ہانڈی کے ابال کی طرح

جوشِ شباب سے کچھ کچھ نظم کر لیتے تھے۔ لہو و لعب میں پڑ جانے اور صغر سنی میں یتیم ہو جانے سے علمی تعلیم بالکل نہ ہو سکی، نہ پہلوانی کے سوا کوئی ہنر آیا۔ طبیعت کی موزونی سے گاہ گاہ کچھ موزوں کر لیتے کم گو تھے مگر کلام صاف ہوتا۔ نمونۂ سخن یہ ہے:-

تجھے خنجر بکف دیکھا تو اے قاتل خیال آیا
لہو ہوگا نہ کس کس کا ترے دستِ حنائی پر
گلہ شکوہ نہیں ہے، یہ تو باتیں ہیں محبت کی
ہوئے جاتے ہو کیوں برہم مرے دل کی صفائی پر
بھلا ناصح کسی کو سوجھتا ہے کچھ جوانی میں
نظر رہتی مری کیوں کر برائی پر بھلائی پر !
پلا دیتا ہے قسمیں دے کے وہ مے دست میں سے
بھلا زاہد! کوئی قائم رہے کیا پارسائی پر
دلاور نوجوانی میں نبھے گی کس طرح توبہ
تعجب ہوتا ہے رہ رہ کر تمھاری پارسائی پر

ذاکر، سیّد عشرت حسین

سید عشرت حسین نام 'ذاکر' تخلص' وطن کا حال دریافت نہ ہوا، شاید بلگرام یا اس کے قرب و جوار میں رہتے تھے۔ امامیہ مذہب کے پیرو' عزادارِ حسین تھے۔ ایک دفعہ ایامِ عزا اور زمانۂ اربعین میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ بڑے نیک و خوش مزاج، گورے چٹے، متوسط الاعضا، کشیدہ قامت آدمی تھے۔ محرم اور چہلم میں بعض مقامات پر ماتم کرنے جایا کرتے۔ تعزیہ خانوں میں گاہ گاہ اپنے تصنیف کیے ہوئے نوحے و سلام پڑھ کر ماتم کرتے اور خود روتے اور دوسروں کو رلا کر مثاب کرتے۔ اگر کسی نے نذرِ حسین سمجھ کر کچھ پیش کش کیا تو بہ طیب خاطر قبول کیا ورنہ ماتم سے فارغ ہو کر چپ چاپ چلے گئے۔

ان کے خاندان میں مدت سے یہ رسم جاری تھی کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی گھروں میں چولھے روشن

کرنا ترک کر دیا جاتا اور پورا عشرہ مجلس کے حصوں سے بسر ہوتا۔ ذاکر بھی سختی سے اس رسم کے پابند تھے اور مجلسوں میں شریک ہو کر اتنا تبرک جمع کر لیتے کہ خود کھاتے اور اپنے ساتھیوں یا فقیر فقرا کو تقسیم کر دیتے۔

شاید وطن میں کچھ زمین تھی جس میں زراعت کر کے بسر کرتے تھے سال بھر تک پیٹ کاٹ کاٹ کر پس انداز کرتے اور محرم میں کل اندوختہ حسین کے نام پر صرف کر دیتے۔ پڑھنا لکھنا بالکل نہ جانتے تھے۔ لیکن موزوں طبع تھے۔ جب جذبۂ شاعری پیدا ہوتا تو نوحہ، سلام یا منقبت تصنیف کرتے اور اسے نجات آخرت کا موجب تصور کرتے۔ غزلیں کہیں مگر بہت ہی کم اور شاذ شاذ۔ کلام جمع کرنے کا مطلق شوق نہ تھا۔ جب محرم یا شبیں[1] آنے والی ہوتیں تو نوحہ تصنیف کر کے حفظ کرتے اور جب زمانۂ عزا ختم ہوتا تو بدستور اپنے کاموں میں مشغول ہو کر بھول جاتے۔

جس زمانے میں مجھ سے ملاقات ہوئی تھی انھوں نے اپنی غزلوں کے متفرق اشعار سنائے تھے چند شعر پسند ہونے کی وجہ سے لکھ لیے تھے جو تذکرے میں شامل ہوئے۔ دس بارہ برس سے ان کا آنا نہیں ہوا نہ معلوم کہاں اور کس حال میں ہیں۔ زندہ ہیں یا عالم بقا کو سدھارے۔ کلام یہ ہے۔

ہر وقت خفا ہونا، ہر وقت برا کہنا
کی قدر وفا کیسی، ظالم ترا کیا کہنا
بے چین ہو دل ان کا، بیتابی دل سن کر
اس رنگ سے اے ذاکر قصہ نہ مرا کہنا

کچھ عنایت جو آپ کی ہوگی — زندگی میری زندگی ہوگی
یہ چمک ہے جو طور کی جانب — ان کے جلوے کی روشنی ہوگی
غم کے بدلے سرہانے ذاکر کے
لب جاں بخش پر ہنسی ہوگی

رضاؔ، نواب مرزا حسن رضا خاں

---

[1] زمانہ شہادت امیر المومنین علی ابن ابی طالب جو ۱۸ ماہ صیام سے شروع ہو کر ۲۱ تک رہتا ہے۔

سرفراز الدولہ نواب مرزا حسن رضا خاں، رضا تخلص لکھنؤ کے نامور رئیس اور امیر باذل گزرے ہیں۔ ان کے والد کا نام مرزا علی رضا تھا جو ہندوستان کی تاریخ میں کافی شہرت و امتیاز رکھتے ہیں۔ دادا مرزا جان سپار خاں جو شاہ جہاں، بادشاہ دہلی کے معتمد خاص اور مزاج میں کامل درخور رکھتے تھے۔

نواب سرفراز الدولہ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے مرزا علی رضا خاں کے کاشانۂ راحت میں پیدا ہوئے لیکن منجھلے چچا محمد ابراہیم خاں کے یہاں پرورش پائی۔ وہ انھیں بمنزلہ جان و روح سمجھتے تھے۔ یہی چاہ پیار مرزا حسن رضا خاں کی بے علمی کا موجب ہوا۔ بچپن میں کسی کو لکھنے پڑھنے کا شوق نہیں ہوتا۔ بچوں کے اتالیق و نگران حال حکمت عملی سے کام لے کر ان کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ لیکن محمد ابراہیم خاں نے فرط محبت سے انھیں ان کی خوشی پر چھوڑ دیا جس کی بدولت یہ ایک حرف بھی نہ پڑھ سکے۔ مگر اہل علم کی صحبت نے فارسی بولنے اور سمجھنے کی قدرت پیدا کر دی تھی۔ اہل فارس کی طرح بے تکلف فارسی زبان میں گفت و شنید کر سکتے تھے۔ مبداء فیاض نے نعمت ہائے اقبال و مراتب اور دنیوی جاہ و ثروت، دولت و حشمت سے مالامال کیا تھا۔ جب تک زندہ رہے ہزارہا آدمیوں کی پرورش کرتے رہے۔ ان کے عروج کو سلطنت اودھ میں جتنا قیام نصیب ہوا کسی اور امیر کو یہ بات حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کے عہد معدلت مہد سے ترقیاں شروع ہو کر عہد بہ عہد جاری رہیں اور اس وقت تک منقطع نہ ہوئیں جب تک ہوائے مرگ نے ان کا چراغ زندگی گل نہ کر دیا۔ ابتدا میں انھیں داروغگی باورچی خانہ توشہ خانہ اور دیوان خانہ عنایت ہوئی جو اس زمانے میں نہایت معزز و موقر عہدے سمجھے جاتے تھے۔ جب نواب آصف الدولہ سا سخی اور باذل نواب سریر آرائے حکومت ہوا تو قرعہ انداز ازل نے ان کے نام قرعہ نیابت ڈالا، اگرچہ امی تھے اور انتہا یہ ہے کہ شین و پے میں فرق نہ کر سکتے تھے چنانچہ مشہور ہے کہ کسی خوش نویس نے صلہ اور انعام کی طمع میں فارسی کا ایک قطعہ نہایت حسن و خوبی سے بخط نستعلیق لکھ کر بطور نذر نواب کے حضور میں پیش کش کیا۔ یہ سخی تو تھے ہی بہت خوش ہوئے اُس کی امید سے دوچند انعام و اکرام عطا کیا مزید عنایت یہ فرمائی کہ ازراہ حوصلہ افزائی و قدر دانی تعریف و توصیف کرتے ہوئے فرمایا پے کے نقطے بہت خوب ہیں، جسے پے کے نقطے کہا

تھا وہ حقیقتاً شین کے نقطے تھے۔ باوجود اس بے علمی کے بھی نواب آصف الدولہ نے مسٹر جان برسٹو رزیڈنٹ اودھ کے مشورے سے انھیں خلعت نیابت سے بلند و سرفراز فرمایا اور کاروبار کی میں مدد دینے کے واسطے نواب حیدر بیگ خاں کو خطاب امیر الدولہ عنایت کرکے نواب حسن رضا خاں کا پیش دست مقرر کیا اور راجہ ٹکیت رائے کو خلعت دیوانی بخشا گیا۔

نواب حسن رضا خاں صفات شریفانہ اور اوصاف امیرانہ سے آراستہ تھے۔ نہایت فیاض منش، جود و کرم کا یہ عالم کہ ہمہ وقت ہزارہا حاجت مند ڈیوڑھی پر حاضر رہتے اور نواب کے خوان کرم سے اپنا آزوقہ بہم پہنچاتے۔ غریبوں اور محتاجوں کی کافی و وافی امداد و خبر گیری کی جاتی۔ کم و بیش دس ہزار آدمی مستقل طور سے اس سرکار فیض آثار سے زلہ خوار تھے۔

نواب حسن رضا خاں کو مذہب میں نہایت غلو تھا حضرات اہل بیت علیہم السلام سے بے حد حسن عقیدت رکھتے تھے۔ چہاردہ معصومین کے نام پر فدا تھے۔ زمانہ محرم میں عزائے حسین کا سامان بڑے تزک و احتشام سے ہوتا۔ لنگر خانے جاری کیے جاتے۔ غربا و مساکین پر تقسیم کا سلسلہ جاری رہتا۔ مسجدوں، کربلاؤں، امام باڑوں میں کثرت سے نذر و نیاز ادا کی جاتی۔ خود ان کی تعمیر کی ہوئی بعض عمارتیں اب تک ان کی امارت و ثروت کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ انھیں کی سعی جمیلہ سے قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مولانا سید دلدار علی صاحب نے مذہب امامیہ کی فقہی کتابیں تصنیف و تالیف کرکے شائع کیں جو مومنین کے واسطے مشعل راہ ہدایت بنیں اور بعض منہیات شرعی کا ازالہ ہوا جو اس وقت لاعلمی کی وجہ سے عوام میں پھیلی ہوئی تھیں۔ نواب نے صرف یہیں تک فیض کا سلسلہ نہیں رکھا بلکہ اکثر ہندی نژاد عالموں کو عتبات عالیات روانہ کیا جو علمائے عراق و حجاز سے اجازہ لے کر واپس آئے اور ان کے گھروں سے علوم کے چشمے جاری ہو کر اہل ہند کو سیراب کرنے لگے۔ وہ زمانہ گزر گیا مگر آج تک ان کا فیض عام جاری ہے۔

نواب بے انتہا بات کے پکے اور قول کے دھنی تھے۔ کوئی وعدہ کر لیتے تو وہ پتھر کی لکیر ہو جاتا۔ ایک دفعہ نواب آصف الدولہ کے حضور میں راجا ٹکیت رائے نے پچھتر لاکھ کی فرد حساب پیش کی۔ نواب آصف الدولہ نے راجا جھاؤلال کو حساب سمجھنے کا حکم دیا۔ انھوں نے ب پینسٹھ لاکھ کا غبن نکالا اور راجا ٹکیت رائے پر عتاب آصفی نازل ہوا۔ عالم اضطراب و سراسیمگی

میں راجا موصوف کو بجز آستانہ نواب حسن رضا خاں کے کوئی امن و عافیت کا ٹھکانا نظر نہ آیا۔ حیران و پریشان، مضطرب و بدحواس نواب کے محل کی طرف بھاگے۔ شام کا وقت تھا، نواب نماز مغرب سے فارغ ہو کر زیارت پڑھنے میں مصروف تھے۔ انگشت شہادت قبر مطہر امام مظلوم کی جانب بلند تھی کہ راجا نے دوڑ کر قدموں پہ سر رکھ دیا۔ ادھر نواب نے زیارت ختم کی، ادھر راجا نے گڑگڑا گڑگڑا کر عرض کی کہ میری عزت اور جان و مال کا تحفظ حضور کی چشم عنایت پر منحصر ہے۔ نواب نے واقعہ دریافت کیا۔ انھوں نے تفصیلی حالات گوش گزار کیے اور ممکن طریقے سے نواب کو رحم و کرم کی طرف مائل کیا۔ نواب نہایت رحیم النفس و کریم الطبع واقع ہوئے تھے۔ راجا ٹکیت رائے کے حال پر ترس آ گیا۔ تحفظ جان و مال اور حفظ مراتب کا وعدہ کرتے ہوئے یقین دلا دیا کہ "میں تمھارے سوا کسی کو اپنی پیش دستی میں قبول نہ کروں گا" اور اس وعدے پر تا مقدور قائم رہے۔ جب نواب آصف الدولہ کو معلوم ہوا کہ نواب حسن رضا خاں راجا ٹکیت رائے کی پچ پر ہیں تو انھیں بلا کر فرمایا کہ نواب بھائی! ایسے کو نمک کا رکھنا مناسب نہیں آپ راجا جھاؤلال کو اپنی پیش دستی میں قبول کیجیے یہ نہایت متدین اور ایمان دار آدمی ہے۔ نواب حسن رضا خاں نے منظور نہ کیا اور صاف کہہ دیا کہ جناب عالی اس معاملے میں اصرار نہ فرمائیں۔ میں نے راجا ٹکیت رائے سے وعدہ کر لیا ہے اور اس سے انحراف ممکن نہیں۔ یہ جواب نواب آصف الدولہ کے دل میں جم گیا۔ اگرچہ اس وقت کچھ نہ کہا مگر بعد میں یہی خلش باعث تکدر طبع ہوئی اور مولانا تفضل حسین خاں کو خلعت نیابت دیا گیا۔ اور نواب حسن رضا خاں نام کو وزیر رہ گئے۔ پھر بھی بیس سال تک اس عظیم المرتبت عہدے پر سرفراز رہے۔

انھوں نے اسی عہد آصفی میں نواب آصف الدولہ کے حکم سے کلکتے کا سفر کیا تھا جو سنہ ۱۲۰۷ھ یکم ماہ شوال سے شروع ہو کر سنہ ۱۲۰۸ھ جمادی الآخر میں نو مہینے کے بعد ختم ہوا۔ سبب یہ تھا کہ گورنر جنرل لارڈ کارنوالس خدمت سے سبکدوش ہو کر ولایت جا رہے تھے اور ان کی جگہ سر جان شور آنے والے تھے۔ ایک کو رخصت اور دوسرے کا خیر مقدم کرنا تھا۔ اس سفر کی شان و شوکت، جاہ و تجمل اور کر و فر اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرہ بیس ہزار کی جمعیت،

توپیں اور دو انگریزی کمپنیاں ہم رکاب تھیں - راجا ٹکیت رائے بھی جلو میں حاضر تھے - جدھر سے گذر ہوتا اتنی داد دہش کرتے کہ غربا و مساکین مالامال ہو جاتے - بنارس و عظیم آباد میں بھی کچھ چھدن قیام کیا، وہاں کے شرفا کو خلعتہائے فاخرہ اور محتاجین کو روپے تقسیم کر کے عازم مرشد آباد ہوئے۔ عشرۂ محرم یہیں بسر کیا۔ دھوم دھام سے مجلسیں منعقد کیں، لنگر خانے جاری کیے۔ عشرۂ محرم گذرنے کے بعد کلکتے پہنچے اور شہر سے باہر پڑاؤ ڈالا - لارڈ کارنوالس سے اکثر دوستانہ ملاقاتیں ہوئیں، انھوں نے نواب آصف الدولہ کی طرف سے تحفے تحائف پیش کیے، انھوں نے سرکار کمپنی کی طرف سے خلعتہائے مکلف عنایت کیے - اُن کے ولایت جانے کے بعد سر جان شور سے بھی شرف ملاقات حاصل کر کے عظیم آباد ہوتے ہوئے اودھ میں داخل ہوئے - پندرہ لاکھ سے کچھ زیادہ صرف ہوا -

جب سنہ ۱۲۱۲ھ میں نواب آصف الدولہ نے وفات پائی اور نواب وزیر علی خاں کے مختصر دورِ حکمرانی کا آغاز ہوا، اس عہد میں بھی نواب حسن رضا خاں کے اعزاز و اقتدار میں فرق نہیں پڑا، سابق کے مانند خلعتہائے گراں بہا سے ممتاز ہوئے - مگر اس دور کو قیام نہ ہوا۔ ہوا کے جھونکے کی طرح آیا اور نکل گیا - نواب وزیر علی خاں کے عزل کے بعد نواب سعادت علی خاں کی مسند نشینی عمل میں آئی - اصولوں میں بہت کچھ تبدیلیاں واقع ہوئیں لیکن نواب حسن رضا خاں بدستور اپنے عہدے پر قائم رہے - نواب موجودہ نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح خلعتِ نیابت سے سربلند فرمایا اور انھوں نے بھی اپنے پرانے عہد سے روگردانی نہ کی - پیش دستی کی خدمت راجا ٹکیت رائے کے سپرد کی - چونکہ نواب سعادت علی خاں کو امور ملکی و مالی کے انتظام و انصرام میں کمال دل چسپی تھی، کل کام اپنے ہاتھوں انجام دیتے تھے - نواب حسن رضا خاں تو اُمّی محض تھے ہی، جب نواب نے ان سے کوئی کاغذ دریافت کیا تو انھیں جواب دینے میں تامل ہوا اور کاموں کی تکمیل میں تاخیر ہوئی، نواب سعادت علی خاں کو جزبز ہونا پڑا - انھوں نے وقتاً فوقتاً رزیڈنٹ سے کہا بھی کہ "جس ریاست کا نائب جاہل ہو اس ریاست کا کام دقت سے خالی نہیں"۔ مگر اس خاندان پر ابتدا سے سرکار اودھ کی عنایتیں مبذول تھیں لہٰذا عہدے سے معزول نہ کیا - پھر بھی نواب آصف الدولہ کے عہد کی سی آسائشیں نہ رہیں۔ اس عہد میں حاضری اور درباداری معاف تھی - جی میں آیا تو مجرے کو حاضر ہوئے ورنہ گھر

ہی میں استراحت کی اور اب بغیر حاضر ہوئے چارہ ہی نہ تھا۔ صبح کو جب تک نواب حسن رضا خاں نہ پہنچ جائیں، نواب کے حضور میں کسی امیر کا مجرا قبول نہ ہوتا۔ چوں کہ یہ لحیم شحیم آدمی تھے اپنے مکان میں نرم و گداز صوفے پر بیٹھ کر خدمات منصبی انجام دیتے لیکن اب نواب سعادت علی خاں کے سامنے گھنٹوں کھڑے ہو کر ایک ایک کاغذ ملاحظہ کے لیے پیش کرنا پڑتا بطرہ یہ کہ جو وقت ان کی استراحت کا تھا وہی وقت نواب سعادت علی خاں کے کاغذات ملاحظہ کرنے کا مقرر ہوا جس سے اوقات معینہ میں فرق پڑا اور عادات بدلنے سے صحت بگڑ چلی۔ نواب سعادت علی خاں کی بے حد عنایتیں عذاب جاں ہو گئیں۔ وہ جب ہوا کھانے نکلتے تو انھیں خواصی میں ساتھ لیتے۔ ان کے واسطے ہاتھی پر جو ہودہ کسا جاتا وہ نہایت مختصر ہوتا جس میں بیٹھنا کیا ہوتا گویا انھیں شکنجے میں کس دیا جاتا۔ انھوں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ بلطائف الحیل علاحدہ ہو جائیں مگر ممکن نہ ہوا۔ سن بھی آچکا تھا۔ بچپن اور جوانی تو آسائش و آرام میں بسر ہوئی لیکن عالم پیری میں محنت و مشقت کا سامنا ہوا انجام کار مرض موت میں مبتلا ہوئے اور بعہد نواب سعادت علی خاں ایک فرزند نرینہ مسمی نواب محمد رضا خاں چھوڑ کر سنہ ۱۲۱۶ھ میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

نواب حسن رضا خاں خود تو شعر کہنے کے زیادہ عادی نہ تھے مگر شاعروں کی قدردانی اور عزت افزائی میں بالکل کمی نہ کرتے تھے۔ اکثر شعرائے وقت ان کے خوان یغما سے مستفیض و مستمند ہوتے تھے۔ چنانچہ مشہور و معروف شاعر میر غلام حسن حسنؔ صاحب بے نظیر و بدر منیر بھی مدت تک ان کی سرکار میں حاضر ہوتے رہے۔ کبھی کبھی طبیعت حاضر ہوتی تو دو چار شعر موزوں کر لیا کرتے۔ اصلاح کا حال معلوم نہیں۔ غالباً کسی استاد وقت سے مشورہ کرتے ہوں گے ایک قدیم بیاض کے شکستہ و دیمک خوردہ ورق پر ان کے نام سے تین شعر نظر آئے جو درج تذکرہ ہیں۔

ٹپک رہی ہے ہواؤں سے کچھ عجب مستی
چمن میں آج مقرر کوئی شرابی ہے
وہ کل کی طرح نہ آئیں گے آج بھی ہمدم
کہ آپی آپ مرے دل کو اضطرابی ہے
رضاؔ کی نعش خبردار اسے لحد کی زمیں
اسے فشار نہ دینا کہ بو ترابی ہے!

ریاضت، اسلام علی

اسلام علی نام ریاضت تخلص ولد عبداللہ لکھنؤ کا باشندہ اور ان پڑھ شاعر اور سید آغا حسن امانت کا غلام و خانہ زاد تھا۔ امانت مرحوم اپنے عہد کے نہایت مشہور شاعر اور اساتذۂ فن میں داخل ہیں۔ ان کی شہرت کسی بیان کی محتاج نہیں۔ ریاضت نے نامور و کہنہ مشق شاعر (امانت) کے گھر میں پرورش پائی۔ بچپن سے شعر و شاعری کے چرچے سنتے سنتے طبیعت میں موزونی پیدا ہوگئی اور ذہن میں کچھ کچھ مضمون پیدا ہونے لگے جو کبھی کبھی نظم کی صورت میں منتقل ہوا کرتے۔ اول اول تو ریاضت کو اشعار سنانے میں جھجک سی رہی پھر رفتہ رفتہ گھٹنے لگی اور ایک روز جرأت کر کے امانت مرحوم کی خدمت میں اصلاح کلام کی خواہش پیش کی۔ امانت مرحوم نے مسکرا کر کلام سنانے کا حکم دیا۔ ریاضت نے ڈرتے ہوئے نو تصنیف غزل کے اشعار پڑھے۔ انھوں نے طبیعت کا اندازہ کرتے ہوئے ہمت افزائی کی اور شعروں کو اصلاح سے مزین کر دیا۔ چونکہ اسلام علی محنتی آدمی تھا شاید اسی رعایت سے ریاضت تخلص تجویز ہوا اس روز سے ریاضت کی مشق سخن باقاعدہ جاری ہوگئی۔ امانت مرحوم کی ملاقات کو جو شعرا تشریف لاتے، وہ ریاضت کا کلام بھی ضرور سنتے اور اس کی ریاضت کی داد دیتے۔ تذکرۂ سراپائے سخن میں ایک غزل مرقوم ہے جو اس جگہ نقل ہوتی ہے۔

آئے نظر نہ اُس صنمِ مہ لقا کے ہاتھ　　کب کی دعا نہ جانبِ قبلہ اٹھا کے ہاتھ
حسرت سے پس کے ہوگیا دل میرا پائمال　　اُس شوخ نے دکھائے جو مہندی لگا کے ہاتھ
محفل میں خوں رقیب کا حسرت سے گھٹ گیا　　میں نے لیے گلے جو لگایا بڑھا کے ہاتھ
دیکھی جو نبض عشق کا بیمار بچ گیا　　اے غیرتِ مسیح ترے ہیں شفا کے ہاتھ
دو چار قتل ہوئیں گے اک آن میں دلا　　تلوار وہ جو میان سے نکالے بڑھا کے ہاتھ

پابندِ صبر رہ، نہ ریاضت ہو ناامید
عقدہ ہے دل کا ناخنِ مشکل کشا کے ہاتھ

زر، شیخ بلاقی

شیخ بلاقی نام زر تخلص باشندۂ لاہور سنہ ۱۸۱۴ء میں شیخ سعداللہ کے یہاں پیدا ہوئے شیخ سعداللہ اصل میں لاہور کے رہنے والے تھے لیکن بسلسلۂ معاش آگرے میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور سادہ کاری کا کام کر کے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا رزق حاصل کرتے تھے۔ جس طرح انھوں نے اپنے والد سے خاندانی کام حاصل کیا تھا اسی طرح اپنے نورِ نظر کو بھی آٹھ نو برس کی عمر سے سادہ کاری کے کام پر لگا دیا تیمناً یا رسماً معمولی طریقے سے کلام اللہ شریف پڑھا دیا اور پوری توجہ آبائی پیشے (سادہ کاری) کی طرف رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ بلاقی کو زرگری میں تو خاصی مہارت ہوگئی مگر لکھنا پڑھنا نہ آیا۔ علمی استعداد اتنی ضرور تھی کہ اپنے نام کے دستخط کرلیں یا ہندسہ لکھ پڑھ سکیں۔

اُن دنوں اردو شاعری کا رواج ترقی پذیر ہو رہا تھا، کسی طبقے کا کوئی فرد شاذ و نادر ہی اس شوق سے خالی ہو لہٰذا ہو لئے شاعری نے شیخ بلاقی کے دماغ میں بھی بار پایا اور نظم کا شوق چرایا اشعار تصنیف کیے بقول آتش:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

بندش الفاظ چست، مضمون شگفتہ اور تخیل پاکیزہ ہوتی۔ آگرے میں ان دنوں حاتم علی مہر کا قیام تھا۔ شاگردوں کی بہتات، عوام میں شہرت اور خواص میں ان کی شاعری ممتاز تصور کی جاتی تھی۔ شیخ بلاقی بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اصلاح کی خواہش کی، کلام سنایا اور شاگرد ہوئے۔ مہر مرحوم کی اصلاح نے ان کے کلام میں اور جگمگاہٹ پیدا کردی، مقامی مشاعروں میں استاد کے ساتھ شریک ہو کر دادِ خوش کلامی دیتے تھے۔ اب ان کی گل افشانی ملاحظہ ہو:

دل میں، جگر میں، سینے میں، یکساں ہے درد آج
اے چارہ گر بتاؤں کدھر کم کدھر بہت

کبک وطوطی میں کچھ کمال نہیں ان میں تیری سی بول چال نہیں

سنگ دل بے رحم بھی اتنا نہ ہو کوئی مرجائے تجھے پروا نہ ہو

پھنسی ہے مو بمو جانِ حزیں زلفوں کے پھندے میں
اسیرانِ خمِ کاکل گرفتارِ بلا ٹھیرے

کون سی صورت ہے ملنے کی بتوں سے یہ بتا
وہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

سردار، سردار بیگم

سردار بیگم نام، سردار تخلص، لکھنؤ کی رہنے والی تھیں اور ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد بیوہ ہو کر پہلے کانپور پھر قنوج چلی گئیں۔ چند روز کے بعد طبیعت اچاٹ ہوئی اور قنوج کی سکونت ترک کر کے اٹاوہ آئیں اور وہیں ساری عمر بسر کر دی۔ اگرچہ شریف تھیں لیکن نہ معلوم کیا افتاد پڑی کہ اپنی بیٹی کاظمی بیگم کو ناچ گانے کی تعلیم دینا شروع کی اور با قاعدہ طوائف بن کر تمام وہ باتیں اختیار کر لیں جو بازاری عورتیں کر سکتی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود بالکل ناخواندہ تھیں مگر موزونیٔ طبع کی بدولت شعر کہتی تھیں۔ چونکہ خود لکھ نہ سکتی تھیں اس لیے اپنے تصنیف کیے ہوئے اشعار دوسروں سے لکھوا لیتی تھیں۔ ایک مرتبہ کسی شخص کے ساتھ دہلی گئی تھیں۔ مصنف تذکرۂ چمن انداز لکھتے ہیں:

"یہ ایک نہایت ہی بات کی پکی اور سچی عورت تھی اور جو کچھ زبان سے کہہ دیتی تھی اس کو ہمیشہ پورا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ کچھ نہ کچھ اس آوارگی میں بھی شرافت

کی بو اُس میں موجود تھی۔

یہ اشعار اس کے طبع زاد ہیں :

لگایا میں نے جو تم سے دل کو، تمھارے دل سے نہاں نہ ہوگا
اٹھائے صدمے ہیں جتنے میں نے، جہاں میں کس پہ عیاں نہ ہوگا

ہے خوف مجھ کو اکیلے گھر کا، کہ ہوگا واں پہ گزار کیوں کر
مدد کو میری جو لطفِ یزداں ندیم و ہمدم وہاں نہ ہوگا

لگایا گل سے جو دل کو تو نے، سمجھ لے دل میں یہ اپنے بلبل
ہیں چند روزہ بہار کے دن، یہ گل تو روزِ خزاں نہ ہوگا

بہت کتابیں پڑھی ہیں تم نے، یہ مانا ہم نے بھی شیخ صاحب
چھپاؤ ہم سے نہ حالِ دل کو، نہاں یہ عشقِ بتاں نہ ہوگا

یہ کیا ہے سرؔدار تجھ کو وحشت، شفیع ہوں گے رسولِ داور
جو زلزلے سے بروزِ محشر زمیں نہ ہوگی زماں نہ ہوگا

وہ تو ہمارے لے گئے بیٹھے بٹھائے دل　　ہرگز نہ کوئی آپ سے اپنا پھنسائے دل
آتی نہیں ہے نیند شبِ ہجر میں مجھے　　ہے کوئی ایسا؟ اس سے مرا پھیر لائے دل
فریاد کر رہا ہوں میں گھڑیال کی طرح　　یارب وہ خود جلے جو ہمارا جلائے دل
بے جرم مجھ کو یار نے مارا ہے دوستو　　اب دل ہی دل میں کہتا ہوں فریاد ہائے دل

سرؔدار روزِ حشر کو اٹھ کر کہے گی یہ
عاشق کہاں سے سنگ کا اپنا بنائے دل

دل مرا اٹھ گیا زمانے سے　　موت آئے کسی بہانے سے

نہ لگی پھر آنکھ سحر تلک مجھے یاد اپنی دلا گئے
مرے پاس سے وہ چلے گئے مرے دل کو لے کے ہلا گئے

بیاں میں کیا کروں تم سے نہایت بے قراری ہے
پھنسا ہے دل مرا اس سے مجھے اب زیست بھاری ہے
کڑی منزل بہت ہے یہ مجھے اب زیست بھاری ہے
وہاں کیوں کر گزر ہوگا یہاں اب اشک باری ہے
اندھیری گور ہوئے گی نہ کوئی دوسرا ہوگا!
ملے گا وہ صنم کیوں کر مجھے اب انتظاری ہے
فرشتے آکے پوچھیں گے، کہو سردار سوتی ہو
پڑھو کلمہ محمد کا چلو اب فضلِ باری ہے

سکندر، خلیفہ محمد علی

خلیفہ محمد علی عرف گھسیا، سکندر تخلص، پنجاب کے باشندے اور ناجی کے شاگرد تھے۔ جب دہلی اہل کمال سے خالی ہونا شروع ہوئی تو یہ بھی اس عہد کے خوش فکر شعرا کی طرح اودھ چلے آئے اور صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ سلیمان بن شاہ عالم آفتاب کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئے جہاں اساتذۂ وقت کا جمگھٹا تھا اور فراغبالی سے دن بسر کرنے لگے۔

جب سنہ ۱۲۹۲ھ میں میر غلام حسن حسن صاحبِ "بے نظیر و بدر منیر" نے اپنا تذکرہ ترتیب دینے کا آغاز کیا، اس وقت میاں سکندر زندہ و سلامت موجود تھے اور میر ضاحک، مرزا رفیع السودا، شیخ مصحفی، فاخر مکین وغیرہم کے معرکوں میں شریک ہوتے تھے۔ بڑے آزاد منش اور رند مشرب تھے۔ مے نوشی کے شائق اور اکثر بدمست ولا یعقل رہا کرتے۔ اس عادت نے انھیں شرفا کی نگاہوں میں سبک کر رکھا تھا مگر انھوں نے کبھی پروا نہ کی۔ ان کی حریت پسند طبیعت نے انھیں سوسائٹی کی رسوم و قیود سے مطلقاً آزاد کر دیا تھا۔ انھوں نے ساری عمر رندی اور شاہد پرستی میں بسر کر دی۔

مرثیہ گوشاعر تھے۔ ریختہ کے علاوہ پنجابی، پوربی، مارواڑی زبانوں پر بھی پوری

پوری قدرت حاصل تھی اور نہایت شستگی سے مراثی منظوم کر کے ہر سہ زبانوں کے شائقین کی تشنگیِ ذوق فرو کرتے ۔ ان کے ایک زندۂ جاوید مرثیے نے جو شہرت و قبولیت حاصل کی وہ کسی مرثیہ گو شاعر کی تصنیف کو حاصل نہ ہوئی ۔ ہر چند اس مرثیے کو تصنیف ہوئے مدت گزری زمانہ بہت کچھ آگے بڑھ آیا، حسنِ ادا اور طرزِ بیان میں بین فرق ہو گیا، میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے میدانِ مرثیہ گوئی صد درجہ وسیع کر دیا، لیکن اب تک کوئی شہر کوئی قریہ ایسا نہیں جہاں عزاداری ہوتی ہو اور میاں سکندر کا یہ مشہور و معروف مرثیہ :

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول

نہ پڑھا جاتا ہو ۔

یہ اگرچہ علم کی طرف سے بے نصیب تھے مگر بلا کا ذہن پایا تھا ۔ قصہ خوانی و لطیفہ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا امیروں کی محفلیں ، ادبا کی صحبتیں ان کی بذلہ سنجیوں سے گونجا کرتیں ۔ اگرچہ ان کی رندانہ زندگی ان کے وقار کی دشمن تھی پھر بھی بعض اوصاف اچھی سوسائٹی میں بار آور کر دیتے ۔ عرق کشی کی مہارت بدرجہ غایت تھی اور اس فن میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے ۔

دو منظوم قصے " ملاح و ماہی " اور " بادشاہ دل خوار " بھی تصنیف کیے تھے ۔ جن پر قبولیت کے پھول کھلا اور ہوئے ۔ کتب خانہ فصاحت نے اپنی الماریوں کی زینت بڑھائی اور خاص و عام کی دل بستگی ہوئی ۔ میر حسن نے دونوں قصوں کی تعریف میں گل فشانی کی ہے ۔ مگر اب ان قصوں کو افسانوں سے زیادہ وقعت حاصل نہیں ۔ امتدادِ زمانہ نے ان کے اوراق منتشر کر دیے اور حادثاتِ سموم نے کچھ ایسا غائب کیا کہ ہم تک بجز نام کے ان کی ایک بیت بھی نہ پہنچ سکی ۔

انھیں غزل گوئی کا شوق بہت کم تھا ۔ مرثیوں کو نجاتِ آخرت کا ذریعہ تصور کرتے اور ان کی تصنیف میں قوتِ شاعری صرف کرتے تھے ۔ کبھی کبھی احباب کے اصرار اور تقاضے سے عاشقانہ کلام کی طرف متوجہ ہو جاتے ۔ خدا ساز طبیعت اپنے جوہر دکھاتی اور یہ چمنستانِ سخن میں لطیف و رنگین گل کھلاتے ۔ میر حسن سا نقادِ فن ان کے کمالِ شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہے

"اگرچہ علم ندارد ولیکن بخوبی کلام او جائے انگشت نیست"

پرانے شاعروں کی طرح ایہام گوئی اور بعض صنعتوں کے نہایت شائق تھے اور انھیں اپنے کلام میں بڑے حسن سے صرف کرتے تھے جیسا کہ میر حسن کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

"گاہ گاہ بطرز قدیم شعری گوید طبعش مائل ایہام بسیار است"

ان کی تصنیف سے جو اشعار دستیاب ہوئے وہ یہ ہیں:

کیا کماں ابرو نے اک تیر نظارا مارا — جس کے لگتے ہی جگر ہو گیا پارا پارا[1]
کیا تجھے اور نہ تھا ہستی کے جنگل میں شکار — مرغ دل تو نے جو صیاد ہمارا مارا
رات تنہائی میں آیا تھا تصور تیرا — ذکر تیرا ہی کیا، آہ کا نعرا مارا
ہم نے پھینکی تھی کلی اس کی طرف لالے کی — اس نے شوخی سے ہمیں پھول ہزارا مارا
غیر کیا چیز ہے محفل سے اٹھا دوں پل میں — کیا کہوں، کہہ نہیں سکتا میں تمھارا مارا
عشق بازی کے لیے ہم نے بچھائی چوسر — پانسہ گرتے ہی گیا رنگ ہمارا مارا

ہیچ دنیا کے لیے کچھ نہ سکندر نے کیا
آپ کے روز جیا، کس لیے دارا مارا

نہ دیکھا ہو جو کسی نے حباب میں دریا
وہ دیکھ لے مری چشم پر آب میں دریا

جو دھو کر داغ دل سب پاک کیجے — تو جاری دیدۂ نم ناک کیجے
جلا جو آتش غم سے سراپا — علاج اس کا پھر اب کیا خاک کیجے

سحر گزرا چمن سے کونسا خورشید رو یارب — کہ شبنم گل کے منہ میں اب تلک پانی چھڑاتی ہے

---

[1] مطلع کے دوسرے مصرع کی ردیف غلط ہے مگر یہ مصرع جہاں جہاں دیکھا گیا اسی طرح نظر آیا۔

سلیم، سلیم اللہ

ان کا نام سلیم اللہ ہے بنواح ڈھاکہ میں پیدا ہوئے اور کلکتے میں زندگی بسر کی۔ لکھنے پڑھنے کا بالکل شوق نہ تھا۔ مگر نہایت ذہین وطباع تھے۔ لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی میں کمال حاصل تھا۔ احباب کی پرکیف صحبتیں ان کے بامذاق چٹکلوں سے زعفران زار بنی رہتیں۔ جس بزم میں جا بیٹھتے وہاں کے لوگ ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاتے اور مزا یہ کہ ان کے لبوں پر ہنسی تو ہنسی تبسم تک کا نام نہ ہوتا۔

شاعری کا شوق بھی خاصا تھا۔ شعر کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ عجب تو یہ ہے کہ ان پڑھ اور ڈھاکہ کے رہنے والے تھے جہاں اردو زبان وہ زبان نہیں جو دہلی و لکھنؤ میں بولی جاتی ہے، مگر ان کے دستیاب شدہ اشعار نہایت صاف اور سلیس ہیں۔ ان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ کسی زبان داں کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔ رنگ سخن اہل لکھنؤ سے ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیم کی اصلاح سخن کسی لکھنوی شاعر سے متعلق ہوگی۔

سلیم کسی چیز کی دلالی کرتے اور اسی پیشے کی بدولت ہندوستان کے مشہور ممالک اور تجارت کی بڑی بڑی منڈیوں کی سیر کر چکے تھے۔ رنگون کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا اور کم سے کم سال میں ایک پھیرا ضرور ہو جاتا۔ ان سفروں نے ان میں عزائم کی پختگی اور جفاکشی کی عادت پیدا کر دی تھی۔ کام سے کبھی عاری نہ ہوتے بعض اوقات صبح سے شام تک کام میں مصروف رہتے۔ چونکہ یار باش آدمی تھے فرائض سے سبک دوش ہوتے ہی دوستوں میں جا پہنچتے اور ان کے ساتھ تفریحی اشغال میں مصروف رہتے۔ یہاں تک کہ ساری رات یونہی بسر ہو جاتی۔ صبح سے پھر حسب معمول کاروبار میں جا لگتے۔ اور کبھی چہرے سے شکستگی یا تھکن ظاہر نہ ہوتی۔ موسیقی کا بہت شوق تھا۔ مشہور گانے والوں سے ضرور ربط و ضبط پیدا کرتے تخلیہ کی صحبتوں میں خود بھی گاتے۔ ہارمونیم خوب بجاتے تھے۔ بیس پچیس برس ہوئے انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے:

پڑھ نہیں سکتے سر نوشت اپنی   ستیاناس ہو جہالت کا !!
جی بچیں گے جو ان کے آزاری   نام لیں گے نہ پھر محبت کا

آسماں[1] مدعی زمیں دشمن		کچھ ٹھکانا ہے اس مصیبت کا
چشم امید کیا رکھے کوئی!		رنگ دیکھا ہے تیری صحبت کا
پھر گریباں ہے اور تسلیم کا ہاتھ
جوش پھر بڑھ چلا ہے وحشت کا

شفق، دولت رائے

دولت رائے نام شفقؔ تخلص، قوم کا مالی اور دہلی میں گل فروشی کی دوکان کرتا تھا۔ سخن سنجان دہلی کے فیضان سخن نے شاعر بنا دیا۔ کھلے ہوئے پھول کی طرح طبیعت شگفتہ پائی تھی اس کے اشعار میں بعض جگہ فارسی کی ترکیبیں پائی جاتی ہیں جس سے کلام پر پڑھے لکھے کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں، شفقؔ کو علم سے بالکل بہرہ نہ تھا۔ ازبسکہ شاہانِ مغلیہ کا آخری دور تھا، دفاتر کی زبان فارسی، بول چال میں بھی ترکی اور فارسی پیش پیش تھی۔ اس لیے عوام کی زبانوں پر فارسی، ترکی الفاظ کثرت سے چڑھ گئے تھے اور بھاشا نے ان زبانوں کا کافی اثر قبول کر لیا تھا۔ جیسا کہ اس وقت کے دوہوں سے ثابت ہے، اکثر بھاٹ اپنے دوہوں اور کبتوں میں بے تکلفی سے ترکی اور فارسی الفاظ صرف کرتے تھے۔ پھر شفقؔ کے کلام میں اس رنگ کا غالب ہونا چنداں تعجب خیز نہیں۔

شفقؔ کی طبیعت پھولوں کی مانند نزاکت پسند واقع ہوئی تھی جو بعض تذکرہ نویسوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے۔ کہتے ہیں شاعری کے شوق نے اس کی دوکان کو خوب چمکایا جس نے ایک دفعہ گلہائے مضامین کی خوشبو سونگھی ہمیشہ کے لیے گاہک بن گیا۔ بسا اوقات دوکان پر مشتاقان سخن کا جماؤ رہا کرتا تھا خریدار پھولوں کے ہار اور گجرے خریدنے سے پہلے فرق سماعت کو طرۂ سخن سے

---

[1] ۔ اس شعر کا مضمون کسی قدر تغیر الفاظ کے ساتھ میرؔ کے شعر سے لڑتا ہے چونکہ تسلیم پڑھے لکھے نہ تھے اس لیے توارد کہنا غلط نہ ہوگا۔ پہلا مصرع مومنؔ سے لڑ گیا ہے۔

مزین کر لیتے ۔ شفق پر اشعار پڑھتے وقت خاص کیفیت طاری ہوتی ۔ اچھا شعر پڑھنے یا سننے کے بعد دیر تک کیف سخن کا لطف لیا کرتا ۔ اس کی طراوش طبع کا حاصل یہ ہے :

پس از مردن بھی گردش ہے زبس میرے مقدر میں
بگولے کی طرح رہتی ہے میری خاک چکر میں
الہٰی کیا کرے ، دیوانۂ الفت کہاں جائے
قرار آتا ہے صحرا میں نہ جی لگتا ہے اب گھر میں
خدا کے سامنے آنے تو دو مغرور قاتل کو
قیامت ہم بھی اک برپا کریں گے آج محشر میں
فراقِ یار میں کیا لطف ساقی بادہ نوشی کا
بجائے مے ذرا سا زہر بھر دے میرے ساغر میں
دلِ مرحوم کا مدفن زیارت گاہ بن جائے
شفق چھوٹی سی اک تربت بنا دو کوئے دلبر میں

شفیق ، سید احمد حسین

سید احمد حسین عرف بھتو صاحب ، شفیق تخلص ، صاحب دیوان ہیں ۱۲۸۵ھ میں لکھنؤ منقی گنج میں عالم عدم سے بزم شہود میں آئے ۔ آٹھویں امام موسیٰ رضا کی اولاد اور سادات صحیح النسب ہیں ۔ باپ کا نام حاجی سید علی حسین مرحوم بن سید صادق علی مغفور ہے ۔ جناب شفیق کو محض ان پڑھ نہیں بلکہ خاندانی جاہل علم کہنا درست ہے ۔ یہ کسی زبان کا کوئی لفظ نہ لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں ۔ حد یہ ہے کہ اپنا نام تک لکھنا نہیں آتا لیکن شاعری کے لیے مبدار فیاض نے خاص طور کا قلب و دماغ عطا کیا ہے ۔ جو کسی بحر کسی زمین میں نظم کے موتی پرونے سے عاری نہیں ۔ شاعری کے جملہ اصناف میں شعر کہتے ہیں ۔ طبیعت ہر وقت حاضر رہتی ہے ۔ سر جھکا کر فکر کی نہیں کہ دریا موجیں مارنے لگا ۔ پُر گوئی کی یہ شان کہ دو غزلہ سہ غزلہ کہہ لینا کچھ مشکل ہی نہیں ۔ اُن کی

تصنیف سے دیوان غزلیات کے علاوہ مرثیہ، سلام، نوحہ، رباعی، قصائد، قطعات، مسدس، مخمس، مثلث، نیچرل اور قومی نظمیں موجود ہیں۔ خود ان کا بیان ہے کہ مجھے نو برس کے سن سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ سب سے پہلے طبیعت کے سانچے نے جس مضمون کو ڈھال کر شعر کی صورت میں موزوں کیا وہ یہ ہے:

پکڑ کر لے چلا صیاد یوں بلبل کو گلشن سے
دبائے بال و پر مٹھی میں اور منقار چٹکی میں

اس کے بعد ہی شعر گوئی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صغر سنی کی شرم نے اظہار کی اجازت نہ دی، جو کچھ کہا حافظے کی بیاض میں رقم کر لیا۔ کبھی کبھی تفنن طبع کے طور پر اپنے ہم عمر احباب میں نو تصنیف غزلیں پڑھا کرتے جو وقتاً فوقتاً ان کے والد کے گوش گزار ہوتی رہتیں۔ لیکن یہ نہ سمجھ سکتے کہ وہ کلام خود ان کے طباع فرزند کی ذہانت و ذکاوت کا نتیجہ ہے۔

حاجی صاحب جواہرات کی تجارت کرتے تھے اور اس سلسلے میں ہر سال کلکتے کا سفر کرتے تھے اب کی جو گئے تو اپنے ہونہار فرزند کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ شفیق کی مشق سخن جاری ہوئے سات برس گزر گئے ہیں، اب جوانی کی آمد اور سبزے کا آغاز ہے، سولہ برس کی عمر ہے، ہنوز کسی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا ہے، ہر روز ایک آدھ غزل نظم کر لینا فریضے میں داخل ہے اور اس سے زیادہ فرصت پر منحصر ہے قوت نظم بڑھ رہی ہے۔

ان دنوں آغا محمد شرف مرحوم زندہ تھے اور مٹیا برج میں مقیم تھے۔ حاجی صاحب سے قدیم یارانہ تھا۔ جب حاجی صاحب کلکتے جاتے تو اکثر صحبتیں رہا کرتیں۔ کبھی شرف مرحوم مٹیا برج سے کلکتے آتے، کبھی حاجی صاحب کلکتے سے مٹیا برج تشریف لے جاتے جہاں احباب کا جمگھٹا رہتا مزے مزے کے تذکرے چھڑتے، دل چسپ باتیں رہتیں چنانچہ حسب عادت ایک روز شرف مرحوم برائے ملاقات تشریف لائے صاحب سلامت مزاج پرسی کے بعد معمولی تذکرے چھڑے، جناب شفیق بھی سامنے دوزانو بیٹھے ہوئے تھے ان کی موجودگی نے حاجی صاحب کو ان کے ذوق سخن کی یاد دلائی اور انھوں نے شرف مرحوم سے فرمایا کہ "یہ صاحبزادے اکثر اشعار پڑھا کرتے ہیں مگر وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے ان کا کہا ہوا کلام نہیں ہے ذرا سنو تو سہی" شرف مرحوم ان کی جانب

متوجہ ہوئے فرمایا "ہاں میاں! کچھ سناؤ۔" جناب شفیق نے بطور امتثال امر تازہ تصنیف کیے ہوئے چند اشعار سنائے جس سے انھیں بہایت تعجب ہوا اور فرمایا "میاں! اپنا کہا ہوا پڑھو" اس جملے سے شفیق کو طیش آگیا۔ ایک تو بڑھتے ہوئے شباب کی گرم جوشیاں، پھر جہالت تو جہالت! گستاخانہ جواب دیا "شاید آپ بھی ابتدا میں دوسروں کے شعر اپنے نام سے پڑھا کرتے ہوں گے۔" شرف مرحوم مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا "میں طرح کا مصرع دوں اُس زمین میں غزل کہو گے؟" انھوں نے عرض کی "بسر و چشم۔" شرف مرحوم نے مصرع دیا اور شفیق نے تھوڑی دیر میں ۱۹ شعروں کی غزل نظم کر دی۔ وہ سن کر بے حد خوش ہوئے۔ شاباش کہا اور مشق سخن جاری رکھنے کی تاکید فرمائی۔ اس دن سے ان کی شاعری کا اعلان ہو گیا۔ کلکتے کے شعرا نے اپنے مشاعروں میں مدعو کرنا شروع کیا اور یہ بھی اپنے والد کی اجازت سے شریک ہو کر داد خوش کلامی دینے لگے۔ منشی گلشن الدولہ بہار استاد شہ خاص طور پر چشم عنایت فرماتے تھے۔ شعرا میں ان کی دھوم تھی۔ تعریف و توصیف کی صدائیں کانوں میں آنے لگیں، ان کا حوصلہ بڑھنے لگا۔ جب تک کلکتے میں قیام رہا کوئی مشاعرہ ان کی شرکت سے خالی نہ گیا۔

لکھنؤ آئے تو یہاں بھی مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ لکھنؤ کا سب سے پہلا مشاعرہ حکیم منے آغا فاضل کا مشاعرہ تھا۔ یہاں اہل لکھنؤ نے اپنے شہر کے طبیعت دار اور ان پڑھ شاعر شفیق کو ان کے کلام کی داد دینے میں پوری فیاضی اور دریا دلی سے کام لیا اور یہ ان پڑھ شاعر ہونے کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئے۔

اب تک جو کچھ کہا تھا محض ذوق فطری اور طبیعت کے لگاؤ سے مگر اب ایک شفیق رہبر کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا جو کوچۂ نظم کے نشیب و فراز سے تمام و کمال اطلاع دے۔ انھوں نے اس کام کے واسطے ابو محمد جلیس مرحوم کو منتخب کیا جو مشاق شاعر اور میر انیس مبرور کے پوتے تھے۔ عرصے تک ان کی اصلاح سے فیض یاب ہوتے رہے مگر پھر ایک مصرع کی اصلاح پر اختلاف رائے واقع ہوا۔ جلیس نے سمجھانا چاہا، ان کے ذہن نشین نہ ہوا۔ ان دنوں جلیس مرحوم اپنی سسرال میں پیارے صاحب رشید مرحوم کے یہاں سکونت رکھتے تھے۔ حسن اتفاق سے جس وقت جلیس اور شفیق مصرعے پر مباحثہ کرنے میں مصروف تھے رشید مغفور بھی

بیرون در کھڑے ہوئے ان باتوں کو سن سن کر دلچسپی لے رہے تھے۔ شفیق کی گفتگو سن کر مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور جلیس سے فرمایا "بھائی صاحب! انھیں میرے حوالے کر دیجیے میں ان کی خاطر جمعی کر دوں گا" اُس روز سے شفیق ان کی شاگردی کا دم بھرنے لگے۔ رشید مرحوم کو زبان کی نزاکتوں کا بے حد خیال تھا۔ چنانچہ انھوں نے شفیق کو غزل گوئی کا اصول ان لفظوں میں تعلیم کیا۔ یار کی باتیں، یار سے باتیں، یار کی باتیں، ہجر یار سے باتیں۔ اور انھوں نے بھی نہایت مستعدی سے اس مقولے پر عمل کیا۔ ان کی تمام غزلیں لطف زبان اور روزمرّہ کا مجموعہ ہیں۔ جب تک اردو الفاظ مل سکتے ہیں اس وقت تک غیر زبان کا کوئی لفظ صرف نہیں کرتے۔

رشید مرحوم ان کی جانب بڑی توجہ کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً رموز فن بطریق علم سینہ تعلیم فرماتے رہتے تھے۔ جس سے شفیق کی معلومات وسیع ہوگئیں اور وہ رشید مرحوم کی وفات کے بعد کسی کی مدد کے محتاج نہ رہے۔ جب سنہ ۱۳۲۶ھ میں رشید کا انتقال ہوگیا تو ان کے چھوٹے بھائی جناب حمید سے مشورہ سخن کرنے لگے وہ بھی صرف اس خیال سے کہ وہ استاد کے چھوٹے بھائی اور ان کے واسطے واجب التعظیم تھے۔ مگر ان کی وفات کے بعد جو کچھ کہتے ہیں وہ اپنی طبع خداداد کے بھروسے پر کہتے ہیں۔ بیرون جات میں بھی مشاعروں کی شرکت کے لیے جاتے ہیں۔ اب ۶۱ برس کا سن ہے، مشق سخن جاری ہوئے ۵۲ سال گزر چکے، شاعری کا شباب ہے۔ ابتدائے عمر میں تو شفیق نہایت ظریف الطبع، زندہ دل اور شوخ مزاج واقع ہوئے تھے لیکن جوانی کے ساتھ ساتھ شوخیاں اور رفاعت کے ساتھ زندہ دلی رخصت ہوگئی۔ اب ہر وقت تسبیح ہاتھ میں رہتی ہے۔ مگر جب کبھی یاران قدیم جمع ہو جاتے ہیں تو کچھ دیر کے واسطے پرانی زندہ دلی و خوش طبعی واپس آجاتی ہے۔ گرما گرم فقرے چھنٹنے لگتے ہیں۔ الفاظ شائستہ، فقرات چست و پر مذاق ہوتے ہیں اور تہذیب کا دامن کبھی نہیں چھوٹتا حافظہ اب بھی بہت قوی ہے، ہزارہا اشعار از بر ہیں۔ پڑھنے پر آتے ہیں تو گھنٹوں پڑھتے چلے جاتے ہیں اور یادداشت کم نہیں ہوتی۔ سنہ ۱۳۳۵ھ میں "عطیۂ الہٰی" کے نام سے دیوان چھپ گیا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ مختلف اصناف سخن کے نمونے موجود ہیں۔ فی الحال ۲۸ اپریل سنہ ۱۹۲۸ء مطابق ۷ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۶ھ ہفتے کے روز بغرض زیارت کربلائے معلّی و نجف

اشرف و کاظمین شریفین لکھنؤ سے روانہ ہوگئے ہیں، کم ترین سے بھی رخصت ہونے تشریف لائے تھے۔

ان کی پرگوئی کے متعلق نواب حامد علی خاں حامد بیرسٹر ایٹ لا مرحوم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شفیق مجھ سے ملنے آئے۔ اس روز میں "راز کا" اور "ساز کا" کی زمین میں غزل تصنیف کر رہا تھا۔ مجھے فکر میں سر بزانو دیکھ کر پوچھا "آپ کیا کر رہے ہیں؟" میں نے جواب دیا کل کے مشاعرے کی غزل تیار کر رہا ہوں۔ میں نے صرف ایک مطلع نظم کیا تھا وہ پڑھ دیا:

کس سے ادائے شکر ہو بندہ نواز کا
ہر چیز میں شعور دیا امتیاز کا

سنا، تعریف کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تعریف کے ساتھ، فکر بھی کرتے جاتے تھے۔ اتنی ہی دیر میں مطلع نظم کر لیا اور پڑھا۔ افسوس مجھے وہ مطلع یاد نہیں رہا، ان کے دیوان میں موجود ہوگا۔ اس کے بعد میں نے دوسرا اور پھر تیسرا شعر پڑھا۔ انھیں قافیے معلوم ہوتے جاتے تھے اور ان قوافی میں اشعار نظم کرتے چلے جاتے تھے مختصر یہ کہ تھوڑی ہی دیر میں مجھ سے قافیے پوچھ کر پوری غزل تیار کر لی۔

شفیق کی بعض قومی نظمیں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاسوں میں بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہوئیں جس کا روپیہ انھوں نے یتیم خانے کو عنایت کر دیا۔ ایک زمانے میں انھیں اپنی امیت کا اعلان کرتے شرم آتی تھی کسی اجنبی کے سامنے اس کمزوری کا اقرار نہ کرتے تھے۔ مشاعروں میں لکھی ہوئی غزل ہاتھ میں لے کر پڑھتے، حسن اتفاق سے کاغذ کا رخ صحیح ہے تو واہ وا، ورنہ الٹا کاغذ ہاتھ میں ہے اور یہ حافظے کی مدد سے غزل پڑھ رہے ہیں۔ آخر میں وہ خیال تبدیل ہوگیا اور علی الاعلان امی ہونے کا اقرار کرنے لگے۔ چنانچہ دیوان کے مقطعات میں متعدد جگہ اپنا بے علم ہونا ظاہر کیا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار لکھے جاتے ہیں

میرے احباب یہ کہتے ہیں کہ جاہل ہے شفیق
ہے بہت جائے عجب اس کا غزل خواں ہونا

اے شفیقِ زار بعدِ مرگ بس اتنا تو ہو
سب کہیں احباب، اک ایسا بھی جاہل ہوگیا

تم سے ان پڑھ بھی بہت دنیا میں گزرے اے شفیق
ایک دیوان[1] کر لیا موزوں تو اس پر کیا گھمنڈ

ایک مرتبہ اپنی بے علمی کا احساس پیدا ہوا اور طبیعت تحصیل علم کی جانب مائل ہوئی مگر پڑھنے کا زمانہ گزر چکا تھا فکر معاش اتنی فرصت نہ دیتی کہ شاعری کے ساتھ تحصیل علم کا مشغلہ بھی جاری ہو اس موقع پر جذبات قلبیہ یوں ظاہر کرتے ہیں:

خیر! اب تھوڑی سی پڑھ لیتے شفیق اردو ہم
زندگی کا نہیں گر اپنی سہارا ہوتا!

کمال کی بے قدری کا رونا تو تمام شاعروں نے رویا ہے، شفیق کو بھی اپنی کس مپرسی کا قلق ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ابنائے زمانہ کے شکوے پر یوں زبان کھولتے ہیں:

کوئی رئیس بھی نہ رہا قدرداں شفیق!
خالق نے ہم کو خلق کیا کس زمانے میں

شفیق واقعات کو بڑی صفائی اور سادگی سے نظم کرنے کے عادی ہیں۔ ۱۹۱۵ء کے آخر میں جو قیامت خیز برسات ہوئی تھی جس نے لکھنؤ کو تباہ اور سیکڑوں خاندانوں کو بے خانماں کر دیا تھا، شریف زادیاں برقعوں اور چادروں میں لپٹی ہوئی بچوں کو کلیجے سے لگائے گھروں سے باہر نکل پڑی تھیں اور ہزارہا مکان گر گر کر زمین کے برابر ہو گئے تھے، شفیق کا مکان بھی نذر باراں ہوا۔ اُس واقعے کو یوں سلک نظم میں پروتے ہیں:

گر پڑے برسات میں گھر ٹھوکریں کھائیں شفیق
اب ٹھکانا ہی نہیں تجھ خانماں برباد کا

سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک دفعہ نواب مسٹر محمد حامد علی خاں حامد مرحوم نے رسالہ معیار میں ان کا تذکرہ رقم کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا تو وہ پرچہ پڑھوا کر سنا۔ بہت خوش ہوئے اور معیار کے مشاعرے میں اس نوازش کی شکرگزاری ان لفظوں میں کی:

---

[1] اب دوسرا دیوان غیر مطبوعہ موجود ہے

کرو حامد علی خاں کا شفیق زار شکریہ
وہ محسن ہیں، کیا لکھے حال بہیچ میں رقم میرا

ان کے کلام میں گل و بلبل و زلف و سنبل، رخ و عارض، کنگھی چوٹی کے مضامین کی افراط ہے۔ مگر جب مضمون آفرینی، سوز و گداز اور درد و حرماں کی جانب توجہ کرتے ہیں تو ایسا کہتے ہیں جو ان کی بے علمی سے بالکل بعید ہے۔ مثلاً مضمون کہنے پر آئے تو یوں گویا ہوئے:

ایک دن آنے کا اک سوئے عدم جانے کا
رسم ہے خلق میں دو روز کا مہماں ہونا!

یہ قاعدہ ہے صانع قدرت کا بنایا
اک پاؤں کے اک پاؤں برابر نہ اٹھے گا

دست طلب بڑھا تو مگر بات بھی گئی!
مرنے کے بعد کیا کف سائل میں رہ گیا

قدیم رنگ کے نمونے بھی ان کے دیوان میں پائے جاتے ہیں۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں، ان سے متقدمین کی پیروی و متابعت ظاہر ہے:

تمھاری زلف کے کوچے میں ڈر ہے لٹنے کا
اندھیری رات میں جاتا ہے قافلہ دل کا!

بولی قسمت کہ مرا پیچ تو تجھ سے نہ کھلا
تیز ہر چند ترا ناخن تدبیر بھی تھا

میں اپنی تیرہ بختی کا اگر احوال لکھتا ہوں
سیہ حرفوں سے رویا کرتا ہے اکثر قلم میرا

مختصر یہ کہ دیوان ہر قسم کے کلام سے مالا مال ہے نہ تخیل قدیم کی کمی ہے نہ

خیالات جدیدہ کی گرانی ۔ سوز و گداز، ہجر و وصل، معاملہ بندی وصنعت شعری وغیرہ وغیرہ اپنی اپنی جگہ زیب دے رہی ہیں ۔ ضرورت تو یہ تھی کہ ہر صنف سخن کی مثالیں الگ الگ پیش کی جاتیں مگر اس مختصر تذکرے میں طوالت باعث بدمزگی ہے ۔ اختصار کے ساتھ جو کچھ لکھا گیا وہی نسبتاً بہت زیادہ ہے ۔ اب اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان میں ہر صنف کا کلام منتخب پیش کیا ہے:

اک جوانی کا سبب اور پہ ارمان ہونا ۔۔۔ سخت مشکل ہے مری موت کا آساں ہونا
کارگر پند و نصیحت نہیں ہوتی اُس کو ۔۔۔ جس کی تقدیر میں لکھا ہو پریشاں ہونا
گر اسی طرح ہیں غارت گر دنیا ترے ظلم ۔۔۔ میری نظروں میں ہے عالم کا بیاباں ہونا
مجھ کو حسرت میں حیا آتی ہے یارب اس کی ۔۔۔ تیری موجودگی اور غیر کا احساں ہونا

پھر تجھے ہم نذر دیں گے اے خدنگِ نازِ یار
اور دل ممکن جو کوئی تیرے قابل ہو گیا
جمع تھے ارمان، تیرِ ناز کی خالی تھی جا
دل میں آ بیٹھا تو وہ نازنگِ محفل ہو گیا
چاک دامن تو کیا یوسف کا جوشِ شوق ہیں
رنج سے ٹکڑے زلیخا کا مگر دل ہو گیا
دیکھ کر روتے ہوئے مجھ کو تمھیں ہنسنا نہ تھا
برق کے گرنے سے بیتاب اور بھی دل ہو گیا

ہم سے وحشی دشت میں خاروں پہ یوں چلتے رہے
ہر قدم پہ پاؤں کا اک آبلہ پھوٹا کیا

کچھ ہجر کا شکوہ جو کیا وصل میں، میں نے ظالم نے کئی مرتبہ تلوار کو دیکھا !!
سب ہٹ گئے بالیں سے برا وقت سمجھ کر دم توڑتے ہم نے دلِ بیمار کو دیکھا

نکل کے گھر سے نا واقف الٰہی کس طرف جائے
کہ جس نے راستہ دیکھا نہ ہو الفت کی منزل کا
یہ کہہ کر اٹھ گئے وہ بزم سے، کل پوچھ ہی لیں گے
ہمارے بعد جو کچھ حال ہو گا اہلِ محفل کا

کچھ غور کرکے تونے اے بخیہ گر بھی دیکھا
ٹانکے لگائے دل پر، زخمِ جگر بھی دیکھا
گر حشر میں ملیں گے، پوچھوں گا منعموں سے
مرنے کے بعد تم نے وہ مال و زر بھی دیکھا
نیچی نظر نے تیری دل پیس پیس ڈالے
آنکھیں اٹھا کے تونے او فتنہ گر بھی دیکھا

دل کو پامال کیا اُس کی حقیقت کیا تھی
آپ کے نام کا تھا آپ ہی کے کام آیا
دن تو فرقت کا کٹا، رات کٹے گی کیوں کر
دل دھڑکتا ہے کہ اب شام کا ہنگام آیا

تو دے کہ نہ دے، تجھ سے وہ ہر حال میں خوش ہے
غیروں سے تمنّا ترا سائل نہیں رکھتا

مزہ برق کے تڑپنے کا میں اُس گھڑی دکھاتا
مرے پاس اگرچہ میرا دلِ بے قرار ہوتا

دل کا کنول بجھے ہوئے مدت گزر گئی — اب یہ چراغ لائقِ محفل نہیں رہا
جس سے شفیق ایک زمانے کا لطف تھا — افسوس اپنے پاس وہی دل نہیں رہا

حشر میں پیشِ خدا نام بتاؤں کس کا
موت کے ساتھ ستم گار ترا تیر بھی تھا
جوشِ وحشت کا مجھے یاد ہے اتنا تو شفیق
میں ہی ہنستا تھا، میں ہی صورتِ تصویر بھی تھا

سینے پہ ہاتھ رکھے تھا اور رنگ زرد تھا
کل شب کو کیا شفیق تمہارے دل میں درد تھا

صیاد! تو نے دفن مجھے باغ میں کیا — جب موت آگئی تو خزاں کیا بہار کیا
دیوانہ مجھ کو، یا مجھے کچھ اور ہی کہو — قابو میں دل نہ ہو تو مرا اختیار کیا

ہے یاد مجھے اب تک کیا آپ کا بچپن تھا — عاشق مجھے کہہ دینا، شرما کے مکر جانا
کچھ آپ نہ گھبرائیں، یہ شیوۂ عاشق ہے — ہر بات پہ جی جانا، ہر بات پہ مر جانا

حال بیمارِ محبت کا بہت نازک ہے — اب چمک درد کی اٹھے گی تو مر جائے گا
دلِ عشاق پہ آئیں گی بلائیں لاکھوں — آپ کے دوش پہ گیسو جو بکھر جائے گا

خوب ہے مشقِ تصور کا سوا ہو جانا
آدمی کے لیے اچھا ہے رسا ہو جانا
خاکِ تربت مری اس کوچے میں پہنچا دینا
راستے بھر تو ذرا تیز ہوا ہو جانا

پہلے پہل میں گھر سے نکلا عشق کی راہ ناہموار
گرتا پڑتا مرتا جیتا منزل پر تا شام گیا
اس کا گلہ ساقی سے کیسا اپنی ہی تقدیر شفیق
تیرے سوا اس کی صحبت سے کوئی بھی تشنہ کام گیا

میں تو مجبور تھا احباب سے یہ کہتا کون　　وہ بھی آ لیتے تو تربت میں اتارا ہوتا

بس اتنا مال ہو جو کام آئے ہر ضرورت میں
وہی ہے سلطنت احباب اپنے ہوں وطن اپنا

الفت ہر ایک شے کو بڑھاتی ہے کس قدر
دفترِ وفا کا اک پرِ پروانہ ہو گیا

موسیٰ کی حکایت سے اڑ رہے ہوش سبھوں کے
عالم میں ہوا شور تری جلوہ گری کا

کس کشاکش میں پھنسا جا کر میاں کوئے دوست
اک طرف سے موت آئی اک طرف سے بوئے دوست

مقام لیں سب اپنے اپنے دل جو اہلِ درد ہیں
میں بیاں کرنے کو ہوں کچھ داستانِ خوئے دوست
میں سنبھالوں ، لڑکھڑائیں وہ نزاکت کے سبب
ہے خدا کی شان میرا ہاتھ اور بازوئے دوست
دل ہمیں یاد آتا ہے اپنا بہت یادش بخیر
قبر کی آغوش میں ہے طالبِ پہلوئے دوست
رہرووں کی ٹھوکریں ہیں بعدِ مردن اے شفیق
اب کہاں ہے سر ہمارا اور کہاں زانوئے دوست

مرے پاس آکے کسی روز بیٹھو   سناؤں تمھیں ماجرائے محبت

ایسا قفس میں تڑپی کہ رگ رگ میں درد ہے
بلبل کا دل دکھاتی ہے اک ایک پر کی چوٹ

ہوئے سب میں رسوا محبت کے باعث
مٹے آپ اپنی طبیعت کے باعث
بہت چارہ گر پوچھنے حال آئے
نہ کچھ منہ سے نکلا حمیت کے باعث

آج دنیا میں آئے گا طوفان   میری چشم پر آب کے باعث

بعد میرے اور کوئی قتل ہوگا یا نہیں
پوچھ لینا چاہیے اس بات کو قاتل سے آج

اس وقت ہر مریض کو ہوتا سکون ہے
تو بھی ذرا سنبھل دل ناشاد وقتِ صبح

گزشتہ حال مجھے اپنا یاد کرنے دے　　سناؤں گا تجھے پھر اپنی داستاں صیاد
کیا ہے قید، مگر یہ بتا خدا کے لیے　　چمن سے لے کے مجھے جائے گا کہاں صیاد

کوئی پوچھے یا نہ پوچھے کہتا ہے دیوانہ حال
بے سبب ہر بات کا اقرار خود انکار خود

تو ہی ہر ایک کا غیبت میں حال کہتا ہے
تو ہی زمانے کی ہے دوسری زباں کاغذ
ہمارے قتل کا محضر بنائے گا قاتل
تلاش میں ہے کہ مل جائے خوں چکاں کاغذ

محفل میں وہ آئے ہیں تو یہ حکم دیا ہے
اب بات کرے شمع سے پروانہ سمجھ کر

بعد مدت کے اگر آئے تو احسان کیا
آئیے بیٹھیے اے رشک قمر آنکھوں پر
رہتا پیری میں نہیں قلب و جگر پر قابو
ہاتھ پاؤں پہ ہے کچھ زور نہ سر آنکھوں پر

دل مرا کہتا ہے مجھ سے بزم خوباں دیکھ کر　　یاد آتی ہے جوانی ایسے ساماں دیکھ کر

چاہتے ہیں وحشیوں میں آپ کے ہو جائے نام
ہم بھی جا بیٹھے کوئی خالی بیاباں دیکھ کر

یہ ہر اک فن سے ہمیں ظاہر ہوا   آدمی مرتا ہے اپنے نام پر

قفس کی سمت سے طائر جو اُڑ کے جاتے ہیں
اسیر پوچھتے ہیں ان سے ماجرائے بہار

ایک مدت کر چکا اپنی خوشی
اب مرا کہنا دل ناکام کر

عدم آباد کو جاتے ہیں اسیرانِ قفس   آج تو چین سے سوئیں گے نگہبانِ قفس

زخم دوزی آپ ہی کرتا ہوں میں
آئینہ رکھا ہوا ہے دل کے پاس
آتش غم کی نہیں جب قدر ہو
دل تمھارا ہو ہمارے دل کے پاس

تم ابھی آئے ابھی جاؤ گے سوچو تو 'شفیق'
دو گھڑی کے واسطے دنیا میں ہو بیکار خوش

وہ جو کچھ کہتے ہیں، اغیار وہی کہتے ہیں
اپنی ہم بات کو کہہ دیتے ہیں ناچار غلط

قاتل ہو عاشق کے اپنے، تیر لگانا سیکھو تو
کیونکر دل کو چھید و گے جیتنگی میں ہے سوفارِ غلط

شب بھر مرے مزار پہ جل جل کے جان دی
قسمت سے مجھ کو خوب ملی جاں نثار شمع

روشنی گھر بھر میں ہوتی ہے، مگر افسوس ہے
رکھتا ہے تاریک اپنا نصف کاشانہ چراغ

جس دن سے ہم نے چھوڑ دیا شغلِ مے کشی
کیا کیا گھٹائیں اٹھتی ہیں میخانے کی طرف

جو اہلِ دل ہیں، مرے پاس آکے بیٹھے ہیں
میں کہہ رہا ہوں وہ سنتے ہیں داستانِ فراق

ایسے قاتل نے مجھے زخمی کیا		جس سے اٹھ سکی نہیں تلوار تک

وہ باغوں کا منظر نہ بھولوں گا میں		وہ ہلکا گلابی حسینوں کا رنگ
ہمیں ہجر میں یاد آئیں بہت		حسینوں کی باتیں حسینوں کا رنگ

اپنے مرنے سے بھی زائد مجھے اس کی ہے خوشی
آکے تربت میں مجھے تو نے اتارا قاتل

سر پہ تیرے ہاتھ رکھا تھا صداقت کے لیے		تو بگڑتا ہے تو باز آئے قسم کھانے سے ہم

وہ ہی باتوں میں گزر جائے گی میری زندگی
میں کروں اصرار جتنا اتنا ہی انکار تم

وہ سنوارا کرتے تھے جن کو، مجھے تھا جن کا عشق
میرے لاشے پر وہی زلفیں پریشاں ہو گئیں

جس کو ملایا خاک میں، دل فقط اس کا نام تھا
وہ ہی لہو کی بوند تھی، بس مرے جسمِ زار میں

وہ مجھ سے لے کے خود اپنے کلیجے سے لگاتے ہیں
خوشی یہ ہے، وہ میرے دل کو اپنا دل سمجھتے ہیں
عجب دیوانے ان کے ہیں چلے جاتے ہیں صحرا کو
نہ یہ راحت سمجھتے ہیں نہ یہ مشکل سمجھتے ہیں
'شفیق' ایسا جہاں کی گردشوں نے تفرقہ ڈالا
جہاں دو دوست مل بیٹھے اسے محفل سمجھتے ہیں

جب شباب آیا تو دنیا کے کرشمے آ گئے
شوخیاں پیدا ہوئیں کیا کیا مزاجِ یار میں
عشق سے اور حسن سے رونق زمانے بھر کی تھی
بک گئے یوسف تو خاک اڑنے لگی بازار میں

شہرت ہے لطفِ خندۂ گل کی زمانے میں — بلبل نے دی ہے برق کو جا آشیانے میں
جوڑا ہے تیر اگر، تو کماں ایک دم نہ کھینچ — دل تھام لوں کہ فرق نہ آئے نشانے میں

کلی گل کی جو کھلائی ہوئی ظالم نے مل ڈالی　　ہمارے دل کی پوری بن گئی تصویر چٹکی میں

ہمارے قتل کو ہے جنبشِ ابرو فقط کافی
غضب ہے آپ کیوں کھینچے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں
پرکھتے ہیں حسیں سودے کو دزدیدہ نگاہوں سے
دلوں کے بیچنے والے سرِ بازار بیٹھے ہیں

پڑا جب تیر، کیسا جوش تھا خوں کی روانی میں
یہ وہ سمجھے کہ جس نے زخم کھایا ہو جوانی میں
عجب انداز سے میرے گلے پر رک کے چلتا ہے
تری رفتار کا ہے طور خنجر کی روانی میں

ہم اپنا حال لکھنے کو دفتر کہاں سے لائیں
کچھ ہیں ورق زمین کے کچھ آسماں کے ہیں
چارہ گرو! یہ دل پہ عنایت ہے غیر کی
ناسور سب پڑے ہوئے تیغِ زباں کے ہیں

جس کو دیکھا آج ہم نے کل وہ آزاری نہیں　　عشق سے بدتر کوئی دنیا میں بیماری نہیں

کبھی اہلِ قفس جب آتشِ گل یاد کرتے ہیں
پروں میں آگ لگ جاتی ہے یوں فریاد کرتے ہیں
مری میت اٹھا کر وہ عجب انداز سے بولے
ہم ایسے ہیں کہ ایسے وقت میں امداد کرتے ہیں

نہ تو مے کش، نہ صراحی، نہ پلانے والا اک مرے مرنے سے خاک اڑتی ہے میخانے میں

دست جنوں! ذرا سی توجہ کا کام تھا تار نفس ملا ہے گریباں کے تار سے

پہلی ہی رات ہے فرقت کی بھلا رونے کیا آزمانے کو تمھیں دیدۂ نم دیکھتے ہیں

راحت کا اور غم کا افسانہ ہو رہا ہے
کچھ اس کی انجمن میں کچھ میری انجمن میں

قید سے چھوٹ کے مجبور وہیں بیٹھ رہے
کیا کریں وہ کہ جنھیں طاقت پرواز نہ ہو

چارہ گر کیا پوچھتا ہے میری بیماری کا حال
دن تو کٹ جاتا ہے، پڑ جاتی ہے مشکل رات کو

مری فرقت کی راتیں وصل کی راتوں سے بہتر تھیں
میں اپنے دل سے لپٹائے رہا تصویر دلبر کو

کرو تم اپنی آرائش بٹھا کر سامنے مجھ کو
بتاتا جاؤں میں تم اپنے جوہر دیکھتے جاؤ

ہنس کے قاتل نے کہا مرنے کی حسرت ہے شفیقؔ
اتنی سی بات میں تم اتنے ہراساں کیوں ہو

نہیں معلوم مجھ سے وصل کی شب کون کہتا ہے
سحر فرقت کی آتی ہے تم اے شادماں کیوں ہو

خدا حافظ ہے اس کی زندگی کا کہ جس کا مہرباں نامہرباں ہو

عبث کہتے ہو مرتا کون ہے کہنے کی باتیں ہیں
جو تم دم لو ابھی میرا جنازہ دیکھتے جاؤ

ہمارے آپ کے راز و نیازِ عشق مخفی ہیں
وفا پوشیدہ پوشیدہ جفا پوشیدہ پوشیدہ

مرے اپنے گھر میں گئے پھر لحد تک گئے ہم وہاں سے کہاں رفتہ رفتہ

فرقت کی ناامیدیاں کہتی ہیں مر بھی جا
روکے ہوئے ہیں مجھ کو امیدیں وصال کی

وہ آئے بیٹھے اُٹھ بھی گئے جو مجھ کو تھا کہنا بھول گیا
میں ان کے آگے بات کروں کیا یہ بھی ہے قسمت میری

مرا برباد ہونا عشق میں یوں کام آتا ہے
کسی کے نام کے ہمراہ میرا نام آتا ہے

اب دل کی تڑپ نے مجھے بے چین کیا ہے تنگ آکے یہ کہتا ہوں کہ ظالم کہیں مر بھی

(جاری)

شاہانِ اودھ کے کتب خانے

مترجمہ و مرتبہ

محمد اکرام چغتائی

۱۰۴۔ قابوس نامہ[۳۶۹] کیکاؤس کی اپنے بیٹے کو نصیحت۔ ۴۴ ابواب صفحات ۲۴۲۔ یہ فارسی کا چیسٹر فیلڈ ہے۔ لیکن اس کے آداب اور طرزِ حکومت عیسائی مصنف سے زیادہ غیر مخلوط، شستہ اور غیر جانب دار ہیں۔ ڈیتس نے اس کتاب کا ترکی سے جرمنی زبان میں ترجمہ کیا تھا (برلین ۱۸۱۱ء)

۱۰۵۔ مجموع قطب شاہی[۳۷۰]، عبداللہ قطب شاہ کا مجموعہ۔ یہ رسالہ مندرجہ ذیل کتابوں سے مرتب کیا گیا ہے: احیاء العلوم۔ مکارم الاخلاق۔ اخوان الصفا۔ ربیع الابرار۔ کشف الغم۔ مصنف 'تاریخ الحکماء' (عربی)، کے ایک ناقص فارسی ترجمہ کا بھی ذکر کرتا ہے، جو اسی نام سے کیا گیا تھا۔ اس میں اخلاقی اقوال کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

۱۰۶۔ مکتوبات شرف الدین یحییٰ مونگری[۳۷۱]۔ ۲۲ خطوط صفحات ۵۵۔ فی صفحہ ۱۵ سطور

۱۰۷۔ مناقب چشتیہ[۳۷۲]۔ از حامد بن عبدالحیٔ چشتی تقریباً ایک سو چشتی بزرگوں کے نام، معجزات اور بعض جگہوں پر اُن کی تاریخوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ صفحات ۲۰۰ فی صفحہ ۱۵ سطور

۱۰۸ مرأت الاسرار۔ عبدالرحمٰن بن چیشی بن عبدالرسول[۳۷۳] نے ۱۰۴۵ھ میں ہندوستان میں مرتب کی۔ اس میں تقریباً چار سو صوفیا کے حالات زندگی موجود ہیں۔ صفحات ۱۰۲۰ فی صفحہ ۱۵ سطور مرتب نے مندرجہ ذیل کتابوں کا حوالہ دیا ہے:

کشف المحجوب۔ انیس الارواح۔ حیات العارفین۔ دلیل العارفین۔ بحر المعانی۔ شرح آداب المریدین۔ تکملہ غوث الصمدانی۔ فتوحات مکی۔ فصوص الحکم۔ ترجمہ عوارف۔ کلمات الصدیقین مناقب الاولیاء۔ مناقب الاصفیاء۔ لطائف اشرفی۔ تذکرۃ الاولیاء۔ عروۃ الوثقیٰ۔ چہل مجلس شیخ علاء الدولہ۔ فصل الخطاب۔ شواہد النبوۃ۔ نفحات۔ رشحات۔ روضۃ الصفا۔ حبیب السیر۔ روضۃ الشہدا۔ سر العارفین۔ اخبار الاخیار۔ لطائف صوفیہ۔ تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی۔ مردہ سکندری، تاریخ نظامی۔ منتخب التواریخ۔ ملفوظ شیخ احمد عبدالحق وغیرہ۔

طب اور کیمیا

۱۰۹ ستہ ضروریہ[۳۷۴]۔ یوسف نے ۹۴۴ھ میں مرتب کیا۔ چھ ایسی چیزوں کا ذکر، جو زندگی کے لیے ضروری ہیں، مثلاً ہوا۔ غذا اور پانی جسمانی ورزش اور آرام۔ ذہنی ورزش اور آرام۔ جاگنا اور سونا،

مرتب صحت کو برقرار رکھنے کے لیے اِن باتوں پر عمل کرنے کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ صفحات ۱۰۔ فی صفحہ ۱۴ سطور۔

۱۱۰۔ رسالۂ سیماب۔ مصنف لکھتا ہے کہ سیماب تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ وہ ہندو اطبا کے طریقۂ کار کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔

۱۱۱۔ کافی، چائے اور چوب چینی کی تیاری اور ان کی خصوصیات کی تاریخ پر ایک رسالہ۔ انقاضی بن ہاشف الدین محمد یزدی۔ تین ابواب۔ مصنف چوب چینی پر ایک فرنگی حکیم کے فارسی رسالے کا ذکر کرتا ہے۔ جو اس زمانے سے قبل لکھا گیا۔ صفحات ۱۵۰۔ فی صفحہ ۱۲ سطریں سنہ کتابت ۱۱۹۰[۳۷۵]

۱۱۲۔ کتابِ تشریح[۳۷۶] علمِ تشریح پر ایک کتاب، جو میر محمد بہادر خاں[۳۷۷] کے لیے لکھی گئی۔ دیباچے کے علاوہ پانچ ابواب[۳۷۸] (مقامات) ہیں۔ ۱۔ علم العظام ۲۔ عضلات ۳۔ اعصاب ۴۔ اَوردہ ۵۔ عروقِ جاذبہ اور شرائین ۶۔ جنین اور جسم کے مرکب حصے۔ ایک عمدہ تصنیف ہے۔ صفحات ۱۴۴۔ فی صفحہ ۱۲ سطریں۔

۱۱۳۔ عین الحیوٰۃ[۳۷۹] (عربی)، از محمد بن یوسف ہراتی (مرتب "طبّی لغت" جو کلکتہ سے شائع ہو چکی ہے) حفظانِ صحت پر ایک رسالہ ہے۔ مصنف پہلے اُن مختلف غذائی اور طبّی اشیاء کو بیان کرتا ہے، جو ضروری قوتوں کو ترقی دیتی یا کم کرتی ہیں۔ بعد ازاں وہ صحت پر عادات، جذبات وغیرہ کے اثرات کو بیان کرتا ہے۔ صفحات ۱۵۰

۱۱۴۔ گنج بادآور صاحب قرانی۔ از امان اللہ معاصر شاہجہاں[۳۸۰]۔ سادہ اور مرکب ادویہ بنانے کے طریقے۔ مصنف ہندوؤں کے طریقے کی پیروی کرتا ہے۔ طبّی نسخوں کے علاوہ اُس نے صابن سیاہی وغیرہ بنانے کے مختلف گھریلو طریقوں کو بھی بیان کیا ہے۔

۱۱۵۔ قرابادین قادری[۳۸۱]۔ مرکب ادویہ پر ایک فارسی کتاب۔ مرتبہ میر محمد اکبر۔ اس کا نام محمد ارزانی تھا ۱۱۲۶ھ میں زندہ تھا۔ مصنف نے مندرجہ ذیل طبّی کتب کا حوالہ بھی دیا ہے۔

۱۔ طب النبی[۳۸۲] کا خلاصہ ۲۔ طب اکبر ۳۔ مفرح القلوب ۴۔ میزان الطب ۵۔ تعاریف الامراض ۶۔ مجربات اکبری صفحات ۱۰۰۔ فی صفحہ ۲۳ سطور۔

۱۱۶۔ رسالہ ذہبیہ فی الطب[۳۸۳]۔ ایک طبّی خط، جو حسبِ روایت امام رضا نے ہارون الرشید کو لکھا

یہ مختصر کتاب Concilium Salcruitanum ad Angliae regem سے مشابہت رکھتی ہے۔ یہ رسالہ حفظانِ صحت سے متعلق ہے۔ فارسی ترجمہ اور تشریحات کے ساتھ عربی متن موجود ہے۔
۱۲۰ صفحات۔ فی صفحہ ۱۷ سطور۔

متفرقات

۱۱۷۔ مضمارِ دانش[۳۸۴]۔ گھوڑوں پر ایک کتاب از نظام الدین احمد۔ تین حصوں (مرحلوں) پر مشتمل ہے اور ہر حصّہ نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱۔ اچھے اور بُرے گھوڑوں کی پہچان۔ ۲۔ گھوڑوں کی تربیت ۳۔ گھوڑوں کے علاج۔

۱۱۸۔ باورچی گری پر ایک کتاب، جس میں دہلی کے شاہی مطبخ کے نسخوں کو بیان کیا گیا ہے۔ مصنف اور کتاب دونوں کے نام کا علم نہیں۔ ابتدائی عبارت یہ ہے:
"الحمد للہ رب العالمین مخفی نماند ایں رسالہ ایست در تحقیق اقسام طعامہا در سرکار بادشاہ دہلی الخ" صفحات ۱۶ فی صفحہ ۵ سطریں۔

۱۱۹۔ چوب بازی۔ احاطہ بندی سے متعلق ہے۔ صفحات ۲۵۔ فی صفحہ ۲۰ سطریں۔ مؤلف، علی نقی، محمد بلاقی اور میر عارف اللہ کی آراء کو بیان کرتا ہے۔ اول الذکر دہلی کے اُن پہلوانوں میں سے تھا جو فرخ سیر کے عہد میں موجود تھے۔ اُس کے شاگرد ابھی تک یہاں اور دہلی کے ماہر پہلوانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ محمد بلاقی عالمگیر کے دور میں زندہ تھا۔

۱۲۰۔ بدایۃ الرامی[۳۸۵]۔ از محمد بدّھا المعروف بہ سید علوی۔ سلطان ابو المظفر حسین شاہ کے لیے لکھی گئی۔ صفحات ۲۰۰ فی صفحہ ۱۵ سطور

۱۲۱۔ رسالۂ جواہر[۳۸۶]۔ از محمد بن منصور معاصر ابو نصر حسین بہادر خاں۔ دیباچہ، ایک کتاب (مقالہ) اور بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں قیمتی جواہر اور اُن کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ اُن مقامات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے، جہاں سے یہ پتھر دستیاب ہوتے ہیں۔ دوسری کتاب (مقالہ) مختلف دھاتوں سے متعلق ہے۔ صفحات ۱۰۲ فی صفحہ ۱۵ سطور

۱۲۲۔ اصولِ قبضہ[۳۸۷]۔ فنِ تیر اندازی پر کتاب۔ از ابو حسام الدین محمد۔ عنوان سے اس کا سنہ تصنیف

یعنی ۱۴۴۴ء ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس اعتبار سے انتہائی دلچسپ ہے کہ اس میں فارسی زبان کے ساتھ چغتائی اور ہندی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ اِس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر تاتار کے جنگی طریقوں کی پیروی کرتے تھے۔ گیارہ ابواب (ضابطے) صفحات ۸۰ فی صفحہ ۱۱ سطور۔

۱۲۳۔ رسالۂ فلاحت[۳۸۸]۔ زراعت پر ایک رسالہ۔ بارہ ابواب۔ ایک مفید مختصر کتاب ہے صفحات ۲۰۰ فی صفحہ ۱۱ سطور۔

۱۲۴۔ تعلیم الصید[۳۸۹]۔ از میر عبداللہ حسینی بن میر پارسا۔ محمد شاہ کے دور میں ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی اِس میں مختلف جانوروں (مثلاً کتوں، بازوں وغیرہ) کی تربیت اور اُن کی بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے اِس موضوع پر متقدمین کا حوالہ بھی دیا ہے:

"بدانکہ علمار ایں فن قلیل اند اول ایشاں قیطوس رومی و ابن عوام داہم وسطرس وابن جاسس"

میں نے بولاگنا Bologna کے کتب خانے میں اِس موضوع پر عربی کتب کے بیشتر لاطینی تراجم دیکھے ہیں، جو بارھویں صدی عیسوی میں کیے گئے۔ اِن میں سے فریڈرک ثانی کی اِس موضوع پر اپنی ایک کتاب ہے صفحات ۴۰۰ فی صفحہ ۷ سطور۔

۱۲۵۔ طریق شناخت امراض وجوش و معالجات آن۔ صفحات ۲۸۔ فی صفحہ ۱۱ سطور۔ بازوں اور دیگر جانوروں کی بیماریوں کے متعلق لکھی گئی ہے۔

۱۲۶۔ بازنامہ۔ مذکورۂ بالا کتاب سے مختلف ہے۔ چھ ابواب۔ بیرم خاں کے لیے کسی نامعلوم مصنف نے مرتب کی۔ صفحات ۲۵۰۔ فی صفحہ ۷ سطور۔

۱۲۷۔ رسالہ رؤیا[۳۹۰] خوابوں پر ایک کتاب از (؟) Pivirenna یہ خوابوں کے طبعی اسباب کے متعلق ایک انتہائی عمدہ رسالہ ہے۔ لیکن مصنف نے خواب کی تعبیروں کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ قصور[؟] ۱۱ صفحات ۲۹۰۔ فی صفحہ ۷ سطور

۱۲۸۔ تائید بصارت[۳۹۱]۔ از لطف اللہ المتخلص بہ نثار الملی طلب بہ نصرت اللہ خان۔ کتاب کے عنوان سے تاریخ تصنیف ۱۱۱۸ھ برآمد ہوتی ہے۔ یہ کتاب تلواروں کی مختلف اقسام

اور اُن کی خوبیوں پر لکھی گئی ہے۔ بہترین تلواریں المانی اور فرنگ ہیں۔ اس کے بعد دمشق کی تلواریں مشہور ہیں۔

۱۲۹۔ بیان شطرنج مع نقشہ جات۔

۱۳۰۔ فرسنامہ از محمد بن محمد معاصر نصرت بن شہریار۔ سنہ تصنیف ۷۰۶ھ۔ اس کی دو اقسام ہیں۔ پہلی قسم گھوڑوں کی پہچان، اُن کے رنگوں اور عمر وغیرہ سے متعلق ہے اس قسم کے چالیس ابواب ہیں۔ دوسری قسم Hippo iatreus is پر ہے۔ صفحات ۹۰۔ فی صفحہ ۲۰ سطریں۔

۱۳۱۔ میر شکار نامہ[۳۹۲] (باز نامہ) یہ کتاب سید یار النجفی نے اکبر کے لیے لکھی۔ بارہ ابواب۔ یہ اس موضوع پر مکمل ترین کتابوں میں سے ہے۔ صفحات ۲۹۰ فی صفحہ ۱۲ سطریں۔ اس کے علاوہ ایک اور نسخہ بھی موجود ہے۔

۱۳۲۔ حدیقۂ دنیا۔ از محمد زمان اصفہانی، جس نے ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی تھی بقول مصنف لاطینی سے ترجمہ کی گئی ہے۔

۱۳۳۔ لالہ لال جی المتخلص بہ الفت کی کف بینی پر ایک کتاب تقریباً ۱۱۴۰ اشعار پر مشتمل ہے "مظہر القیافہ" سے ۱۱۴۶ھ کی تاریخ ظاہر ہوتی ہے۔ بقول مصنف یہ کتاب ہندی سے ترجمہ کی گئی ہے۔

۱۳۴۔ تحفۃ الملوک۔ از خوش محمد مفتی بن درویش محمد دیوسی۔ کتوں، چیتوں، بازوں وغیرہ کی تربیت سے متعلق ہے۔ مختصر کتاب ہے۔

۱۳۵۔ مضمارِ دانش۔ گھوڑوں کی تربیت اور علاج پر لکھی گئی ہے۔ از مرزا نظام الدین احمد (مختصر کتاب ہے)

۱۳۶۔ فنِ تیراندازی پر ایک عربی کتاب۔ مصنف اور کتاب دونوں کے نام معلوم نہیں۔ ابتدائی عبارت یہ ہے۔

"الحمد للہ رب العالمین والسلام علی خیر محمد وآلہ واصحابہ اجمعین اما بعد فہذہ رسالۃ وجیزۃ فی دستور الرمی والرامی وکیفیۃ الخ"

مصنف تقریباً ہر صفحے پر طبری کا حوالہ دیتا ہے۔ بعض جگہوں پر ابو موسیٰ جزار

یعنی ۴۴۰ء ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب اِس اعتبار سے انتہائی دلچسپ ہے کہ اس میں فارسی زبان کے ساتھ چغتائی اور ہندی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ اِس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر تاتار کے جنگی طریقوں کی پیروی کرتے تھے۔ گیارہ ابواب (ضابطے)، صفحات ۸۰ فی صفحہ ۱۱ سطور۔

۱۲۳۔ رسالۂ فلاحت[۳۸۸]۔ زراعت پر ایک رسالہ۔ بارہ ابواب۔ ایک مفید مختصر کتاب ہے صفحات ۲۰۰ فی صفحہ ۱۱ سطور۔

۱۲۴۔ تعلیم العبید[۳۸۹]۔ از میر عبداللہ حسینی بن میر پارسا۔ محمد شاہ کے دور میں ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی اِس میں مختلف جانوروں (مثلاً کتوں، بازوں وغیرہ) کی تربیت اور اُن کی بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے اِس موضوع پر متقدمین کا حوالہ بھی دیا ہے:

"بدانکہ علماء این فن قلیل اند اول ایشان قیطوس رومی و ابن عوام دادھم وسلوس وابن جاسس"

میں نے بولاگنا Bologna کے کتب خانے میں اِس موضوع پر عربی کتب کے بیشتر لاطینی تراجم دیکھے ہیں، جو بارھویں صدی عیسوی میں کیے گئے۔ اِن میں سے فریڈرک ثانی کی اِس موضوع پر اپنی ایک کتاب ہے صفحات ۴۰۰ فی صفحہ ۷ اسطور۔

۱۲۵۔ طریق شناخت امراض وحوش و معالجات آن۔ صفحات ۲۸۔ فی صفحہ ۱۱ سطور۔ بازوں اور دیگر جانوروں کی بیماریوں کے متعلق لکھی گئی ہے۔

۱۲۶۔ بازنامہ۔ مذکورۂ بالا کتاب سے مختلف ہے۔ چھ ابواب۔ بیرم خاں کے لیے کسی نامعلوم مصنف نے مرتب کی۔ صفحات ۲۵۰۔ فی صفحہ ۷ سطور

۱۲۷۔ رسالہ رویا[۳۹۰] خوابوں پر ایک کتاب از (؟) Pi virenna۔ یہ خوابوں کے طبعی اسباب کے متعلق ایک انتہائی عمدہ رسالہ ہے۔ لیکن مصنف نے خواب کی تعبیروں کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ فصول ۱۱ صفحات ۲۹۰۔ فی صفحہ ۷ اسطور

۱۲۸۔ تائیدِ بعمارت[۳۹۱]۔ از لطف اللہ المتخلص بہ نثار المخاطب بہ نصرت اللہ خان۔ کتاب کے عنوان سے تاریخ تصنیف ۱۱۱۸ھ برآمد ہوتی ہے۔ یہ کتاب تلواروں کی مختلف اقسام

اور اُن کی خوبیوں پر لکھی گئی ہے۔ بہترین تلواریں المانی اور فرنگی ہیں۔ اس کے بعد دمشق کی تلواریں مشہور ہیں۔

۱۲۹۔ بیان شطرنج مع نقشہ جات۔

۱۳۰۔ فرسنامہ از محمد بن محمد معاصر نصرت بن شہریار۔ سنہ تصنیف ۷۰۷ھ۔ اس کی دو اقسام ہیں۔ پہلی قسم گھوڑوں کی پہچان، اُن کے رنگوں اور عمر وغیرہ سے متعلق ہے اس قسم کے چالیس ابواب ہیں۔ دوسری قسم Hippoiatreusis پر ہے۔ صفحات ۹۰۔ فی صفحہ ۲۰ سطریں۔

۱۳۱۔ میر شکار نامہ[۳۹۲] (بازنامہ) یہ کتاب سید یار النجفی نے اکبر کے لیے لکھی۔ بارہ ابواب۔ یہ اس موضوع پر مکمل ترین کتابوں میں سے ہے۔ صفحات ۲۶۰ فی صفحہ ۱۲ سطریں۔ اس کے علاوہ ایک اور نسخہ بھی موجود ہے۔

۱۳۲۔ حدیقۂ دنیا۔ از محمد زمان اصفہانی، جس نے ہندوستان میں سکونت اختیار کرلی تھی بقول مصنف لاطینی سے ترجمہ کی گئی ہے۔

۱۳۳۔ لالہ لال جی المتخلص بہ الفت کی کف بینی پر ایک کتاب تقریباً ۱۱۴۰ اشعار پر مشتمل ہے 'مظہر القیافہ' سے ۱۱۴۶ھ کی تاریخ ظاہر ہوتی ہے۔ بقول مصنف یہ کتاب ہندی سے ترجمہ کی گئی ہے۔

۱۳۴۔ تحفۃ الملوک۔ از خوش محمد مفتی بن درویش محمد دبوسی۔ کتوں، چیتوں، بازوں وغیرہ کی تربیت سے متعلق ہے۔ مختصر کتاب ہے۔

۱۳۵۔ مضمارِ دانش۔ گھوڑوں کی تربیت اور علاج پر لکھی گئی ہے۔ از مرزا نظام الدین احمد (مختصر کتاب ہے)

۱۳۶۔ فنِ تیراندازی پر ایک عربی کتاب۔ مصنف اور کتاب دونوں کے نام معلوم نہیں۔ ابتدائی عبارت یہ ہے۔

"الحمد للہ رب العالمین وسلام علی خیر محمد وآلہ واصحابہ اجمعین امابعد فہذہ رسالۃ وجیزۃ فی دستور الرمی والرامی وکیفیۃ الخ"

مصنف تقریباً ہر صفحے پر طبری کا حوالہ دیتا ہے۔ بعض جگہوں پر ابوموسیٰ جزار

کا بھی ذکر کرتا ہے۔ صفحات ۱۲۶ فی صفحہ ۱۵ سطور۔ صلیبی جنگوں کے زمانے کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

انگریزی سے فارسی تراجم

۱۲۷۔ غازی الدین حیدر کے لیے بہت سی انگریزی کتابوں کے فارسی تراجم کیے گئے۔ مسٹر گبسن انگریزی کتب کی کہانیاں بادشاہ کو سنایا کرتا تھا۔ ان سے تراجم میں بڑی مدد ملی۔ زبان بہت عمدہ ہے لیکن واقعات کی صحت، ناموں اور تاریخوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ بعض تراجم کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ تاریخ میکسیکو ۲۔ کے۔ پورٹر کا سفرنامۂ ایران (اردو سے ترجمہ کیا گیا) ۳۔ تاریخ چین ۴۔ سفرنامہ علی بیگ ۵۔ ایک مختصر جغرافیہ۔ صفحات ۲۰۰ فی صفحہ ۱۳ سطریں ۶۔ علم تشریح کا خاکہ مع اصل نقشہ جات، جو ایک انگریزی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ ۷۔ غسل پر ایک کتاب، ۸۔ بائی مبین ۹۔ مرکب ادویات کے متعلق ۱۰۔ انگریزی قرابادین ۱۱۔ طبّی خصوصیات کی وضاحت ۱۲۔ ٹیلن کی فن بیطاری پر کتاب ۱۳۔ فعلیات وغیرہ پر۔ مترجمہ لیوپولڈ ڈانس۔ ۱۴۔ سمندری اشاروں پر ایک کتاب ۱۵۔ بزبر منش کی کہانیاں۔ شگرف نامۂ ولایت۔ از حسام الدین، جو ۱۷۹۹ء میں انگلستان گیا تھا۔ ۱۶۔ مسیر طالبی[۲۹۳]۔ یورپ، افریقہ، ترکی اور ایران میں ابوطالب کا سفر۔

تعلیقات

۱- ابوبشر عمرو بن عثمان بن قنبرۃ (ای ابن قنبر الفارسی البیضادی ثم العراقی البصری الملقب بہ سیبویہ ۔ رک: الفہرست ۱: ۵۱، ابن خلکان ۱: ۳۸۷، معجم الادبا ۶: ۸۰ - ۸۸، السیرافی: اخبار النحویین البصریین ۴۸ - ۵۰، الزبیدی: المختصر من تاریخ اللغویین والنحویین ۱۵، نزہتہ الالبا ۷۱ - ۸۱ بغیۃ النحاۃ ۳۶۶، ابن تغری بردی: النجوم الزاہرۃ ۲: ۹۹؛ مراۃ الجنان ۱: ۴۴۵، کشف الظنون ۱۴۲۶، مفتاح السعادۃ ۱: ۱۲۸ - ۱۳۰، روضات الجناۃ ۵۰۳، علی النجدی ناصف: سیبویہ امام النحاۃ، اعلام الثقافۃ العربیۃ ۱۱ ۵-۲-۷۲، براکلمان ۱:۱۰۱، ذا: ۱۶۰، مجلۃ معہد المخطوطات العربیۃ ۔ مصر ۔ المجلد الاول، الجزء الثانی ۔ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ / نومبر ۱۹۵۵ء - ۵۳ ۲ ۔ مصنف کے نام کی بحث کے لیے رک: JRAS ۱۹۱۲ ص ۶۹، ببعد

۲- ۱۸۰ھ / ۷۹۶ء ۔ لیکن سیبویہ کی تاریخِ وفات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے ۔ عمر رضا کحالہ نے الذہبی کی 'سیر النبلاء' (ج ۸ : ۲۳۸، ۲۳۹) کے حوالے سے کئی تاریخیں لکھی ہیں مثلاً ۱۶۱ھ / ۷۷۷ء، ۱۷۷ھ / ۷۹۳ء، ۱۸۸ھ / ۸۰۳ء، ۱۹۴ھ / ۸۱۲ء (معجم المؤلفین ۸: ۱۰، الحقی نوٹ) جرجی زیدان نے ۱۸۳ھ / ۷۹۹ء لکھا ہے (تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ۲: ۲۰۴) براکلمان کے خیال کے مطابق سیبویہ ۱۶۱ھ اور ۱۹۴ھ / ۸۰۹ء کے درمیان فوت ہوا ۔ (ذا ۱: ۱۶۰)

۳- سیبویہ کی کتاب کو 'قرآن النحو' بھی کہا جاتا ہے ۔ رک:

Anwar G. Chejne, : The Arab[illegible] Language : its Role in Hist[illegible] Minneapolis, 1967, p. 42.

اس کتاب کو سب سے پہلے ڈیرنبورک (۱۸۱۱ء۔ ۱۸۹۵ء) نے مندرجہ ذیل عنوان
کے تحت شائع کیا تھا۔

Sibawaihi, Le livre de Sibawaihi, traitè de grammaire arabe, Texte arabe...par H. Derenbourg. 2 vols. Paris. 1881-89 Réimpression, Hildesheim 1969, pp. 504 and 500.

کتاب کا متن قاہرہ، اسکوریال، آکسفورڈ، پیرس، سینٹ پیٹرزبرگ اور ویانا کے
قلمی نسخوں سے تیار کیا گیا۔
پیرس کے علاوہ کلکتہ (۱۸۸۷ء) اور مصر (۱۸۹۶ء) سے بھی شائع ہوئی۔ برلین سے
مندرجہ ذیل عنوان کے تحت شائع ہوئی۔

Sibawaihi. Buch über die Grammatik. Nach der Ausgabe von H. Derenbourg und dem Kommentar des Sirafi übers. und erklärt und mit Auszügen aus Sirafi und anderen Kommentaren Versehen von G. Jahn. 2 Bde. Berlin 1895-1900. Neudruck 1969.

۴۔ یہ نسخہ ناقص الاول ہے۔ رک: فہرست عربی مطبوعات ومخطوطات ۔۔۔۔ مرزا
اشرف علی۔ کلکتہ ۱۹۰۴ء۔ ۴۴۔

۵۔ المفصل فی صناعۃ الاعراب۔ چار اقسام پر مشتمل ہے، جو اسماء، افعال، حروف وغیرہ
پر لکھی گئی ہیں۔ مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ، دہلی ۱۸۹۱ء۔ ابن یعیش الحلبی (۵۵۶ھ — ۶۴۳ھ/
۱۱۶۰ء — ۱۲۴۵ء) نے 'شرح المفصل فی صناعۃ الاعراب للزمخشری' لکھی۔ مطبوعہ
لائپزیگ ۱۸۷۶ء۔

جاراللہ زمخشری (۴۶۷ھ-۵۳۸ھ/ ۱۰۷۴ء — ۱۱۴۳ء) رک: الانباری ۴۶۹،

ابن خلکان ۲: ۱۷۰، ابن قطلوبغا ۵۳ (۲۱۷)، بغیۃ الوعاۃ ۳۸۸، الفوائد البہیۃ ۲۰۹، روضات الجنات ۴: ۲۱۱، مفتاح السعادۃ ۱: ۱۰۹ و ۱۷۴۔

۶۔ مطبوعہ آستانہ ۱۲۸۶ھ (دو جلد) لائپزیگ ۱۸۶۴ء — ۱۸۸۲ء (تین جلد مع فہارس وملحوظات از رایط علی ۱۴۲۳ھ — ۱۳۲۴ھ المبرّد (۲۱۰ھ — ۲۸۵ھ / ۸۲۵ء — ۸۹۸ء) رک: الفہرست ۱: ۵۹، الانباری ۲۷۹، بغیۃ الو ۱۱۶، روضات الجنات ۴: ۲۱، مفتاح السعادۃ ۱: ۱۳۱، براکلمان ۱: ۱۰۸، ذ ۱: ۱۶۸۔

اشپرنگر نے غلطی سے المبرّد کا سنہ وفات ۲۷۵ھ / ۸۸۸ء لکھ دیا ہے۔

۷۔ جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف بن احمد بن عبداللہ بن ہشام الانصاری الخزرجی الشافعی الحنبلی (۷۰۸ھ — ۷۶۱ھ / ۱۳۰۸ء — ۱۳۵۹ء) رک: بغیۃ الوعاۃ ۲۹۳، شذرات الذہب ۶: ۱۹۱، روضات الجنات ۴۵۵، مفتاح السعادۃ ۱: ۱۵۹، حسن المحاضرۃ ۱: ۲۵۷۔

۸۔ قطر الندی وبل الصدی۔ مطبوعہ بولاق ۱۲۵۳ھ، مصر ۱۲۸۲ھ، تیونس ۱۲۸۱ھ، لائیڈن ۱۸۸۷ء۔ مرتبہ A. Gaguyer جمال الدین الفاکہی (۸۹۹ھ — ۹۷۲ھ / ۱۴۹۳ء — ۱۵۶۴ء) نے مجیب الندا الی شرح قطر الندی لکھی۔ مطبوعہ بمبئی ۱۸۸۰ء۔

۹۔ جلال الدین السیوطی (۸۴۹ھ — ۹۱۱ھ / ۱۴۴۵ء — ۱۵۰۵ء)، رک: حسن المحاضرۃ ۱: ۱۵۵، الخطط الجدیدۃ ۱۲: ۱۰۵، الفوائد البہیۃ ۱۳، روضات الجنات ۳۲۴، براکلمان ۲: ۱۴۳ — ۱۵۸، معجم المؤلفین ۵: ۱۲۸ — ۱۳۱۔

Specimen e litteris orientalibus exhibens Soiuti librum de interpretibus Corani par Meursingue, Leiden, 1839.

۱۰۔ الاشباہ والنظائر النحویۃ۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۱۶ھ — ۱۳۱۷ھ۔ ۴ جلد

۱۱۔ الاقتراح فی علم اصول النحو۔ حیدر آباد دکن۔ ۱۳۱۰ھ

۱۲۔ ۱۰۰۴ھ — ۱۰۶۷ھ / ۱۵۹۵ء — ۱۶۵۷ء۔ اشپرنگر نے حاجی خلیفہ کی کشف الظنون عن

اسامی الکتب والفنون' کے تمام حوالہ جات اُس طباعت سے دیے ہیں جس کو جرمن مستشرق فیلوگل Gustave Leberecht Flügel نے مرتب کیا تھا مطبوعہ لائپزیگ ولائیڈن ۱۸۳۵ء ۔ ۱۸۵۸ء (سات جلد) اشپرنگر کی مذکورہ رپورٹ کی تحریر کے وقت یعنی جون ۱۸۴۸ء میں یہ کتاب مکمل طور پر شائع نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی صرف چار ابتدائی جلدیں طبع ہوئی تھیں یعنی ۱۸۳۵ء ۱۸۳۷ء ۱۸۴۲ء ۱۸۴۵ء میں بقیہ تین جلدیں بالترتیب ۱۸۵۰ء ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئیں ۔ ۱۹۶۶ء میں اس کا فوٹو ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

۱۳و۱۴۔ ان دونوں کتابوں کا ذکر براکلمان اور دیگر حوالے کی کتب میں موجود نہیں ۔ بیشتر کتب خانوں کے عربی مخطوطات اور مطبوعات کی فہارس میں ان میں سے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے کا علم نہیں ہو سکا۔ اول الذکر کے متعلق اشپرنگر نے دوسری رپورٹ کے آغاز میں صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ کتاب ابن قتیبہ کی 'ادب الکاتب' پر تنقید ہے۔

۱۵۔ کتاب الجمہرۃ ۔ مرتبہ سید زین العابدین موسوی۔ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۴۴ھ ۔ ۱۳۵۱ھ ۔ ۴ جلد

یہ کتاب عربی زبان کی اُن لغات میں سے ہے جو الفاظ پر مرتب ہوئیں۔ اس کی ترتیب ہجائی یا معجمی ہے۔ لیکن ابتدائی حروف کے مطابق ہے ۔ ابن درید اس طرز کا موجد ہے اسی لیے اس ترتیب کو 'ترتیب دریدی' کہتے ہیں۔ بعد ازاں عربی زبان کی دیگر لغات مثلاً بارع' منضد' مجمل' محیط' نزہۃ الانفس' اساس البلاغۃ وغیرہ اسی طرز پر لکھی گئیں۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ ابن درید نے لغت میں ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں' جو متقدمین کے ہاں نہیں تھیں (مروج الذہب ۳۴)

۱۶۔ ۲۲۳ھ ۔ ۳۲۱ھ / ۸۳۷ء ۔ ۹۳۳ء رک : الفہرست ۱: ۶۱' الانباری ۳۲۲' معجم الادباء ۶: ۴۸۳' طبقات السبکی ۲: ۱۴۵' بغیۃ الوعاۃ ۳۰' روضات الجنات ۴: ۱۲۶' نامۂ دانشوران ناصری ۔ چاپ دوم ۔ جزء سوم ۲۹۸ ۔ ۳۰۸ براکلمان ۱: ۱۱۱' ذ ۱: ۱۷۲ ۔

عبداللہ بن محمد بن میکال (م ۔ مابین ۲۹۷ھ/ ۹۰۹ء ۔ ۳۰۱ھ/ ۹۱۳ء) خلیفہ المقتدر کے

دورِ حکومت (۲۹۵ھ - ۳۲۰ھ / ۹۰۷ء - ۹۳۲ء) میں فارس اور اُس کے گرد و نواح کا گورنر مقرر ہوا، تو اُس نے اپنے بیٹے ابوالعباس اسماعیل (۲۷۰ھ - ۳۶۲ھ / ۸۸۳ - ۹۷۲ء) کو نیشاپور سے بلایا اور اُس کی تعلیم و تربیت پر اُس زمانے کے جیّد علماء کو مقرر کیا۔ ابن درید ادب کی تعلیم پر مقرر ہوا۔ ابن درید نے اپنے ہونہار شاگرد کے لیے دو کتابیں 'مقصورۃ' (تہران ۱۸۵۹ء) اور 'جمہرۃ' لکھیں۔ تیمیۃ الدہر ۳: ۱۳۰-۱۴۰: ۲۴۷) اول الذکر میں اسماعیل اور اُس کے باپ کی تعریف میں اشعار کہے گئے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ عربی مدارس میں اس کو نصابی کتاب کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا۔ ۲۹۷ھ میں ابن درید فارس میں تھا اور وہیں اُس نے اپنے شاگرد امیر اسماعیل کے لیے 'جمہرۃ' لکھوائی۔ اُس وقت کوئی کتاب اُس کے پاس موجود نہیں تھی تمام کتاب صرف حافظے کے زور پر لکھواتا رہا۔ اس سے ابن درید کی خداداد ذہنی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رک:

(ا) Al-Mikal. Prof. Muhammad Shafi. (Proceedings of the Idara-i-Ma'rifi Islamia, Lahore, 1935. pp. 107-168.

(ب) JRAS, CENTENARY SUPPLEMENT (1924) PP. 255-270

(ج) نسب و اخبار ابن درید (قلمی)، از عبداللہ بن محمد بن احمد۔

(CF. Descriptive Catalogue of Arabic MSS. in Nigeria. London, 1965, p. 46).

۱۷۔ اس کتاب کا صحیح نام 'تہذیب اللغۃ' ہے۔ لغت نگار کا نام ابو منصور محمد احمد ازہری (م۔ ۳۷۰ھ / ۹۸۰ء) ہے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ لغت دس جلدوں سے زیادہ ہوگی (۱: ۵۰۲)، ابو زکریا تبریزی کے حال میں لکھا ہے کہ اُس کو اس لغت کا ایک نسخہ ملا تھا جو چند ہلکی جلدوں پر مشتمل تھا (۲: ۲۲۳) ابن مکرم نے اس کو 'اجل الکتب' کہا ہے (دیباچہ لسان العرب)، مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ یہ لغت سولہ جلدوں پر مشتمل ہے

(تاج العروس۔ مقدمہ ۲) اِس لغت کی ترتیب مشہور امام لغت خلیل بن النحوی البصری (م۔ ۱۷۵ھ / ۷۹۱ء) کی کتاب العین (بغداد۔ ۱۹۱۴ء) کی طرح مخارج حروف پر ہے۔ اس لغت کے چند اجزا قلمی صورت میں بانکی پور اور رامپور میں موجود ہیں رک، تذکرۃ النوادر ۱۱۱۔ ۱۱۳۔ دیگر کتب خانوں کے چھ قلمی نسخوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مخطوطات المکتبۃ العباسیۃ فی البصرۃ۔ بقلم علی الخاقانی۔ بغداد ۱۹۶۱ء ۵۸۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۴ء۔ ۱۹۶۷ء ۱۵ جلد مرتبہ عبدالسلام محمد ہارون و عبدالحلیم النجار وغیرہ۔

Darwish, A.A.F. al-Khalil b. Ahmad and the evolution of Arabic Lexicography. Thesis presented for Ph.D. London.

۱۸۔ مکمل عنوان یہ ہے:۔ القاموس المحیط و القابوس الوسیط الجامع لما ذہب من کلام العرب شماطیط۔ مجدالدین فیروزآبادی (۷۲۹ھ۔ ۸۱۷ھ / ۱۳۲۸ء۔ ۱۴۱۴ء) نے اِس کو ترتیب دیا رک: الشقائق النعمانیۃ ۱: ۹۲، بغیۃ الوعاۃ ۱۱۷، الفوائد البہیۃ بالتعلیقات ۲۳۰، روضات الجنات ۴: ۲۰۷، مفتاح السعادۃ ۱: ۱۰۳، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۵ء سیوطی نے لکھا کہ مرتب لغت ہندوستان بھی آیا تھا (طبقات النحاۃ ۱۱۷) نیز رک: مجلۃ المجمع العلمی العراقی (مقالہ از عباس العزاوی) ج ۴ (۱۹۵۹ء) ص ۲۹۷۔ ۳۱۶ و

Bulletin of the College of Arts, Baghdad. IV (1961), pp. 197-212. (Article by Husain Ali Mahfuz)

۱۹۔ ادب کا پہلا انسائیکلوپیڈیا اسحاق بن ابراہیم فارابی (۳۵۷ھ۔ ۳۳۹ھ / ۸۷۰ء۔ ۹۵۰ء) نے 'دیوان الادب' کے نام سے چھ جلدوں میں لکھا قلمی نسخے لائیڈن اور آکسفورڈ میں موجود ہیں ہر جلد کے دو حصے ہیں۔ پہلے اسماء اور پھر افعال درج کیے گئے ہیں اور سند کے طور پر اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ ابو سعید محمد بن جعفر نے اسی نام سے اس پر دس جلدوں میں اضافہ کیا۔ (کشف الظنون ۱: ۵۰۳) رک: کشف الظنون (استانبول) ۱: ۷۷۴، براکلمان ۱: ۱۲۷، ذ ۱: ۱۹۵، فہرست مخطوطات خزانۃ لیعقوب سرکیس المہداۃ الی جامعۃ الحکمۃ بغداد تالیف

کورکیس عواد۔ ۱۹۶۶ء ۔ ۶۱؛ تذکرۃ النوادر ۱۱۰ ۔ و

Catalogue de Manuscrit Arabis, provenant d'une Bibliothque Privė ȧ El-Medina et appartenant a la Maison. Carlo Landberg, Leiden, 1883, p. 5. Seė also Fuad S.Haddad's article in American University of Beirut Festival Book (Festschrift). Ed. Fuad Sarruf and Suha Tamim. Beirut1967 pp.327-51 and his doctorate thesis. (Chicago University, 1965)

۲۰۔ تاج اللغۃ فی صحاح العربیۃ مطبوعہ تبریز ۱۲۷۰ھ E. Scheidius نے ۱۷۷۴ء میں مرتب کی۔ اس لغت کی ترتیب اواخر حروف کے مطابق ہے۔ جوہری اس طریق کا موجد تھا، اسی لئے اس ترتیب کو ' ترتیب جوہری ' کہتے ہیں۔ اس سے شعرا کو قوافی تلاش کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لسان العرب، خلاصۃ الحکم اور قاموس اسی انداز پر مرتب ہوئیں علاوہ ازیں جوہری نے لفظی اعراب کا طریقہ بھی ایجاد کیا، جس سے الفاظ کا صحیح تلفظ معلوم ہوجاتا ہے۔

اِس لغت کے بعض قدیم قلمی نسخوں کے لئے رک: معجم الادبا ۲ : ۲۷۰ ۔ ۲۷۲ مشہور کاتب امین الدین یاقوت موصلی (م۔ ۶۱۸ھ / ۱۲۲۱ء) نے 'صحاح' کے کئی نسخے لکھے۔ ان میں سے ایک نسخہ امیر اُزبک کے کتب خانے میں تھا، جس پر مشہور نحوی ابن بری (۴۹۹ھ۔ ۵۸۲ھ / ۱۱۰۵ء ۔ ۱۱۸۶ء) کے حواشی بھی درج تھے۔ یہ نسخہ آٹھ جلدوں پر مشتمل تھا۔

۲۱۔ ابو النصر اسمٰعیل حماد جوہری (م۔ ۳۹۳ھ / ۱۰۰۲ء) رک: الانباری ۴۱۸؛ تیمیۃ الدہر ۴: ۲۸۹؛ معجم ۱۱ : ۲۶۶؛ بغیۃ الوعاۃ ۱۹۵؛ کشف الظنون ۴ : ۹۱؛ روضات الجنات ۱ : ۱۱۰؛

مفتاح السعادة ۱: ۹۹' براکلمان ۱: ۱۲۸' ذا: ۱۹۶

۲۲۔ جوہری کے سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ یاقوت نے سنہ پیدائش و وفات معلوم کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا (معجم الادباء ۲: ۲۶۹) سیوطی نے ابن فضل اللہ العمری (۷۰۰-۷۴۹ھ/ ۱۳۰۰-۱۳۴۸ء) کی 'مسالک الابصار فی ممالک الامصار' سے سنہ وفات ۳۹۳ھ لکھا ہے (طبقات النحاۃ ۱۹۵) 'کشف الظنون' میں بھی یہی سنہ درج ہے (۲: ۴۷) سیوطی نے ۴۰۰ھ بھی لکھا ہے۔ بعض محققین ۳۹۸ھ بھی لکھتے ہیں۔

۲۳۔ مطبوعہ مصر ۱۲۷۳ھ لائپزنگ ۱۸۷۱ء

۲۴۔ ۶۴۴ھ۔ ۵۱۶ھ / ۱۰۵۴ء-۱۱۲۲ء۔ رک: الانباری ۴۵۳' ابن خلکان ۱: ۵۳۰ معجم الادباء ۶: ۲۷۰ طبقات السبکی ۴: ۲۹۵' بغیۃ الوعاۃ ۳۷۰' روضات الجنات ۵۲۷' مفتاح السعادۃ ۱: ۱۰۱

۲۵۔ مطبوعہ مصر' ۱۳۲۷ھ۔ اس لغت کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں لفظ کی اصل وضع اور اس کے استعمال کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کو منتخب الفاظ اور جملوں کا بیش بہا خزانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لغت کا ایک قلمی نسخہ رباط میں موجود ہے۔ رک: فہرست مخطوطات ۲۷۷

۲۶۔ 'کتاب المثلث' کا ایک قلمی نسخہ لائیڈن میں موجود ہے (ہوتسما ۴۷) نیز کشف الظنون ۵: ۳۷۴۔ ابن ملک کی کتاب کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا۔

۲۷۔ رک: براکلمان ۱: ۱۲۸' ذا: ۱۹۶ (۱۲۴۶ھ لکھنؤ سے سات جلدوں میں شائع ہوئی تھی (فہرست شاہان اودھ۔ دیباچہ۔ ۵) براکلمان نے اس ایڈیشن کا حوالہ نہیں دیا۔

۲۸۔ دورِ حکومت ۱۲۲۹ھ-۱۲۴۳ھ / ۱۸۱۴ء-۱۸۲۷ء۔

۲۹۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ یہ لغت شاہِ اودھ غازی الدین حیدر کی تصنیف ہے' اس اختلافی مسئلے کے لیے رک: تاریخ اودھ۔ نجم الغنی رامپوری۔ لکھنؤ ۴: ۲۰۷-۲۰۹۔ البلغۃ فی اصول اللغۃ۔ نواب صدیق حسن خاں۔ بھوپال۔ ۱۲۹۴ھ۔ ۱۴۱۔ اس لغت کی جلد چہارم کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے۔

"الحمد اللہ کہ جلد چہارم از کتاب فرہنگ رفعت مسمیٰ بہ ہفت قلزم بتاریخ پانزدہم جمادی الاولیٰ سنہ یک ہزار و دو صد و سی و ہفت ہجری دار السلطنت لکھنؤ بقالب طبع در آمد

بعد میں اس لغت کا مکمل متن نولکشور، لکھنؤ سے شائع ہوا (۱۸۹۱ء)، لیکن حسن طباعت کے اعتبار سے اول الذکر اشاعت سے بہت کمتر ہے۔

۳۰۔ الراغب الاصفہانی (م ۵۰۲ھ / ۱۱۰۸ء) رک: بغیۃ الوعاۃ ۳۹۶، روضات الجنات ۲۴۹، کشف الظنون (استانبول) ۲: ۱۷۷۳، براکلمان ۱: ۲۸۹، ذ ۱: ۵۰۶، طوپ قپوسرائے (عربی) ۱: ۵۵۴، حکمائے اسلام۔ اعظم گڑھ ۱: ۴۵۳ - ۴۹۶۔

۳۱۔ المفردات فی غریب القرآن۔ کراچی۔ ۱۹۶۱ء اردو ترجمہ از محمد بن عبدالفتاح الفیروز پوری۔ لاہور۔ ۱۹۶۱ء

۳۲۔ اس کتاب کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے کا علم نہیں ہو سکا۔

۳۳۔ ابن الاثیر الجزری (۵۴۴ھ - ۶۰۶ھ / ۱۱۴۹ء - ۱۲۰۹ء) رک: ابن خلکان ۱: ۵۵۷، معجم الادباء ۶: ۲۳۸، طبقات السبکی ۴: ۱۵۳، روضات الجنات ۴: ۲۴۲، مفتاح السعادۃ ۱: ۱۰۹۔ اشپرنگر نے الجزری کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے، اُس کا پورا نام "النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر المعروف بہ "النہایۃ الاثیر فی اللغات الحدیثیۃ" ہے۔ مطبوعہ تہران، ۱۲۶۹ھ بہ تصحیح عبدالعزیز بن اسمٰعیل الطہطاوی، ۱۳۱۱ھ (۴ جلد)

۳۴۔ مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار۔ لکھنؤ، ۱۲۸۴ھ محمد طاہر الہندی (۹۱۰ھ - ۹۸۶ھ / ۱۵۰۴ء - ۱۵۷۸ء) کی تالیف ہے رک: الفوائد البہیۃ ۲۴، بالتعلیقات شذرات الذہب ۴: ۹۸۶۔

۳۵۔ الفائق فی غریب الحدیث۔ زمخشری کی تصنیف ہے۔ حیدرآباد دکن۔ ۱۳۲۷ھ۔

۳۶۔ مشارق الانوار علی صحاح الآثار، "الشفاء" کے مصنف قاضی عیاض (۴۹۶ھ - ۵۴۴ھ / ۱۱۰۲ء - ۱۱۴۹ء) کی تصنیف ہے ۱۳۳۳ھ

۳۷۔ الدر النثیر فی تلخیص نہایۃ ابن الاثیر۔ جلال الدین السیوطی کی تصنیف ہے۔

۳۸۔ شیخ محمد علی بن شیخ علی بن قاضی محمد حامد بن محمد صابر تھانوی کی تصنیف ہے۔ سنہ وفات معلوم نہیں۔ تمام محققین نے یہی لکھا ہے کہ "کشاف" کے سنہ تصنیف یعنی ۱۱۵۸ھ / ۱۷۴۵ء کے بعد فوت ہوئے۔ رک: البغدادی: ہدیۃ العارفین ۲: ۳۲۶، فہرس الازہریۃ ۷: ۲۶۲،

فہرست الخدیویۃ ۴ : ۱۶۹؛ فندیک : اکتفاء القنوع ۳۲۸؛ الزرکلی: الأعلام ۷ : ۱۸۸-
۱۸۹؛ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۳ : ۲۴۷؛ براکلمان ۲ : ۲۱۴؛ معجم المؤلفین ۱۱ : ۴۷

مولوی محمد وجیہ، مولوی عبدالحق اور مولوی عبدالقادر نے اشپرنگر اور ناسولیس (Nassau Lees) کی زیرنگرانی اس لغت کو ۱۰ حصوں میں مرتب کر کے کلکتے سے شائع کیا (۱۸۴۸ء - ۱۸۶۱ء)۔ ۱۸۶۲ء میں کلکتہ سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ آخر میں نجم الدین کاتبی کا "رسالہ شمسیہ" (مع انگریزی ترجمہ از ڈاکٹر اشپرنگر) بھی شائع ہوا۔ جو اس سے قبل ۱۸۵۴ء میں کتابی صورت میں علیحدہ شائع ہوا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں اسی کا فوٹو ایڈیشن تہران سے شائع ہوا۔ مطبوعہ استانبول ۱۳۱۷ھ۔ مصر ۱۳۸۲ھ۔ بیروت ۱۹۶۶ء۔

۳۹۔ بحر الجواہر فی تحقیق مصطلحات الاطبا من العربیۃ و اللاطینیۃ و الیونانیۃ (جواہر اللغۃ کے نام سے بھی مشہور ہے) از محمد بن یوسف ہروی (م ۹۳۳ھ / ۱۵۲۶ء)۔ رک : براکلمان ذ ۲: ۵۹۲؛ اردو ترجمہ از حسین شاہ و صاجد تامل۔ امرتسر، ۱۸۷۸ء

۴۰۔ اس کتاب کے مصنف کے حالاتِ زندگی معلوم نہیں ہو سکے۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ ۷۲۴ھ / ۱۳۲۳ء سے پہلے کا مصنف ہے۔ اس لغت کا ایک مصور قلمی نسخہ بقلم احمد بن ...ت (مکتوبہ ۹۲۵ھ / ۱۵۱۹ء) دار الکتب الجمہوریۃ العربیۃ المتحدۃ میں موجود ہے (رک: فہرست المخطوطات نشرۃ بالمخطوطات التی اقتنتہا الدار من سنۃ ۱۹۳۶ء - ۱۹۵۵ء۔ فؤاد سید۔ قاہرہ، ۱۹۶۱ء۔ ۱: ۲۸۔ دیگر قلمی نسخوں کے لیے رک : الوارٹ ش ۶۲۳۶؛ قاہرہ ۲: ۳۶؛ رامپور ۴۶۷؛ بانکی پور ۴ : ۱۰۳۔

۴۱۔ عبدالرزاق الکاشانی (م ۔ بعد ۷۳۰ھ / ۱۳۲۹ء) رک : کشف الظنون (استانبول) ۱۰۰۷، ۲۲۲؛ ایضاح المکنون ۱ : ۱۶ د؛ کتب خانہ ولی الدین ۷؛ البغدادی: ہدیۃ العارفین ۱: ۶۶۸؛ معجم المؤلفین ۵ : ۲۱۵؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (بارٹولڈ) ۶۳ - ۶۵؛ براکلمان ۲: ۲۰۳؛ ذ ۲ : ۲۸۰۔

۴۲۔ مرتبہ اشپرنگر۔ کلکتہ، ۱۸۴۵ء مملوکہ راقم۔

۴۳۔ اس کتاب کے متعلق راقم کو معلوم نہیں ہو سکا۔

۴۴۔ براکلمان اور دیگر معتبر مآخذ میں اس کتاب کا نام نہیں ملتا۔

۴۵۔ ابو عبید البکری الاندلسی (۴۳۲ھ ـ ۴۸۷ھ / ۱۰۴۰ء ـ ۱۰۹۴ء) کی کتاب الموسوم بہ المغرب فی ذکر بلاد افریقیۃ والمغرب کی طرف اشارہ ہے۔ مطبوعہ الجزائر، ۱۸۵۷ء۔ مرتبہ بارن دی سلان (BARON de SLANE) طبع دوم۔ پیرس ۱۹۱۱ء۔ رک: براکلمان ۱: ۴۷۶، ذا: ۸۷۵۔ حال ہی میں اس کتاب کا ایک فوٹو ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔

۴۶۔ ابو الفدا (۶۷۲ھ ـ ۷۳۲ھ / ۱۲۷۳ء ـ ۱۳۳۱ء) رک: فوات الوفیات ۱: ۱۶، طبقات السبکی ۶: ۸۴، براکلمان ۲: ۴۶، ذا ۲: ۴۴۔ ابو الفدا کی 'تقویم البلدان' کی طرف اشارہ ہے۔ (معجم المطبوعات ۳۳۴ ـ ۳۳۵)۔

۴۷۔ زکریا بن محمد بن محمود القزوینی (۶۰۰ھ ـ ۶۸۲ھ / ۱۲۰۳ء) رک: براکلمان ۱: ۴۸۱، ذا ۱: ۸۸۲۔

۴۸۔ آثار البلاد واخبار العباد سنہ تکمیل ۶۷۴ھ / ۱۲۷۶ء ہے۔ وستنفلٹ (Wüstenfeld) نے مرتب کیا (۱۸۴۸ء ـ ۱۸۵۰ء)

۴۹۔ عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات۔ لائپزیگ، ۱۸۴۸ء۔ مصر ۱۳۴۵ھ۔ اس کتاب کے فارسی تراجم کے لیے رک: سٹوری ۲ (۱): ۱۲۵ ـ ۱۲۶۔

۵۰۔ صحیح نام 'سیر البلاد' ہے۔ محمد مراد بن عبد الرحمن نے شاہجہاں کے دور حکومت (۱۰۳۷ ـ ۱۰۶۸ھ / ۱۶۲۸ء ـ ۱۶۵۸ء) میں اپنے سرپرست میر علی اصغر موسوی خاں (م۔ ۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء) کے لیے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۵۱۔ اکبر کے دور حکومت (۹۶۳ھ ـ ۱۰۱۴ھ / ۱۵۵۶ء ـ ۱۶۰۵ء) میں ہندوستان آیا اور یہیں ۱۰۰۲ھ / ۱۵۹۳ء میں 'ہفت اقلیم' لکھی۔ اس میں تقریباً ۱۵۶۰ شعرا، علما، صوفیا وغیرہ کے حالاتِ زندگی قلمبند کیے گیے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض ممالک کے جغرافیائی کوائف بھی درج کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے قلمی نسخے کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور میں موجود ہیں، کلکتہ سے تین کراسوں کی صورت بالترتیب ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ مطبوعہ تہران، ۱۳۴۰ھ۔ رک: سٹوری ۱ (۲): ۱۱۶۹ ـ ۱۱۷۱، تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان ۱۱۶ ـ ۱۲۳۔

۵۲۔ جمال الدین محمد بن ابراہیم بن یحییٰ الوراق الکتبی المعروف بالوطواط (۶۳۲ھ۔ ۷۱۸ھ/۱۲۳۵ء۔ ۱۳۱۸ء) رک: کشف الظنون ۵: ۳۶۱؛ برلین۔ ش ۶۰۴۵ و ۶۲۰۷؛ بوہار ۲: ۳۱۰ - ۳۱۱؛ براکلمان ۲: ۵۴۔

۵۳۔ ابو مخنف لوط بن یحییٰ بن سعید۔ شیعہ مشاہیر میں سے تھے۔ براکلمان نے سنہ وفات ۱۸۰ھ/۷۹۶ء لکھا ہے، لیکن فخر الدین محمد بن شاکر نے 'فوات الوفیات' میں ۱۵۷ھ/۷۷۳ء لکھا ہے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد ۳۲ ہے۔ اشپرنگر نے اُن کی جن دو کتابوں کا حوالہ دیا ہے، اُن کے نام یہ ہیں:
۱۔ کتاب مقتل الحسینؓ ۲۔ کتاب اخبار مختار بن ابی عبیدہ۔ رک: الفہرست ۹۳؛ ابن قتیبہ ۲۶۷؛ معجم الادباء ۱۶: ۲۲۰؛ نامۂ دانشوران ناصری۔ چاپ دوم ۱: ۵۱ - ۵۲۔ مندرجہ ذیل ماخذ سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے:۔

Macoudi, Les Prairies d'Or, texte arabe et trad. francaise par C. Barbier de Maynard et Pavet de Courteille, Paris tome 1, p.10; Wüstenfeld, Der Tod der Husein ben Ali Göttingen, 1883, pp. iii-iv; W. Barthold's article in Zapiski, xvii pp. 147-49; Encyclopedia of Islam (N. ed.) vol. 1, p.140; Historians of the Middle East, pp. 48 ff.

۵۴۔ ابو جعفر الطوسی (۳۸۵ھ۔ ۴۶۰ھ/ ۹۹۵ء۔ ۱۰۶۷ء) رک: روضات الجنات ۵۸۰۔

۵۵۔ اس کتاب کو ڈاکٹر اشپرنگر نے مولوی عبدالحق کے تعاون کے ساتھ کلکتہ سے شائع کیا تھا۔ ۱۸۵۳ء۔ ۱۸۵۵ء مطبوعہ نجف ۱۹۶۱ء

۵۶، ۵۷۔ ان دونوں کتابوں کے متعلق راقم کو معلوم نہیں ہو سکا۔

۵۸۔ اس کتاب کا عنوان یہ ہے 'اخبار عبید بن شریہ الجرہمی فی اخبار الیمن و اشعارہا و انسابہا' عبید بن شریہ صنعاء کے رہنے والے تھے امیر معاویہؓ (۴۱ھ۔ ۶۰ھ/ ۶۶۱ء۔ ۶۸۰ء) کے قریبی آدمیوں میں سے تھے۔ چنانچہ مذکورہ تاریخ انہیں کے بعض سوالات کے جواب میں لکھی گئی ہے

کافی عرصہ تک دمشق میں قیام پذیر رہے۔ عبد الملک بن مروان کے عہد خلافت (۶۵ھ۔ ۸۶ھ/ ۶۸۴ء۔ ۷۰۵ء) میں وفات پائی۔ رک: فہرست برٹش میوزیم (عربی) ضمیمہ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔

۵۹۔ براکلمان ۱: ۱۲۱' ذ۱: ۱۸۵' چیسٹر بیٹی (عربی) ۴: ۷' باکی پور ۱۵: ۱۔۲' و

The Life and Works of Ibn Qutaiba. By J.M. Husain, Lebanon, 1950.

وستنفلٹ نے اس کتاب کو گوٹنگن سے ۱۸۵۰ء میں شائع کیا تھا' بار دوم ۱۹۶۰ء و مرتبہ ثروت عکاشا۔ قاہرہ' ۱۹۶۰ء۔

۶۰۔ مطبوعہ ۱۳۲۲ھ۔ بہ تصحیح محمد محمود الرافعی دو جلد مصر ۱۳۲۷ھ و ۱۳۳۱ھ ۔ اس کتاب کے متعلق بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ کتاب ابن قتیبہ کی تصنیف نہیں ہے' بلکہ اُن سے منسوب ہے۔ اِن اختلافی مباحث کی تفصیل کے لیے رک:

جبرائیل جبّور کے مقالات' جو بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے عربی رسالے' الابحاث' میں شائع ہوئے۔ ج ۱۳۔ ش ۳ (۱۹۶۰ء)۔

ج ۱۴۔ ش ۳ (۱۹۶۱ء) ص ۳۲۹۔ ۳۴۱۔

اسی سلسلے میں محمد یوسف نجم کا ایک مقالہ بھی اِسی رسالے میں شائع ہوا ہے ج ۱۴ ش ۱ (۱۹۶۱ء) ص ۱۲۲۔ ۱۳۲۔

۶۱۔ الواقدی (۱۳۰ھ۔ ۲۰۷ھ/ ۷۴۷ء۔ ۸۲۳ء) رک: الفہرست ۱: ۹۸۔ ۹۹' ابن خلکان ۴: ۵۲' الدیباج المذہب ۲۴۰' روضات الجنات ۴: ۱۵۶' ابن سعد ۵: ۳۱۴۔ ۳۲۱' براکلمان ۱: ۱۳۶' ذ۱: ۲۰۷۔ ۲۰۸۔

۶۲: واقدی کی "المغازی" انگریزی مقدمہ اور شرح کے ساتھ بارن فان کریمر نے مرتب کی' (کلکتہ ۱۸۵۵ء۔ ۱۸۵۶ء) برلین سے بھی شائع ہوئی (۱۸۸۲ء)' ۱۹۶۶ء میں مرسڈن جونز نے اس کو تین جلدوں میں مرتب کر کے اسکول آف اورئنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن سے شائع کیا' صفحات ۱۴۰۳۔

۶۳۔ محمد بن اسحاق (۸۵ھ۔ ۱۵۰ھ/ ۷۰۴ء۔ ۷۶۷ء) رک: معجم الادباء ۶: ۳۹۹' ابن خلکان ۱:

۱۱ھ' براکلمان ۱: ۱۳۴' ذا: ۲۰۵' انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۲: ۳۸۹ - ۳۹۰۔ ابن اسحاق کی اصل کتاب ناپید ہے۔ حال ہی میں اس کا ایک قلمی نسخہ Fez سے دستیاب ہوا ہے۔

۶۴۔ عبدالملک بن ہشام (م۔ ۲۱۸ھ / ۸۳۴ء) رک: ابن خلکان ۱: ۳۶۵' بغیۃ الوعاۃ ۳۱۵' براکلمان ۱: ۱۳۵' ذا: ۲۰۶' انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۲: ۳۸۷۔

سیرت ابن ہشام' ابن اسحاق کی کتاب کی تلخیص ہے۔ مطبوعہ گوٹنگن (مرتبہ وستنفلٹ) ۳ جلد' ۱۸۵۸ء - ۱۸۶۰ء۔ بار دوم' فرینکفرٹ ۱۹۶۱ء۔ بولاق ۱۸۷۸ء' قاہرہ ۱۹۰۶ء جرمن ترجمہ از جی۔ وائل (G. WEIL)۔ (شٹٹ گارٹ' ۱۸۶۴ء)، دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا تھا۔

۶۵۔ براکلمان نے اس کا نام احمد بن ابراہیم الواسطی (م۔ ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء) لکھا ہے (ذ ۱: ۲۰۶) گوٹنگن (۸۶) اور لائیڈن (۸۶۲) کے کتب خانوں میں اس تلخیص کے قلمی نسخے موجود ہیں 'سیرت ابن ہشام' کی ایک فارسی تلخیص 'ترجمہ سیر النبیؐ' کے عنوان سے ہوئی۔ مترجم کے نام کا پتہ نہیں چل سکا۔ البتہ فارسی ترجمے کا کام اتابک سعد بن زنگی کے حکم سے ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء یا ۶۲۰ھ / ۱۲۲۳ء میں شروع ہوا۔ رک ہسٹوری ۳: ۱۔

۶۶۔ امام الحافظ ابو حاتم محمد بن حیان بن احمد بن حبان البستی التیمی۔

۶۷۔ م ۳۵۴ھ/۹۶۷ء رک: طبقات السبکی ۲: ۱۴۱' معجم المطبوعات ۵۶۳

۶۸۔ کتاب کا نام 'روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء' ہے۔ مطبوعہ کردستان ۱۳۲۸ھ۔

۶۹۔ اصل کتاب کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ اس کی ایک تلخیص 'مختصر تاریخ الیافعی' کے نام سے ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں لکھی گئی (فہرست برٹش میوزیم (عربی)، ۴۲۷ وضمیمہ ۴۵۳)

۷۰۔ الخمیس فی احوال النفس نفیس المعروف بہ تاریخ الخمیسی۔ ۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء میں لکھی گئی مطبوعہ ۱۲۸۳ھ۔ دو جلد۔ رک:

Al-Fihris (Catalogue de Manuscrits Arabes). Premiére partie. Ouvrages des Auteurs Antérieurs au xvii, siécle, Le Caire, 1938, p. 99.

۷۱۔ قاضی حسین بن محمد بن الحسن الدیار بکری المالکی (م۔ ۹۶۶ھ/ ۱۵۵۸ء یا ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء)

۷۲۔ شاید اس سے مراد تقی الدین ابو الطیب محمد بن احمد بن علی الفاسی المالکی (۷۷۵ھ۔ ۸۳۲ھ/ ۱۳۷۳ء۔ ۱۴۲۹ء) کی تاریخ الموسوم بہ "تحفۃ الکرام باخبار البلد الحرام" ہے جس کو وستنفلڈ نے اسی موضوع کی بعض دوسری کتابوں کے ساتھ شائع کیا تھا۔ رک:

F. Wüstenfeld : Auszüge aus den Geschichtsbüchern der Stadt Mekka von Muhammad el-Fakihi, Muhammad el-Fasi und Muhammad Ibn Dhuhaira, Leipzig, 1859. 3 vols.

مزید تفصیل کے لیے رک: بانکی پور ۱۵: ۱۶۸۔ ۱۷۴۔

۷۳۔ اس کتاب کے متعلق راقم کو معلوم نہیں ہو سکا۔

۷۴۔ ۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء میں لکھی گئی۔ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں شہر مدینہ کے نام، اس کی تاریخی اور مذہبی اہمیت اور وہاں کی مساجد وغیرہ کی تفصیلات جمع کی گئی ہیں۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۶ھ (دو جلد)۔ رک: بانکی پور ۱۵: ۱۷۹۔ ۱۸۰ و

Al-Fihris...op.cit, p. 103.

۷۵۔ اس کتاب کے متعلق ضروری تفصیلات مندرجہ ذیل مقالے میں جمع کر دی گئی ہیں۔

A valuable historical Manuscript of Arabic-Al-Iktifa. By K.A. Fariq (Islamic Culture 33 (1959), pp.161-68)

اس کتاب کا ایک فارسی ترجمہ اشپرنگر کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا جس کے آخر میں اُس نے اپنے قلم سے کتاب اور مصنف کے بارے میں چند عبارتیں لکھی ہیں۔ رک: فہرست برلین (فارسی) ۵۱۱۔

۷۶۔ خلاصۃ الوفا فی اخبار المصطفیٰ۔ ۸۹۳ھ/ ۱۴۸۷ء میں لکھی گئی۔ مطبوعہ مکہ ۱۳۱۶ھ، قاہرہ ۱۲۸۵ھ رک: کشف الظنون ۲: ۵۰۰، ۴۵، اکتفاء القنوع ۳۸۰، براکلمان ۲: ۱۷۴، بانکی پور ۱۵: ۱۸۱

۷۷۔ نور الدین ابو الحسن علی بن عبد اللہ بن احمد الحسنی السمہودی الشافعی (۸۴۴ھ۔ ۹۱۱ھ/ ۱۴۴۰۔ ۱۵۰۶ء)

بالائی مصر کے ایک گاؤں سمہود میں پیدا ہوئے ۸۵۳ھ / ۱۴۴۹ء میں قاہرہ پہنچے اور وہاں کے علمائے کرام سے استفادہ کرتے رہے۔ ۸۷۵ھ / ۱۴۶۸ء میں حرمین شریفین کی زیارت کو روانہ ہوئے اور وہیں قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مکہ میں اُن کے پاس ایک عمدہ کتب خانہ تھا، جو ۸۸۶ھ / ۱۵۰۵ء میں آگ لگنے کی وجہ سے جل گیا۔ رک: کشف الظنون ۱۲ : ۲۵۰، براکلمان ۲ : ۱۷۳

۷۸۔ اِس کتاب کا اصل نام 'الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام' ہے۔ مندرجہ ذیل عنوان کے تحت شائع ہو چکی ہے:۔

Chroniken der Stadt Mekka. F. Wüstenfeld. 4 vols Leipzig 1858-59. New ed. Beirut, 1964.

اس کتاب کے قلمی نسخوں کی تفصیل کے لیے رک: بانکی پور ۱۵ : ۱۷۴۔ ۱۷۵۔

۷۹۔ قطب الدین محمد بن احمد بن قاضی محمود النہروالی۔ گجرات (ہندوستان) کے ایک عالم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نہروالہ میں پیدا ہوئے۔ بعد میں مکہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی کافی عرصے تک وہاں کے قاضی بھی رہے۔ سنہ وفات ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء۔ رک: براکلمان ۲ : ۲۸۱، اکتفا القنوع ۸۳۔ یہ کتاب سلطان مراد سوم (۹۸۲ھ۔۱۰۰۳ھ / ۱۵۷۴ء۔۱۵۹۵ء) کے نام معنون ہے۔

۸۰۔ اس کتاب کا صحیح نام 'تذکرۃ خواص الامۃ بذکر خصائص الائمۃ' ہے۔ شیخ محمد بن طلحہ (مصنف العقد الفرید للملک السعید) کی 'مطالب السئول فی مناقب آل الرسول' کے ساتھ تہران سے شائع ہوئی (۱۲۸۵ھ، ۱۲۸۸ھ)

۸۱۔ اشپرنگر نے مصنف کا نام غلط لکھا ہے۔ علاوہ ازیں 'الجنزی' کی بجائے 'الجوزی' ہونا چاہیے یہ کتاب ابوالفرج عبدالرحمٰن بن ابی الحسن علی بن محمد بن علی بن الجوزی (۵۱۰ھ۔۵۹۷ھ / ۱۱۱۶ء۔۱۲۰۰ء) کی تصنیف نہیں بلکہ ابوالمظفر شمس الدین یوسف بن قزاوغلی بن عبداللہ المعروف بہ سبط ابن الجوزی الترکی ثم البغدادی (۵۸۲ھ۔۶۵۴ھ / ۱۱۸۶ء۔۱۲۵۶ء) کی تصنیف ہے رک: ابن قطلوبغا ۶۱، نفح الطیب ۱ : ۸۴، الفوائد البہیۃ ۲۳۰، ابن خلکان ۲ : ۳۲۱۔

در ذکر وزیر یحییٰ بن ہبیرہ' مفتاح السعادۃ ۱: ۲۰۸ ۔ 'مرآۃ الزمان فی تاریخ الاعیان' (مرتبہ James Richard Jowet ۱۹۰۷ء) بھی اس کی مشہور تصنیف ہے۔

۸۲۔ محمد باقر بن محمد تقی بن مقصود علی اصفہانی المشتہر بہ المجلسی (۱۰۳۸۔۱۱۱۰ھ/۱۶۲۸۔۱۶۹۸ء)
محمد باقر کے پوتے احمد بن محمد علی نے ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں ایک کتاب بعنوان مرآۃ الاحوال جہاں نما لکھی جس میں مجلسی خاندان کے علماء کے تفصیلی حالاتِ زندگی لکھے گئے ہیں۔ اس مخطوطے کے ورق ۲۶ و (نسخہ برٹش میوزیم) پر درج ہے کہ 'بحار الانوار' (عربی) ۲۵ جلدوں پر مشتمل تھی (اشپرنگر نے ۲۴ لکھا ہے) ان میں سے سولہ جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ (اس ضخیم کتاب کی جلد ۸، ۱۰ اور ۱۳ ایران سے ۱۲۷۰ھ۔۱۲۷۵ھ کے درمیان شائع ہوئیں) بحار الانوار' شاہ سلطان حسین (۱۱۰۵ھ۔۱۱۳۵ھ/۱۶۹۳ء۔۱۷۲۲ء) کے نام معنون ہے 'مرآۃ الاحوال' میں محمد باقر کی ۹ عربی اور ۴۹ فارسی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے (ورق ۱۳ب) محمد باقر نے اس کتاب کی ایک تلخیص 'زاد المعاد' کے نام سے کی تھی (تہران ۱۲۴۴ھ۔ اردو ترجمہ مطبوعہ کراچی) جس کی بین السطور تشریح فارسی زبان میں ہے۔
رک، مرآۃ الاحوال (قلمی)، قصص الخاقانی (قلمی)، ابن داؤد ولی قلی شاملو' ورق ۵۰ ب' شاہد صادق (قلمی)، صادق بن صالح اصفہانی ورق ۱۹۸ ب؛ روضات الجنات ۱: ۱۲۰۔

۸۳۔ اس کتاب کا ذکر مذکورہ بالا 'مرآۃ الاحوال' میں موجود ہے۔

۸۴۔ Rev. James L. Merrick نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ شائع کیا تھا۔ بوسٹن ۱۸۵۰ء۔

۸۵۔ امین الدولہ امداد حسین خاں سلطنتِ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ اختر (۱۲۳۷ھ۔۱۳۰۵ھ/۱۸۲۲ء۔۱۸۸۷ء) کے خاص اتالیق تھے۔ انھوں نے دو کتابیں 'میزان الطب' اور 'شرح اسباب' ان سے پڑھی تھیں (محل خانۂ شاہی لکھنؤ۔ ۱۹۲۶ء۔ ۲۸)۔ یہ وہی امین الدولہ ہیں کہ لکھنؤ میں امین آباد اور امین الدولہ پارک اب بھی اُن کے نام کی یاد دلاتے ہیں (رک: لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ۱۳۰)

۸۶۔ عیون الاخبار الرضا۔ از ابو جعفر محمد بن علی بن بابویہ القمی۔ چوتھی صدی ہجری کے شیعہ مشاہیر میں

سے تھے۔ ۳۵۵ھ/۹۶۶ء میں خراسان سے بغداد گئے اور رے میں ۳۸۱ھ/۹۹۱ء یا ۳۹۱ھ/۱۰۰۰ء میں وفات پائی۔ اس کتاب میں آٹھویں امام علی رضا کے حالات زندگی اور اقوال قلمبند کیے گئے ہیں۔ قطب شاہی سلطنت کے فرماں روا عبداللہ قطب شاہ (براکلمان نے صرف قطب شاہ لکھا ہے) کے دور حکومت (۱۰۳۵ھ-۱۰۸۳ھ/۱۶۲۶ء-۱۶۷۲ء) میں اس کا فارسی ترجمہ 'تحفۂ مالکی' کے نام سے ہوا۔ رک: براکلمان ۱: ۱۸۷، ذ ۱: ۳۲۱، اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ ج ۱، کراسہ ۷، ص ۴۲۶ از ہدایت حسین۔ فیضی ۱۴۴-۱۴۵۔

کچھ عرصہ پیشتر 'عیون الاخبار' کا ایک قلمی نسخہ جرمنی کے ایک مشہور کتب فروش کے پاس تھا۔ اوراق ۲۶۶۔ مکتوبہ جمادی الثانی ۱۰۳۲ھ۔

(Otto Harrassowitz Spezial-Listen, Liste 42. 'Der Vordere in Christlicher und Islamischer Zeit : Islamische Handschriften, p. 4.)

۸۷۔ نہایۃ الارب فی معرفۃ العرب بغداد۔ ۱۳۳۲ھ۔ محمد امین السویدی کی 'سبائک الذہب فی معرفۃ قبائل العرب' (بمبئی ۱۲۹۶ھ) اسی کتاب پر مبنی ہے۔

۸۸۔ احمد بن علی القلقشندی (۷۵۶ھ-۸۲۱ھ/۱۳۵۵ء-۱۴۱۸ء)

۸۹۔ حلب کے قاضی ناصر الدین الناصر (م۔ ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء) کے لیے ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء اور ۸۲۱ھ کے درمیان لکھی گئی (فہرست برٹش میوزیم۔ عربی ضمیمہ ۳۸۶-۳۸۷) اس کا ایک قلمی نسخہ دارالکتب الجمہوریۃ العربیۃ المتحدۃ میں موجود ہے۔ مکتوبہ ۹۸۷ھ۔ (فہرست مذکورہ۔ ۲: ۲۱۹) عمر رضا کحالہ نے 'معجم القبائل العربیۃ' (مصر، ۳ جلد ۱۹۶۸ء) کی ترتیب و تدوین میں اس کتاب سے کافی استفادہ کیا ہے۔ رک:

Wüstenfeld, F. Genealogische Tabellen der Arabischen Stämme und Familien

mit historischen und Geographischen Bemerkungen in einem alphabetischen Register, Göttingen, 1852-53. Reprint 1968.

تاریخ القبائل العربیة۔ شیخ زین الشحوری (م ۱۲۱۱ھ)، (رک: الذریعة ۳: ۲۷۴)

۹۰۔ عمدة الطالب فی انساب (مناقب) آل ابی طالب۔ بمبئی، ۱۳۱۸ھ۔ یہ ابن عنبة الحسنی (م ۸۲۹ھ / ۱۴۲۵ء) کی تصنیف ہے۔

۹۱۔ اشپرنگر کا اشارہ ایلیٹ کی 'ہسٹری آف انڈیا' کی طرف ہے، جس کے متعلق اس مقالے کی ابتدا میں بالتفصیل روشنی ڈالی گئی ہے۔

۹۲۔ مصنف کا نام معین الدین ابو العباس احمد بن ابی الخیر شیرازی المعروف بہ ابن زرکوب شیرازی ہے۔ سنہ وفات ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء۔ اس کو 'شیراز نامہ' بھی کہتے ہیں۔ اس میں شیراز کی تاریخ ۷۴۴ھ / ۱۳۴۳ء تک لکھی گئی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اشپرنگر کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا۔ (برلین ۲۰۹) مطبوعہ تہران ۱۹۳۲ء مرتبہ بہمن کریمی۔

۹۳۔ ظہیر الدین ابو الحسن علی بن زید البیہقی المعروف بہ ابن فندک (۴۹۹ھ - ۵۶۵ھ / ۱۱۰۶ء - ۱۱۶۹ء) کی تصنیف ہے۔ سنہ تصنیف ۵۶۳ھ / ۱۱۶۸ء ہے رک: کشف الظنون ۲: ۱۲۲؛ معجم الادباء ۵: ۲۰۸ - ۲۱۸، ریو۔ ضمیمہ ۸۹، برلین ۵۳۵، براکلمان ۱: ۳۲۴، ذ ۱: ۵۵۷ - ۵۵۸، ستوری (۵۳۲)؛ ۳۵۳ - ۳۵۴۔ مرتبہ احمد بہمن یار۔ تہران ۱۳۱۷ / ۱۹۳۸ء

۹۴۔ سیف بن محمد بن یعقوب ہروی المعروف بہ سیفی ہروی کی تصنیف ہے۔ مصنف کا سنہ ولادت ۶۸۱ھ / ۱۲۸۲ء ہے۔ اس میں ہرات کی تاریخ ۶۱۸ھ / ۱۲۲۱ء سے ۷۲۱ھ / ۱۳۲۱ء تک بیان کی گئی ہے رک۔

Notes on a unique History of Herat, discovered in the Buhar Collection of MSS. in the Imperial Library, Calcutta

By Maulvi Abdul Muqtadir (JASB, N.S; vol xii (1916) pp. 165-84.)

بعد میں اسی تاریخ کو محمد زبیر صدیقی نے 'تاریخ نامۂ ہرات' کے نام سے مرتب کر کے
کلکتہ سے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔

۹۵۔ روضۃ الاحباب فی سیر النبی والآل والاصحاب۔ از میر جمال الدین عطاء اللہ بن فضل اللہ
حسینی شیرازی (م۔ ۹۲۶ھ / ۱۵۲۰ء) میر علی شیر کے ایما پر لکھی گئی۔ سنہ تکمیل
۹۰۰ھ / ۱۴۹۴ء ہے۔ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں آنحضرت صلعم کے حالات زندگی
درج ہیں۔ یہ حصہ ۸۸۸ھ / ۱۴۸۴ء میں مکمل ہوا۔ اشپرنگر نے اسی حصے کی طرف اشارہ
کیا ہے۔ دوسرے باب میں پہلے تین خلفائے راشدین کا ذکر ہے اور تیسرے باب میں
حضرت علیؓ اور بارہ اماموں کے سوانح حیات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا ایک قلمی
نسخہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور میں موجود ہے۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۹۷ھ رک:
سٹوری ۱۸۹۔۱۹۱، چیسٹر بیٹی (فارسی) ۲: ۶۶۔۶۷۔

۹۶۔ معین الدین بن شرف الدین حاجی محمد فراہی ہروی المعروف بہ معین المسکین (م۔ ۹۰۷ھ /
۱۵۰۱ء) کی تصنیف ہے۔ مشہور مبلغ تھے۔ ایک سال کے لیے ہرات کے قاضی بھی رہے۔
(رک: حبیب السیر ۳: ۳، ۳۳۸ حدائق الحنفیہ ۳۵۸، ریو ۱: ۱۴۹) اس کے قلمی نسخے
بکثرت دستیاب ہیں۔ (سٹوری ۱۸۷۔۱۸۸) کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ لکھنؤ ۱۸۷۵ء،
لاہور ۱۸۷۵ء، کانپور ۱۸۸۲ء، ۱۸۸۷ء، بمبئی ۱۸۸۳ء، ۱۹۰۶ء۔

۹۷۔ صفوی سلطنت (۹۰۷ھ۔ ۱۱۴۸ھ / ۱۵۰۲ء۔ ۱۷۳۶ء) کے آخری بادشاہ ابو الفتح سلطان
محمد مرزا بہادر خاں صفوی کے لیے لکھی گئی' جو ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء میں سندھ کی طرف بھاگ
گیا اور ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء میں لکھنؤ میں اقامت پذیر ہوا۔ سنہ تکمیل ۱۲۱۱ھ ہے۔ لیکن بعض
قلمی نسخوں میں ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء تک کے حالات بھی درج ہیں۔ رک: سٹوری ۳۱۹۔۳۲۰

۹۸۔ تاریخ شاہ اسمٰعیل اول صفوی (۹۰۷ھ۔ ۹۳۰ھ / ۱۵۰۲ء۔ ۱۵۲۴ء) کے مصنف کا نام معلوم نہیں
ہو سکا۔ شاہ طہماسپ صفوی کے دور حکومت (۹۳۰ھ۔ ۹۸۴ھ / ۱۵۲۴ء۔ ۱۵۷۶ء) میں لکھی گئی۔

مصنف نے 'حبیب السیر' سے کافی استفادہ کیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے (ریو، ضمیمہ ۵۲) جس کے ورق ۲۰ تا ورق ۵۰ تک کا انگریزی ترجمہ چھپ گیا ہے۔ رک:

The Early years of Shah Ismail Founder of the Safavi Dynasty. By E. Denison Ross. (JRAS, 1896, pp. 249-340)

۹۹- سید ظہیر الدین بن نصیر الدین مراعشی کی تصنیف ہے۔ سنہ پیدائش ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء ہے۔ ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں بقید حیات تھا۔ ۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء تک کے واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ روسی مستشرق ڈورن نے مندرجہ ذیل عنوان کے تحت مرتب کی تھی:

Sehir-eddin's Geschichte von Tabaristan, Rujan und Masandran, Persischer Text, Herausgegeben von B. Dorn, St. Peterburg, 1850. pp. 46 + 643.

بقول مینورسکی اس کا جرمن ترجمہ ڈورن نے ۱۸۸۵ء میں شائع کیا تھا (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ زیر 'مازندران') رک: دیباچہ از ڈورن ۹-۲۲۔

۱۰۰- کمال الدین عبد الرزاق بن جلال الدین اسحاق سمرقندی (۸۱۶ھ-۸۸۷ھ/۱۴۱۳ء-۱۴۸۲ء) 'تاریخ ابوسعید بہادر خاں' الگ تصنیف نہیں بلکہ عبد الرزاق سمرقندی کی مشہور تاریخ الموسوم بہ 'مطلع السعدین فی مجمع البحرین' کا پہلا دفتر ہے، جو ایلخان ابوسعید کی ولادت سے امیر تیمور کی وفات اور سمرقند میں خلیل سلطان کی تخت نشینی (۸۰۷ھ/۱۴۰۴ء) سے لے کر ابوالغازی سلطان حسین کی دوبارہ تخت نشینی (۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء) تک کے حالات پر مبنی ہے۔ (سٹوری ۲۹۳-۲۹۸) 'مطلع السعدین' کا ایک روٹو گراف کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے اسی کے دفتر دوم کے بعض حصے اورنٹیل کالج میگزین (مئی و اگست ۱۹۳۳ء)

میں شائع کیے تھے، جو بعد میں کتابی صورت میں بھی چھپے۔ غضنفر علی نے اس کا
اردو ترجمہ کیا۔ مطبوعہ تاج بک ڈپو۔ لاہور۔

۱۰۱۔ اس تاریخ پر اشپرنگر نے ایک تفصیلی مقالہ لکھا تھا۔ رک :

Ballamy's Translation of the History of Tabary and Ghazzaly's History of the Prophets. (JASB, vol. xvii, pt.ii (1848), pp. 437 ff.).

۱۰۲۔ شاید سید محمد قنوجی (م۔ ۱۱۰۱ھ / ۱۶۸۹ء) مصنف 'حاشیۂ مطول' کی طرف اشارہ ہے رک: نزہتہ الخواطر ۲: ۲۵۳ - ۲۵۴، مآثر الامرا ۳: ۹۱۰۔

۱۰۳۔ اورنگ زیب عالمگیر کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ اپنے باپ کے خلاف بغاوت کردی۔ ناکام ہو کر ایران چلا گیا۔ وہیں ۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء میں وفات پائی۔

(An Oriental Biographical Dictionary. p. 212).

۱۰۴۔ 'بابر نامہ' کا اصل چغتائی زبان کا ایڈیشن مندرجہ ذیل عنوان کے تحت شائع ہوا۔

Baber Nameh : Diagataice, Ad Fidem Codicis Petropolitani. Edidit N. Ilminsky, Cozani, 1857, pp. 506.

بعد ازاں اے بیورج نے ۱۹۰۵ء میں لندن سے شائع کیا۔ استانبول سے بھی دو جلدوں میں شائع ہو گیا ہے (۱۹۴۳ء - ۱۹۴۵ء) مرتبہ آر۔ رحمتی ارات۔
رک:

Turkish Literature : A Bio-Bibliographical Survey, vol. I, pp. 162-83; Encyclopedia of Islam (N. ed.) vol. 1, pp. 847-50.

۱۰۵۔ قاضی ابو یوسف (۱۱۳ھ-۱۸۲ھ/۷۳۱ء-۷۹۸ء)۔ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد رشید تھے۔ مملکت عباسیہ میں قاضی القضاۃ کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ اپنے فضل و کمال، پایۂ اجتہاد، ذہانت و فراست اور قوت استدلال کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے۔ علوم معقول و منقول پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ مہدی (۱۵۸ھ-۱۶۹ھ/۷۷۵ء-۷۸۵ء) اور موسیٰ ہادی (۱۶۹ھ-۱۷۰ھ) کے دور حکومت میں قاضی رہے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے بھی انھیں قاضی القضاۃ کے عہدے پر سرفراز کیا۔ انھوں نے قیصر ہارون الرشید کے احوال و معاملات سے متعلق جو فتوے دیے ہیں ان میں بعض بڑے دلچسپ ہیں اور مختلف کتب ادب و تاریخ میں منقول ہیں۔ از نامۂ دانشوران ناصری ۔۔۔ ۲: ۳۷۰-۳۸۸؛ بروکلمان ۱: ۱۷۱، ذ ا: ۲۸۸؛ فقہ حنفی پر ان کی تصنیف کتاب 'خراج' موجود ہے اس میں انھوں نے خلیفہ ہارون الرشید کو نصیحتیں کی ہیں اور مفید مشورے دیے ہیں۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ، ۱۳۴۶ھ، ۱۳۵۲ھ فرانسیسی ترجمہ از (E. Fagnan) پیرس ۱۹۲۱ء۔
اطالوی ترجمہ از (P. Tripodo.) روم ۱۹۰۶ء۔

۱۰۶۔ سنہ ولادت ۱۴۸ھ/۷۶۵ء۔ دور حکومت ۱۷۰ھ-۱۹۳ھ/۷۸۶ء-۸۰۹ء

۱۰۷۔ اصل نام امۃ العزیز تھا۔ سنہ پیدائش ۱۴۹ھ/۷۶۶ء۔ جائے پیدائش حدیثہ، دجلہ۔ ۱۶۵ھ/۷۸۱ء میں خلیفہ ہارون الرشید سے شادی ہوئی۔ سنہ وفات ۲۱۶ھ/۸۳۱ء۔ رک:
الأعلام النساء فی عالمی العرب والاسلام۔ عمر رضا کحالہ۔ دمشق، ۱۹۵۸ء۔ ۲: ۱۷-۳۰

۱۰۸۔ نصاب الاحتساب (وہو فی قوانین الاحتساب)۔ ۶۵ ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف کا نام عمر بن محمد عوض السامی ہے۔ مطبوعہ کلکتہ۔ معجم المطبوعات کے مرتب نے اس کو کسی مجہول الاسم مصنف کی کتاب لکھا ہے (۲۰۰۳)۔ رک: کشف الظنون ۲: ۵۴۳، فہرست انڈیا آفس (عربی) ۲: ش ۱۲۹۳، دیباچہ معالم القربۃ ۔۔۔۔ از روبن لیوی، کیمبرج ۱۹۳۸ء دیباچہ ۱۶، اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۵۶ء G.-S. Colin et E. Lévi- Provencal :Un Manuel Hispanique de Hisba. Paris, 1931. Preface.

۱۰۹ تاج الاسلام ابو سعد عبد الکریم بن محمد سمعانی (۵۰۶-۵۶۲ھ/۱۱۱۲ء-۱۱۶۹ء)

۱۱۰۔ کتاب الانساب اس کو 'انساب العرب' اور 'انساب السمعانی' بھی کہا جاتا ہے۔ سمعانی کے حالات زندگی اور 'انساب' پر تفصیلی معلومات کے لیے رک: سمعانی اور اس کی کتاب الانساب از عرشی رامپوری (روئداد معارف اسلامیہ۔ لاہور۔ ۱۹۲۸ء۔ ۱۳۳-۱۸۴ و مقالات عرشی لاہور ص ۳، ۱۶۰- 'کتاب الانساب' ۱۹۱۲ء میں لائیڈن سے شائع ہوئی تھی، مرتبہ مارگولیتھ D.S. Margoliouth حیدرآباد دکن۔ ۶ جلد ۱۹۶۲ء – ۱۹۶۶ء مرتبہ عبدالرحمن بن یحییٰ المتی الیمنی بار دوم ۱۹۷۰ء

۱۱۱۔ لب اللباب فی تحریر الانساب۔ مرتبہ P.J. Weth لائیڈن ۱۸۴۰ء-۱۸۵۱ء (۳ جلد) مخطوط نفیس ۱۲۳-۱۲۴۔

۱۱۲۔ ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء تک زندہ تھے۔ رک: برکلمان ذ ۱: ۵۰۵، ذ ۲: ۴۱۴

۱۱۳۔ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت البغدادی (۳۹۲ھ-۴۶۳ھ/۱۰۰۲ء-۱۰۷۱ء)۔ رک معجم الادباء ۲: ۲۷۴، ابن خلکان ۱: ۳۲، روضات الجنات ۱: ۸۷، مفتاح السعادۃ ۱: ۲۱۰، براکلمان ذ ۱: ۵۲۵، ذ ۲: ۴۱۴

۱۱۳۔ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت البغدادی (۳۹۲ھ-۴۶۳ھ/۱۰۰۲ء-۱۰۷۱ء) رک: معجم الادباء ۲: ۲۷۴، ابن خلکان ۱: ۳۲، روضات الجنات ۱: ۸۷، مفتاح السعادۃ ۱: ۲۱۰، براکلمان ۱: ۳۲۹، ذ ۱: ۵۶۲-۵۶۳۔

تاریخ بغداد۔ مرتبہ G. Salmon پیرس، ۱۹۰۴ء اس کے فرانسیسی مقدمے میں اس تاریخ کے مندرجات اور مصنف کے حالات زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مطبوعہ لائپزگ ۱۹۰۸ء

۱۱۴۔ ابوالحسن یحییٰ بن عیسیٰ بن علی بن جزلہ (م ۴۹۳ھ/۱۱۰۰ء)۔ رک: عیون الانباء ۱: ۲۵۵ ابن خلکان ۲: ۳۴۵، ابن العبری ۳۳۹، براکلمان ۱: ۴۸۵، ذ ۱: ۸۸۸، ۵۶۳

۱۱۵۔ ابن خلکان کی 'وفیات الاعیان' کا ضمیمہ ہے مؤلف کا نام ابن شاکر الکتبی (۶۸۱ھ-۷۶۴ھ/۱۲۸۷ء-۱۳۶۲ء) ہے۔

۱۱۶۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ از ابن عبدالبر القرطبی (ا د) الاندلسی (۳۶۸ھ-۴۶۳ھ/

۹۷۸ء - ۱۰۷۰ء)۔ رک : ابن خلکان ۲ : ۲۵۸، الدیباج المذہب ۳۵۷، مجلة معہد المخطوطات العربیة، مصر، المجلد الثانی، الجزء الاول، شوال ۱۳۷۵ھ/ مئی ۱۹۵۶ء ص ۷، نسخہ مکتبہ ریاستہ المطبوعات (کابل)۔ زیر عنوان ''المخطوطات العربیة فی افغانستان'' یہ کتاب حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی تھی۔ ۱۳۱۸ھ - ۱۳۱۹ھ (دو جلد)

۱۱۷۔ الاصابة فی تمییز الصحابہ۔ ابن حجر العسقلانی (۷۷۳ھ - ۸۵۲ھ/ ۱۳۷۱ء - ۱۴۴۸ء) رک : حسن المحاضرة ۱ : ۲۰۷، طبقات الشافعیة للاسدی ۱۰۸، الفوائد البہیة ۱۶ بالتعلیقات، الخطط الجدیدة ۶ : ۲۷، روضات الجنات ۱ : ۹۴، مفتاح السعادة ۱ : ۲۰۹۔

اشپرنگر نے مولوی محمد وجیہ، مولوی غلام قادر اور مولوی عبدالحی کے تعاون سے اس کتاب کو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ سے شائع کیا تھا ۱۸۴۸ء - ۱۸۵۷ء مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ

۱۱۸۔ یاقوت الرومی الحموی (۵۷۵ھ - ۶۲۶ھ/ ۱۱۷۹ء - ۱۲۲۸ء) رک : ابن خلکان ۲ : ۲۷۷ اس کتاب کا نام 'ارشاد الاریب الی معرفة الادیب' ہے لیکن 'معجم الادباء' و 'طبقات الادباء' کے نام سے بھی مشہور ہے مرتبہ مارگولیتھ ۱۹۰۹ء - ۱۹۱۲ء

۱۱۹۔ اشپرنگر کا یہ قیاس محل نظر ہے۔ تقریباً تمام محققین نے یاقوت کا سنہ وفات ۶۲۶ھ لکھا ہے۔ رک:

The Life and Works of Yaqut-al-Hamawi. By R.M.N.E. Elahie, Lahore, 1965, p. 34.

۱۲۰۔ فہرست کتب الشیعہ۔ ابو جعفر الطوسی (۳۸۵ھ - ۴۶۰ھ/ ۹۹۵ء - ۱۰۶۷ء) مرتبہ ڈاکٹر اشپرنگر و مولوی عبدالحق کلکتہ ۱۸۵۳ء - ۱۸۵۵ء۔

۱۲۱۔ کتاب معالم العلماء۔ رشید الدین ابی جعفر محمد بن علی بن شہر آشوب السروی (م ۵۸۸ھ/ ۱۱۹۲ء)۔ رک : المواعظ ۲ : ۴۰۰، براکلمان ۱ : ۴۰۵، فہرست مخطوطات ذخیرہ براؤن (۱۹۳۲ء) ۱۵ - ۱۶۰ مرتبہ عباس اقبال تہران ۱۳۵۳ھ صفحات ۱۴۲۔ (ذیلی عنوان یہ ہے فہرست کتب الشیعہ واسماء المصنفین منہم قدیماً وحدیثاً تتمہ کتاب الفہرست للشیخ ابی جعفر الطوسی) مطبوعہ نجف ۱۹۶۱ء (رک : معجم المطبوعات النجفیہ تالیف محمد ہادی الامینی نجف ۱۹۶۶ء ۳۶۰)

۱۲۲۔ اس کتاب کے متعلق راقم کو معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۲۳۔ کتاب الاغانی۔ ابو الفرج اصفہانی (۲۸۴ھ - ۳۵۶ھ/ ۸۹۷ء - ۹۶۶ء) رک : ابن خلکان

(مترجمہ سلان) ۲: ۲۴۹-۲۵۲ نکلسن ۱۹۲۲ء - ۲۴۷-۲۴۸ مرتبہ نصر الہورینی بولاق
۱۲۸۴ھ - ۱۲۸۵ھ (۳۰ جلد در مجلدات ۱۰) اس میں مصنفین کے سوانح حیات والا حقہ
نہیں تھا اس حصہ کو بعد میں R. E. Brünnow نے لائیڈن سے ۱۸۸۸ء میں
شائع کیا (براکلمان ۱: ۱۴۶، ذ ۱: ۲۰۶) مطبوعہ بیروت ۱۹۵۶ء - ۱۹۵۷ء - ۲۱ جلد -

۱۲۴- شمس الدین محمد بن محمود الشہرزوری الاشراقی - ولادت و وفات کے سنین معلوم نہیں لیکن
یہ تحقیق شدہ بات ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب 'رسائل الشجارات الالہیۃ فی علوم الحقائق
الربانیۃ' (براکلمان ۱: ۴۶۹، ذ ۱: ۸۵۱) ۶۸۰ھ/۱۲۸۲ء میں مکمل کی (مخطوطہ ٹیوبنگن مغربی جرمنی)

۱۲۵- اس تذکرے کا پورا نام 'نزہۃ الارواح و روضۃ الافراح' ہے - اس میں زمانہ قبل از اسلام
کے ۳۴ اور زمانہ بعد از اسلام کے ۷۷ فلسفیوں کے حالات زندگی لکھے گئے ہیں - اس
تذکرے کی بنیاد دو تذکروں پر رکھی گئی ہے ان میں سے ایک معری امیر ابوالو المبشر بن فاتک
کی 'مختار الحکم' (۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء) ہے - (براکلمان ۱: ۴۵۹، ذ ۱: ۸۲۹) اور دوسری کتاب
'تتمۃ صوان الحکمۃ' (مرتبہ مولوی محمد شفیع مرحوم - لاہور ۱۹۳۵ء) ہے سٹوری نے
مذکورہ بالا تذکرے کے پانچ قلمی نسخوں کا حوالہ دیا ہے رک: ۱ (۲): ۱۱۰۸

۱۲۶- فارسی ترجمے کا نام 'ترجمہ تاریخ الحکماء' ہے - یہ ترجمہ مقصود علی تبریزی نے سلطان سلیم شاہ
(یعنی نورالدین جہانگیر سنہ تخت نشینی ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے حکم پر ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں کیا - رک سٹوری ۱ (۲):
۱۱۰۸ او تحتی نوٹ 'نزہۃ الارواح' کا ایک اور فارسی ترجمہ کنز الحکمۃ ترجمہ نزہۃ الارواح کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا تہران ۱۳۴۳ھ

۱۲۷- شیخ ابوالعباس احمد بن علی بن احمد بن عباس - اشپرنگر نے کتاب کا نام نہیں لکھا، لیکن
اس کا اشارہ النجاشی کی 'کتاب الرجال' (رجال الشیعۃ) کی طرف ہے - مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۷ھ

۱۲۸- محمد بن علی الطوسی المعروف بہ عماد الطوسی کی طرف اشارہ ہے جو شیعہ مشاہیر میں شمار کیے
جاتے ہیں (روضات الجنات ص ۵۹۴)

۱۲۹- عبدالرزاق اللاہیجی - نصیر الدین طوسی کی 'تجرید الکلام' پر ایک شرح 'الموسوم بہ
شوارق الالہام' لکھی -

۱۳۰- براکلمان نے تقی الدین عبدالغنی بن عبدالواحد بن سرور المقدسی (۵۴۱ھ - ۶۰۰ھ/۱۱۴۶ء

۱۲۰۳ء) اور ابن حجر العسقلانی کی اسی نام کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے (ذ ا: ۲۰۲، ذا ۲: ۳۰۲) لیکن اکمل ذہبی کی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا۔

۱۳۱۔ جامع الاصول فی احادیث الرسول از ابن الاثیر الجزری (م ۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء) رک: ابن خلکان ۲: ۱۵۵، کشف الظنون ۲: ۵۰۱ برٹش میوزیم (ضمیمہ) ۸۴

۱۳۲۔ مشکوٰۃ کے راویوں کے کئی تذکرے لکھے گئے۔ معلوم نہیں اسپرنگر کا اشارہ کس تذکرہ کی طرف ہے۔

۱۳۳۔ Hammer-Purgstall (۱۷۷۴-۱۸۵۶ء) آسٹرین مستشرق (رک: معجم المؤلفین ۱۳: ۲۸۷، الزرکلی ۹: ۲۹۶-۲۹۷) اشپرنگر ۱۸۳۲ء میں تعلیم حاصل کرنے ویانا (Wien) پہنچا۔ یہ ہامر ہی کی تربیت اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ اس نے مشرقی علوم و فنون میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ ایک آسٹرین خاتون Dr. Inge Solbrig نے ہامر کی زندگی اور تصانیف پر اپنی کتاب مکمل کر لی ہے جو عنقریب شائع ہو جائے گی (مرسلہ ڈاکٹر اینا ماری شمل بنام راقم، بابت ۱۶ر فروری ۱۹۷۰ء)

۱۳۴۔ اس تاریخ کا نام یہ ہے۔

Geschichte der schönen Redekün-
ste Persiens mit einer Blüthenlese
aus zweyhundert persischen
Dichtern, Wien, 1818.

۱۳۵۔ سٹوری کے خیال کے مطابق ہامر کی مذکورہ بالا تاریخ دولت شاہ سمرقندی کے تذکرے کی تلخیص ہے۔ ۱ (۲): ۷۸۰۔ ہامر نے 'تحفہ سامی' سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔

۱۳۶۔ علی قلی خاں والہ داغستانی (۱۱۲۴ھ-۱۱۶۹ھ/۱۷۱۲ء-۱۷۵۶ء) اشپرنگر نے دو مثنویوں 'نجم الہدا' اور 'مرزا نامہ' کو والہ داغستانی سے منسوب کیا ہے لیکن یہ دونوں مثنویاں والہ داغستانی کی نہیں بلکہ سید محمد والہ موسوی (م ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء) کی لکھی ہوئی ہیں۔ موخرالذکر کی ایک اردو مثنوی بہ عنوان 'طالب و موہنی' (۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء) کا قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن میں موجود ہے (تذکرۂ مخطوطات ۳: ۹۱-۹۷) ڈاکٹر محی الدین قادری

زور مرحوم نے اس کو ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔

۱۳۷۔ ریاض الشعرا ۔ سنۂ تکمیل ۱۱۶۱ھ/ ۴۸-۱۷ء ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور میں موجود ہے جس کو ڈاکٹر وحید مرزا صاحب مرتب کر رہے ہیں۔ رک : سٹوری ۱ (۲) : ۸۳۰-۸۳۳ "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ۲۹۳-۳۱۰۔

۱۳۸۔ ریو نے شعراء کی تعداد ۲۵۰ لکھی ہے (۱ : ۳۷۱ ل)

۱۳۹۔ تذکرے کا نام 'ہفت اقلیم' ہے۔ مؤلف رے میں پیدا ہوا۔ اعتماد الدولہ غیاث بیگ، پدر نورجہاں بیگم کے قریبی عزیزوں میں سے تھا۔ تذکرے کے بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ہندوستان میں لکھا گیا۔ سنۂ تالیف ۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۴ء ہے۔ اس میں مختلف شہروں اور ملکوں کے ناموں کے تحت وہاں کے شعرا، فضلا، امرا وغیرہ کے حالات زندگی لکھے گئے ہیں۔ کل سات اقالیم میں منقسم ہے۔ اس تذکرے کے دو خطی نسخے کتب خانہ دانشگاہ پنجاب میں محفوظ ہیں۔ رک : سٹوری ۱ (۲) : ۱۱۶۹-۱۱۷۱۔ اس تذکرے کے تین کراسے کلکتہ سے بالترتیب ۱۹۱۸ء، ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئے۔ مطبوعہ تہران ۱۳۴۰ش۔

۱۴۰۔ دولت شاہ سمرقندی (م ۹۰۰ھ/ ۱۴۹۴ء) تذکرے کی تصنیف کے وقت یعنی ۸۹۲ھ/ ۸۷-۱۴۸۷ء میں تذکرہ نگار کی عمر پچاس سال تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۸۴۲ھ/ ۱۴۳۸ء میں پیدا ہوا۔ اس تذکرے کے دو قلمی نسخے کتب خانہ دانشگاہ پنجاب، لاہور میں موجود ہیں۔ مطبوعہ بمبئی ۱۸۸۷ء، لندن و لائیڈن (مرتبہ براؤن) ۱۹۰۱ء ۔ الہ آباد ۱۹۲۱ء۔ رک سٹوری ۱ (۲) : ۷۸۴-۷۸۹۔

۱۴۱۔ تقی الدین محمد بن شرف الدین علی حسینی کاشانی المعروف بہ تقی کاشی۔ روایت ہے کہ ۹۴۳ھ/ ۱۴۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ وفات معلوم نہیں لیکن ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۷ء میں زندہ تھے 'خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار' ہے۔ سنہ تکمیل ۹۸۵ھ/ ۱۵۷۷ء ہے۔ رک سٹوری ۱ (۲) : ۸۰۳-۸۰۱

۱۴۲۔ تذکرہ نگار کا نام نقش علی ہے۔ اشپرنگر نے اس کو علی ابراہیم خاں خلیل سے منسوب کیا ہے (فہرست شاہان اودھ ۱۵۰)، سنہ تصنیف ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۰ء، لیکن بعد میں بھی اضافے

ہوتے رہے۔ مثلاً خزانہ عامرہ (۱۱۷۶ھ) اور الفتی سے ملاقات کا ذکر (۱۱۹۱ھ) اس میں ان شعرا کے حالات لکھے گئے ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں اور نویں صدی ہجری سے لے کر تذکرہ نگار کے زمانے تک موجود تھے۔ رک: سٹوری ۱ (۲): ۸۵۵

۱۴۳- سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی (۱۰۹۹ھ - ۱۱۶۹ھ/۱۶۸۷ء - ۵۶-۱۷۵۷ء) تذکرے کا نام 'مجمع النفائس' ہے۔ سنہ تکمیل ۱۱۶۴ھ/۵۰-۱۷۵۱ء۔ لیاقت نیشنل میوزیم' کراچی میں اس کا ایک عمدہ نسخہ موجود ہے۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب اس تذکرے کو دانش گاہ پنجاب' لاہور کی طرف سے مرتب کر رہے ہیں۔ رک: سٹوری ۱ (۲): ۸۳۴ - ۸۴۰۔ تذکرہ نویسی ۳۲۲ - ۳۴۱' انڈو ایرانیکا۔ دسمبر ۱۹۶۰ء۔ مقالہ از ڈاکٹر منوہر سہائے انور۔

۱۴۴- میر علاء الدولہ کامی بن میر یحییٰ عبداللطیف السیفی الحسنی قزوینی تذکرے کا نام نفائس المآثر ہے ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء میں لکھا گیا۔ کتب خانہ دانشگاہ پنجاب' لاہور اور کتب خانہ دانش گاہ علی گڑھ (ذخیرہ سبحان اللہ رئیس گورکھپور) میں اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے سٹوری نے ان کتب خانوں کے نسخوں کا حوالہ نہیں دیا۔ رک: سٹوری ۱ (۲): ۸۰۱

۱۴۵- دور حکومت ۹۶۳ھ - ۱۰۱۴ھ/۱۵۵۶ء - ۱۶۰۵ء۔

۱۴۶- اس نام کے کسی فارسی تذکرے کا ذکر سٹوری اور دیگر محققین نے نہیں کیا۔ شاید اس سے مراد ملا عبدالباقی نہاوندی کی 'مآثر رحیمی' کی تیسری جلد ہو' جو علماء' فضلا اور شعرا کے حالات پر مشتمل ہے (مرتبہ ہدایت حسین۔ کلکتہ ۱۹۳۱ء)

۱۴۷- شیخ قیام الدین حیرت بن شیخ امان اللہ اکبر آبادی' تذکرے کا نام 'مقالات الشعرا' ہے سنہ تالیف ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ رضا لائبریری' رامپور میں موجود ہے عرشی صاحب نے 'دستور الفصاحت' (۱۹۴۳ء) کی ترتیب و تدوین میں اس کے بعض اقتباسات نقل کیے ہیں۔ رک: اورینٹل کالج میگزین۔ فروری ۱۹۳۰ء

۱۴۸- دور حکومت ۱۰۶۸ھ - ۱۱۱۹ھ/۱۶۵۷ء - ۱۷۰۷ء

۱۴۹- دور حکومت ۱۱۶۸ھ - ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۴ء - ۱۷۵۹ء

۱۵۰- مرزا محمد افضل سرخوش بن محمد زاہد (۱۰۵۰ھ - ۱۱۲۶ھ/۱۶۴۰ء - ۱۷۱۴ء) - ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء

میں لکھا گیا' لیکن ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء تک اضافے ہوتے رہے۔ سٹوری نے اس تذکرے کے ۱۸ قلمی نسخوں کا حوالہ دیا ہے (۱(۲): ۸۲۲)۔ لیکن ان پانچ قلمی نسخوں کا ذکر نہیں کیا جو کتب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں سٹوری نے اس تذکرے کے کسی مطبوعہ ایڈیشن کا بھی ذکر نہیں کیا۔ مطبوعہ لاہور (مرتبہ صادق علی دلاوری) ۱۹۴۲ء و مدراس ۱۹۵۱ء

۱۵۱۔ غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ھ-۱۲۰۰ھ/۱۷۰۴ء-۱۷۸۶ء) اشپرنگر کا اشارہ 'سرو آزاد' کی طرف ہے۔ سنہ تصنیف ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء پہلی جلد بہ عنوان 'مآثر الکرام'۔ حیدرآباد دکن ۱۹۱۰ء۔ دوسری جلد۔ لاہور ۱۹۱۳ء۔ رک: سٹوری ۱(۲): ۸۵۵-۸۶۶' تذکرہ نویسی۔ ۲۵۵۔۲۷۳' ۲۸۳-۲۹۰' ۴۲۵۔۴۳۷۔

۱۵۲۔ اشپرنگر کی مراد 'سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان' سے ہے۔ ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء میں لکھی گئی مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۳ھ۔ رک: براکلمان ذ۲: ۶۰۰' سٹوری ۱(۲) ۸۵۹

۱۵۳۔ مطبوعہ تہران۔ ۱۳۱۶۔ رک: سٹوری ۱(۲): ۸۱۹-۸۲۱

۱۵۴۔ نورالدین عبدالرحمٰن بن احمد جامی (۸۱۷ھ-۸۹۸ھ/۱۴۱۴ء-۱۴۹۲ء) 'نفحات الانس من حضرات القدس' کا سنہ آغاز ۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء ہے۔ میر علی شیر نوائی (م ۸۴۴ھ-۹۰۶ھ/ ۱۴۴۱ء-۱۵۰۱ء) کے ایما پر لکھی گئی۔ سنہ تکمیل ۸۸۳ھ/۱۴۷۸ء ہے۔ کتب خانہ دانشگاہ پنجاب' لاہور میں اس کے تین قلمی نسخے موجود ہیں۔ مطبوعہ لاہور ۱۸۹۷ء۔ رک: سٹوری ۱ (۲): ۹۵۴-۹۵۹۔ سید احمد علی چشتی نظامی نے اس تذکرے کا اردو میں ترجمہ کیا۔ رک : آصفیہ ۳: ۱۸۴

۱۵۵۔ اس کتاب کے متعلق راقم کو معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۵۶۔ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء)۔ رک: حیات عبدالحق محدث دہلوی خلیق احمد نظامی۔ دہلی ۱۹۵۳ء' اخبار الاخیار فی اسرار الابرار' ہندوستان کے ۲۵۵ صوفیا کا تذکرہ ہے۔ آخر میں تذکرہ نگار نے اپنے اور آبا و اجداد کے حالات زندگی بھی لکھے ہیں اس تذکرے کا ایک خطی نسخہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب' لاہور میں محفوظ ہے۔ کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ رک: سٹوری ۱(۲): ۹۷۹ مولانا سبحان محمود اور مولانا محمد فاضل نے اس

کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی۔ س۔ن۔

۱۵۷۔ سلطان حسین بالیقرا (سنہ پیدائش ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء۔ دور حکومت ۸۷۳ھ۔ ۹۱۱ھ/۱۴۶۹ء۔ ۱۵۰۶ء) کی تصنیف ہے۔ وہ ایک علم دوست اور علم پرور حکمران تھا۔ علم و ادب کی سرپرستی کی وجہ سے بہت سے نامور شعرا، مصور اور کاتب اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے، مثلاً جامی، ہاتفی، ہلالی، حسین کاشفی، میرخوند، خوندمیر، دولت شاہ، بہزاد اور سلطان علی مشہدی۔

خوندمیر (حبیب السیر ۳ : ۳۳۰) اور بابر (بحوالہ براؤن ۳ : ۴۵۷) کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ میر کمال الدین حسین (م۔ قبل ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء) کی تصنیف ہے۔ اس تذکرے میں ۷۶ صوفیا، معروف عشاق اور بادشاہوں کے حالات زندگی قلمبند کیے گئے ہیں۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۰ء۔ کانپور ۱۳۱۲ھ۔ رک : سٹوری ۱(۲) : ۹۶۱

۱۵۸۔ رضی الدین عبدالغفور لاری (م۔ ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء)۔ جامی کا شاگرد تھا۔ اس نے جامی کی نامکمل عربی تفسیر الفوائد الضیائیۃ (لکھنؤ ۱۲۸۲ھ، ۱۳۰۱ھ) پر تعلیقات لکھی تھیں۔ (براکلمان ۱ : ۳۰۴، ذ ۱ : ۵۳۳) علاوہ ازیں جامی کے تذکرہ 'نفحات الانس' پر حواشی بھی لکھے تھے جو ایک الگ کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لاری کے تذکرہ صوفیا سے یہی حواشی مراد ہیں رک : سٹوری ۱(۲) : ۹۵۷-۹۵۸۔

۱۵۹۔ فخر الدین علی بن الحسین الواعظ الکاشفی۔ (م۔ ۹۳۹ھ/۱۵۳۲ء) 'رشحات عین الحیاۃ' تاریخی نام ہے، جس سے تذکرہ کا سنہ تکمیل ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء نکلتا ہے اس میں خواجہ عبیداللہ المعروف بہ خواجہ احرار (۸۰۶ھ۔ ۸۹۵ھ/۱۴۰۴ء۔ ۱۴۹۰ء) کے ارشادات معجزات وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔ دیگر نقشبندی سلسلے کے صوفیا کے حالات بھی درج ہیں اس تذکرے کے دو قلمی نسخے کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور میں موجود ہیں۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۰ء۔ رک : سٹوری ۱(۲) : ۹۶۲-۹۶۶۔

۱۶۰۔ سٹوری اور دیگر محققین نے اس نام کے کسی تذکرے کا ذکر نہیں کیا۔

۱۶۱۔ اللہ دیا بن شیخ عبدالرحیم بن شیخ بینا حکیم چشتی عثمانی۔ شاہ علا پانی پتی (م۔ ۱۰۳۲ھ

۱۶۲۴ء) کے مرید تھے۔ اس تذکرے کا سنہ اختتام ۱۰۵۶ھ/۴۶-۱۶۴۶ء ہے۔ برٹش میوزیم، انڈیا آفس اور علی گڑھ کے ذخیرۂ سبحان اللہ میں قلمی نسخے موجود ہیں۔ مطبوعہ لکھنؤ، ۱۸۷۶ء، ۱۸۸۱ء، ۱۸۸۹ء۔

۱۶۲۔ راقم کو اس کتاب کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۶۳۔ کتاب کا نام تیسیر الوصول الی جامع الاصول من حدیث الرسول ہے۔ مؤلفہ ابن الدیبع الشیبانی (۸۶۶ھ-۹۴۴ھ/ ۱۴۶۱ء-۱۵۳۷ء) ابی السعادات بن الاثیر الجزری کی جامع الاصول الاحادیث الرسول، کی تلخیص ہے۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۳۰۱ھ، ۱۳۳۱ھ۔ رک:

Bibliographie...Victor Chauvin, Vol. 1, 1892, p. 142.

۱۶۴۔ اشپرنگر کا اشارہ نسائی کے اس ایڈیشن کی طرف ہے جو دہلی سے ۱۲۵۶ھ میں شائع ہوا تھا (براکلمان ذ ۱: ۲۶۹)

۱۶۵۔ اشپرنگر ۱۸۴۸ء سے پہلے کے ایڈیشن کے متعلق لکھ رہا ہے لیکن براکلمان اور دیگر محققین نے ابو داؤد کے ۱۲۷۱ھ سے قبل کے کسی ایڈیشن کا ذکر نہیں کیا۔ بخاری ۱۲۷۰ھ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کو اشپرنگر کے ایما پر مرتب کیا گیا جیسا کہ اشپرنگر نے خود لکھا ہے۔ اس مقالے کی ابتدا میں تمام متعلقہ تفصیلات درج کر دی گئی ہیں۔ دیگر معلومات کے لیے رک: براکلمان ۱: ۱۵۸، ذ ۱: ۲۶۰-۲۶۵، و Bibliographie...Victor Chauvin, Vol. X, 1907, pp. 139-41.

۱۶۶۔ 'الذریعۃ' اور براکلمان میں اس نام کی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا۔

۱۶۷۔ نہج البلاغۃ و شرع الفصاحۃ۔ الشریف المرتضیٰ (۳۵۵ھ-۴۳۶ھ/۹۶۵ء-۱۰۴۴ء)۔ اس میں حضرت علیؓ کے منتخب خطبات، خطوط اور حکیمانہ اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی مختلف طباعتوں، تراجم اور شروح کے لیے رک: الذریعۃ ۴: ۱۴۴-۱۴۶، براکلمان ۱: ۴۰۵، ذ ۱: ۷۰۵، فہرست کتاب خانہ دانش گاہ تہران ۲: ۲۹۵-۳۲۴۔ اس کا ایک اردو ترجمہ رئیس احمد جعفری مرحوم، مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی صاحب وغیرہ نے کیا تھا۔ مطبوعہ شیخ غلام علی

اینڈ سنز، لاہور ۱۹۶۳ء - علاوہ ازیں عرشی رامپوری کا ایک محققانہ اور فاضلانہ مقالہ بہ عنوان 'نہج البلاغہ کا استناد' بھی شامل ہے (ص ۱۵-۶۴ و مقالات عرشی)۔ نیز رک:
Observations sur le Nahgal-balaga. By L. Veccia-Vaglieri. (Proceedings of the 24th International Congress of Orientalists, 1957, pp. 318-19).

۱۶۸۔ اس میں چوتھے امام علی ابن الحسین الموسوم بہ زین العابدین کی دعائیں اور مناجات درج ہیں۔ رک: براکلمان ۱: ۴۴، ذ ۱: ۷۶، الموارث ۳: ۳۷۶، فہرست ذخیرۂ براؤن ۱۲۔ سندھی ترجمے کے ساتھ بمبئی سے ۱۲۹۴ھ میں شائع ہوئی۔ حال ہی میں اس کا اردو ترجمہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور سے چھپ گیا ہے۔ نیز رک: فہرست کتاب خانہ دانشگاہ تہران ۱: ۱۵۲-۱۶۱

۱۶۹۔ ۹۵۳ھ - ۱۰۳۱ھ/ ۱۵۴۶ء - ۱۶۲۲ء (براکلمان ۲: ۴۱۲، ذ ۱: ۷۶)

۱۷۰۔ براکلمان نے اس طباعت کا ذکر نہیں کیا۔

۱۷۱۔ ۴۱ھ - ۱۳۲ھ/ ۶۶۱ء - ۷۵۰ء۔

۱۷۲۔ سیاسیات پر مشہور رسالہ ہے۔ اس کا دوسرا نام "کتاب السیاسۃ فی تدبیر الریاسۃ" ہے۔ روایت ہے کہ ارسطو نے یہ رسالہ سکندر اعظم کے لیے لکھا۔ عربی ترجمے کے قلمی نسخوں اور دیگر تفصیلات کے لیے رک: براکلمان ۱: ۲۰۳، ۲۴۱، ذ ۱: ۳۶۴، ۴۱۰، ۹۳۴، الذریعۃ ۳: ۲۲۳، مخطوطات ارسطو فی العربیۃ ۳۱-۳۳۔ عربی ترجمے کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے (ضمیمہ ۵۰۲) جو شہزادہ یمن شجاع الدین عمر بن وحید الدین عبدالرحمٰن بن محمد بن محمد معان النظاری کے لیے لکھا گیا۔ نیز رک:

Al-Razi, Muhammad ibn Zakariya, (دل) 'al-Asrar'et "Sirr al-asrar". Ed.

Muhammad Taqi Danish-Puzhuh.
(Teheran, Commission Nationale Iranienne pour l'unesco) (Cf. International Bibliography of the History of Religions. By Salih Alich, Leiden, 1969, p. 86)

(ب)

Mahmoud Manzalaoui : The Pseudo-Aristotelion Sirr al-asrar and Three Oxford Thinkers of the Middle Ages. (Arabic and Islamic Studies in honour of H.A.R. Gibb. Edit. by George Makdisi, Leiden, 1965, pp. 480-500).

۱۷۳۔ ۱۷۵۸ء۔ ۱۸۳۸ء، مشہور فرانسیسی مستشرق تھا۔ رک:

Centenaire de Silvestre de Sacy. 'Comptes rendus des seances (Akadémie des inscriptions et belles-lettres) 1938, pp. 64-107;

Islamic Culture, 12 (1938), pp. 241-42.

۱۷۴۔ دی ساسی کے مشہور رسالہ کا نام ہے۔ فرانس سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں مشرقی علوم سے متعلق اہم مقالات اور مختلف کتابوں کے متون یا اقتباسات مع تراجم شائع ہوتے تھے۔

گُلِ رعنا

مع

آشتی نامۂ غالب

(نسخۂ سیّد وصی احمد بلگرامی)

تصنیف

میرزا اسد اللہ خاں غالب

مرتبہ

سیّد قدرت نقوی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

غالب بدم افسون ز دم ناشکیبان   دیوانهٔ که بدر زدن تاختهٔ ما

شبی هم کلاوین که چون نامه به پایان رسید و اندیشه املای اختتام لذت کرد تا ز
آنکه خامه از کف چون آه از دل برون جست و بر بالین چون داغ بسینه جا کرد
غنودگی هجوم آورد و در ربودگی دست بهم داد ناگاه نگار رعنا رنگ در قفای لذت کده خیال
شبگیر نگاه بر رخ تشنه دیدار آن شکر بی لذت نقاب عذار روشن همچو گرد
چشمی چشم جادو که جهان صحرا نشین برمرد سیاه در چون بر جگر کمان ردستا
نی خاره رنگین کرده و کوشه لند رو و روی پرایه تهی و لب در چشم از تبسم نگاه بر
قدر پی با ناز آن چو نزنه بسته و خط بیانی اندر رو نگار حسن بر نشان با جبین چون
کمک خور روشن گفته و خرامی چون سیلاب بهاری بی پروا از لف دراز
از سر مستی بار در یاکشان نقاب لب زرخ برافکنده و لب که لاله حرف هاز رسید
و سرتا طرف نقاره در انبساط تجلی منشم را لعل ازن بسم که چنین بما لیدو
بار ره روشنم آید لعلی بی تعریض ریسندو و گفت چه چه البت
تا نکه خیال تو این رقم ولی سیاهی جادو بیانی دلکش سخن لبی در ب

لشکر انسانیکان عالم ایجاد ولی در حسب اندیشه و ماهان چارکوی وجهه لیک لشکر
مجری فراخاسته ولد نهید سیه بخاک نشسته بکام الله تعالی اندم انرنک تا گیها
ریحان نوبی درکلاه و از غنچه بموج خوبی خجلت فروزیی کهم ای النسا رو بکار جو
کمر بکینم نسنی از چه لاله ولیس سبز انش کنخولی از چه رو مراد از نظر ها سنگ ساختن
بغنچه وجهه را بر دلش کمال کون اخر جراکانش دامن کسبه ولیکن بی و
جندی حشم الکه لذ بر جه لیی لب خانه لقوی بی بر رسید بت آب تا
زمزمه ق الکه بر دل ناخته نخنش نسیم نعیم غنچه تم شکفته این صید حجب.
کمک بالید و لب تبسم الو ریکمسن بستان خند بحجب و دامان تماشا
فرو ریخت بسان مرده طوفان کرد و کوی حر الاصدف کوهر این الاد
کفا بید کرانه آبی بر دراید کروه بخردی دل رباقتانه سماک تا دلبری تشخص — ہر لیے
سنعدالو تو ام المنشی اعلام به حکم جهر خاسته لم زمکین منم
امحی سار سالار ملت و نکاه بیم لبیه بر دارد هلاب تربیت به نظارگی

مرآت خیال نوآموز کوشش کمالات اولدرخشش فیضی پیکر حدوث مراتبلری

اولدرشت کالمعنی لاینفک زور آلکامی بر اتومنتهی اولمش شکوللری اولدیغی برولد ایمانلری

و سیاهی ایلدکلری انکاره خوش اولدقت و شکایت ایلرباد دستی نویسنده‌لری ماند

دلداده گنجینه خورشید کار دلان کار دلان کلکشت کردت بیمانیه مستم

و دلای دلان لعلی دکردت الانکاران سیدیم تو و خیلی تولدرملوبی التقدیر مایه

بند دخته و گلگون نثری روشنی تلالوده طرح اولنمش ایله لرزیخت ایله دل خامه

این مجموعهٔ بلاغت که بالکلیه عبارت خالی الآفاتدر و دلنوازلری نشاط عرض حال

نقش و نگار رنگامیز نظم آبدار جواهر ساکلری دسته دسته گل همیشه بهار چمن آرامندر

مزین جواهر آبدار رشته نظم گلدسته بند جواهر بیجان اولدیغی زبان نثر لطافتدر

ازهار نفس اللسان بالهٔ ارتعام و نغمه زیر مضراب بر دمش حجب نغمه

لدی حقیقت اقلام تاریکانه ترجمهٔ زبان کلکلری مرحمت تحریر شد و دل فرقه

لدی سازشکسته دل بدین آهنگ تابیدم لبیبی نامه مرام حسن ختم

کالبد از دست مرور [illegible] و پالان سنگینی [illegible] میان دل [illegible] مرا جان

دارد و لبی را آواز [illegible] نهد خوش [illegible] فرود [illegible] برق

خشم الهی که هر دلم [illegible] جگر را نگه [illegible] دل هم گواه [illegible]

با خس جهان [illegible] خوش [illegible] کوتاه [illegible] نشینی [illegible]

از زنده [illegible] بی آرام [illegible] استغفار چو جگر [illegible] اشک [illegible]

گذارد [illegible] زمین [illegible] خاک [illegible]

دوست و جان [illegible] دشمن [illegible] الحلال [illegible]

[illegible] ناله های [illegible]

بهانه جوی [illegible] ناله مهربان [illegible]

روشن [illegible] لمعه [illegible]

[illegible] رب العالمین [illegible]

دستان [illegible]

به نظاره و فریفتگان جلوه حسنی که غیب هیچ منزه یکسان احسان بر شان الا بهر سرور کشیدن
دستی از رنگین بستن غنچه رنگین لب ام دشتر بارها که عنبر بارد کو او بود و ز صبح فرقان
دلاویز را دشمن نموده ام باز به همین حنیه ادلیه نگارش می ورزیدن جهان بابت
و جانشین کلام که اداز من مطلق ارباب دیر با کمال یک لشکر به بازو و دوران کار نیست
الی جراحتی بباشند و به نازه ضرب و لشنعاقم زرلب و رو زمره سلب و انجام
ابله پای صنایع ام و به گوهر آگاهی رشته مطلع چون هم احرام رکوع اسب و غیره
قائم سیم روغن کباب کیمیا اتش سبد و بار سیم و خراب نحیب باله زلو نشکند
ناوسیال عجم را سر سمندرم و کلک از تحلیل ان بار بر الاصل قماش لفظ را تا بسیج
نشست و نوبت لذت باره مالک کنم نقاب روی شاهد معنی سازم و بر روش
نسکر فال معنی را تا تحول حکر تخته مرهم بر روی نیز جمله الفاظ ما الهام سر تا سر کرده
فکرم لفظ کس الست و همی تازه بیرون ما به تنگ سب و انداز مهابت فرد ماند سکر فی
هر من دلدم و بالا به هم نو حرم مرا است برکار دستش خامه به انجو الال مطلب ما ساختنی

که بر دلبران جلوه رنگش بیفزود شده و جگر گرمان دانش بپرورد رقم از خطش نو صفحه

رومیان خط و حسن ز نقطه‌اش بیفزود و بشارت رنگش با نقطه اگر بچین رفته باشی

در بقعه ستایش با لالی از بهر فرد دل ای و بعد از جای بینش بها الام با و ورق زرنگ

در صفت نقطات حرص هم در کمینگاه در نقطش جای انتخاب حالی ها ی داد که پیوستم

چار بالش نهی مردم چشم تمامت آنکه بها با حلقه چشم کمانش فتح کرد یک

از خویش زر دو ده با باش عارض و خطیب از نفس وجود حال ساله جانشانی

کو آورد رو بیخاب بجه مرتبت دلدوری آراسته باشد با دو رو دو رجه

خواند یکف حرص بخط مهمان خویش بسجده آه بهای سخن الا شنیده و فراز

هر لک کنار زلف از دو کمان و حواس کفن از رکار رفته و انداز بیان پی سویش

کرده کوتاه سخن و از پی بود و رد در کار بی هم بعراحی حسنت کرد دیباچه ای افتان بود

دارا ... ن آرمید که از سطر نسیم صبح دل مسجد آدم بر چهره من از ورد کار

گو بی دو دل سبهر از من عباری دلستان بهای دستان بگویی

فتوحات شمردن و ارادت دو عرف است ما مایان بر کنار ره سپری فرصت زندگی اند و غنیمت دانستیم
و سخن دل رفتن چند که توانستیم بارانِ رود کامل که غبار دانستیم نه آتشناک
و چشم اشکبار دانستیم دیگر از خود بشنو خبر خود بتکلف بر طرف اینقدر بدانم [illegible]
نام یار دانسته تا که دست گیتی آن خون بخت همه سر آمد و نفاق کور جنون را بر گوشه سپرد [illegible]
دل الم سوختن را شفقت ملایم از نشستن بر جانب خون که دو تن جان صحیح که یا بم
جان بر دو شوق تمنا کرده نشستن جهت خون بی بردیم که تو ما جان بخت بجز [illegible] بوس
هم معمور حلقه کامل محمد الله و الله و [illegible] مالک [illegible] محمد بخش خان بهادر رستم جنگ
بپای بخت [illegible] زبان بالای فرهنگ جنون [illegible] جهان کردی و واقع سب بای [illegible]
[illegible] الا [illegible] دل [illegible] از زرکمان [illegible] بر دو ماند [illegible]
[illegible] تمام [illegible] و وفای تمام [illegible] فرصت توقیع [illegible]
[illegible] بسته کرده سکندر بار تا که [illegible] دستار بر در دانسته [illegible]
[illegible] جان [illegible] ماه و بازو [illegible] [illegible]

دلگشای روز نموده نغمه دلبر کیف برابلک که جهان دلی مستغرق تماشای جمال حسنی

مولوی حافظ محمد فضلی حق بر لندی دستور با جمله سنه بسیج سفر کردن بمذاق نوم نکاه لقا

وجهیله مبارزی داود شکرالی بیرنوع دلبر مطالعه و جانی بحق ایلدوه فرصت جون کاردانی

بهانه مقصود رسیده در برولند ربیع الاول آیده کتابی در صفت خطاب بحر قصائد شد

دیوانش دلنوازش الا بایم اینجه بر ریک سحر کلدی ده اید

عالم

عالم العلم و عالم علم عالمه ی عالمه عالم علم علم در درجه سرور ذم

لکلامه محمد اسد الله سلام عمول الاسلام لطالکه احرام دریش ایلد

معادله اله عدم و دالیج مدرک لکن صدر عمر در کرده و ملئم طلبه روا ایلادی

هر کمال کم که خواسته ی دادر وهم در اس لعل لم لکن دلف بولاکله الله

کرده دادر دار کاه لقم شهکاه که بالا سو کرده عمر در دو کار لیوکر در وع الا

دریکو ویر کرده دلف بالا در حصن کاملی ده عامله در کمطالع لکد دوام

معالکابه حل اکاه بالا داوک مصالح کار بهای و مقصم کرله الاصلاح

حالی محال ملک العلام آگاه و دم تنور نو گداه به المحال جز و دانو محمد

و طالع حضور مالک و کرم ملت نزد احاطه او گرگاه و درلوقه و لشمه کرم مکر

موم کرد لهو دیدن کم کرم سالک و اصلاح کرم امرطه حاالحال

والدور الملک بالد اسکاه درو و کوطبع نا نموم اعلام حال سا بوکار بکرکه

وطبع شد و اصلاح تالم لوالدر احاطه مطالع در ادقه الاصل الادر مرحله

سرده بکر دل و دله شرو کام و صحرا و ابرا احمد مکار رود هم و الامن مکرد

حسد معالد و دو حدم مکی محی صهات کار الود و طلل دولد در کاری کرم

دلو کالد و کم کفه آلام لد الامه کوه کسی الادف شد و هم در اصلاح حال کسی

کما لود و الداف آل کفه طور تاللم کوه صلاح لفقه در کوب روا لم دول اد

وطبع لعالد کار دارسا لهار و رطه طلال اعلی و لدم حا صهات اللهم دول و

و دواعی کل طالع دیگر کلمه احاطه کرم کرده در ادفقه احاله الدم

برادواره که کرده دارای حالم کرم اکر طالع سعود دهد دکه دعروی ملحا

گاه دائم اللّه محرر بود و له بو للهله و للله محاله در کام اول رسید ولاه عدم

دو سلسله ایک کار ماز بر الهم الملک للّه الحکم للّه هر صد صد درم که

اند هم همه هم و همه که اند هم که درم ظلم دل باکه که کرم کام

دل باکه بر طلسم ظلم ازل لولا حرص و صحبت دل ولا لولا سار دل که

هر کس باکه بر عیب دلم کس باکه هم ایلم کو کوره ولی الحرام دل گم هم

کار کرم محمل اللّه ماده است که مطالع او که ملکوم همدم هم صمصام حسد العلم

کار الکلم لوکره ملک هر دل و هلوا بس و اللّه ولولعه با حول هر که خلاف اید

که و کره دل دل که هم ایک لو دو دو لا عمر و حلم بال کمال اسلم و صلاح

حال مصطفی ... والسلام و الکلام قصه مختصر چون رشته هر کار بر زبانی بسته اند

دلان کن کسی از بند نتوانستم در جیب تجوی گریبان گرفت و بازم ... اود

تا بی ... از خاک نشیند سر ... شد و چرخ گرفت بسیار که آن تیره

خاکدان هستی ... که بها بی مرا ... رسید و ... خاک ... بر آید

بس اولدیغکه المسبب برنسانه قصب بیهم داود قمیص لعل کبی [illegible] بعد [illegible]

سلسله جار زنجیر بالذیم کسخت در برنسانی زورق طوفان [illegible] اوکندن [illegible]

رفتار ایلدر [illegible] سعی [illegible] دلکه [illegible] اصطلاح اکیه بردلر

جهد [illegible] زبان رقم [illegible] بعید [illegible] رقم جهره [illegible]

بحر [illegible] رقم [illegible] بی تکلف

[illegible] رقم [illegible] نکهبان خوش [illegible]

داغ حسرت [illegible] رقم [illegible]

باستی [illegible] جاره [illegible] حسرت [illegible]

[illegible]

[illegible]

درد [illegible] حسرت [illegible]

[illegible] رقم جلوه [illegible]

رفتم تشنه بحر تماشا شدم سرد نگه در جوش عرق زمزم بطوفان رفتم

کانی میسوختم و دلو فنا میدلهم زمزم با ولا بمهمان تا ره خیابان رفتم

آه چون مهمان با حور بهشت و خونین سالها لال کرم ابرو دیگر شب مهربان

کجا ماندند و بزرگان انجمن شدند و رفتند رفته در کوی سار رسید بزبان بزم

از سر دولت عالیه سر ایران روز به به ار محمد الله و لکن تنها و از دو

و بر خانی فرمان دار ایران کشور و مدار المهام ایران سلطنت گشته بر دولت

رسیدند تا بر محاسب ایمان شیمه رفت لذیذ تو بهر از خوب و بس بلک که چون

ملا رست ترا ادب با نفت حوا استم و دستمایه تقصیر ای بکام دلدل و ورد دو

جنود دین عرصه فلک طبع بر داد قصیده گرد و سبب زیر تمنا جنون کوم

بیهتن مهد کنار زیر برافراشت دلکش عجب را هم زر صنعت غضب روش کرد زمین

. وقد   فنا ر دیدن ملت جان همه نمود و آن که این آید سینه مردرفت اه الا

سوده در سفینه ماند و و المدار مطلع مدام ملک بلود و د که بکار صلح

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

زاللهم الله حمد کو الا اکرم و النصر بلاد و ملطف رگلهم الله المحمدیم عراه صالح
رسا فهم حصر کرده بار که در سلاک سلسل ال محمد بلاد امکان از ره کلم
کوم در حصه عصر در کروه لک کال کرد کردار م کا ملاح کار م دعا لم عالم کو هر
هیچ در سلک سعور دار م دل سلاه محال بار و لا طرح اساس و دلو کرد
هلاک حیط ره کردار کوهر اماده مصرح سالار و را حامه دلم سطور نواله
اکرم لک کرم اسعد او الله رسول داور دلاور کس در دور عالم آنکار زاید
مصدر عدل و کرم و کوه ز رور دل او مطلع علم و حال فرموده عدل الد
بلاه در در کرد او کله طوح ملک را کرد ره عسکر او دلاه ملا کرد حکم
نوم او در عالم بر کس در مطلاکر ده و صبوه بما در راه آمده در کار کو
عالم هر که لامره کا و کس و دو حاکم دالا ما مل هر در کار و سلاح جلال و کهر
کمار سلک مطلعه عالم آلاه آلود و هم در اصلاح حال دعا کو کما اله
مکر عدل کرده درکه دلم معاکده سهما مطالع ماه و کس هم ساکرده و دولاه

ملوکرا دلالت به کمال کرم که مجد اسم رفیع در سلسله عالم درآمده

و کالوها ز روز دل که دلش به محرم دو محرم دم طمع مرهم دللوم

کو علل حال عالم و دل که صدر انوار کمالات عالم که احکم الحکام.

و حمد للعالمین روز که لطف کرم حمد امر اسلام المهام و الله هم الا حمد و لم

اساس و ارم عالم مطالع و حکم عدو کاه و دلش که طالع سعود

حصل و الله تمام شد للسعی و الله التمام من الله ۱۲۹

سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں

مزمّل یٰسین

زک پہنچنے کا خطرہ تھا۔ یہ ایک خطرناک سازش تھی لہذا سلطان عبدالحمید خاں نے داماد محمود پاشا کو تلاش کرنے اور فراری سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ داماد محمود پاشا فرانسیسی سفارت خانے کی مدد سے ایک فرانسیسی جہاز میں سوار ہو کر چند دنوں کے بعد مارسیلز پہنچ گئے۔ سلطان اور درسعادت کے اصرار کے باوجود حکومت فرانس نے داماد محمود پاشا کو ملک سے خارج کرنے اور سلطان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد منیر بے، احمد جلال الدین پاشا اور خدیو مصر نے مصالحت کی کوششیں کیں، لیکن وہ بھی بے سود ثابت ہوئیں۔ داماد محمود پاشا نے فرانس پہنچتے ہی احمد رضا کو ایک تعریفی خط لکھا جس میں ان کی بہت مدح سرائی کی گئی۔ "سرزمین ترکی نے صدیوں سے آپ جیسا انسان پیدا نہیں کیا ہے۔۔۔" جواب میں احمد رضا نے داماد محمود پاشا کی عالی ہمتی اور آزاد خیالی کو خوب سراہا اور لکھا "ہماری رائے میں داماد محمود پاشا کا یہ دلیرانہ فعل نہ صرف "جوانان ترک" بلکہ عوام الناس کے لیے بہت ہی خوش آئند ہے۔ ہر وہ شخص جو وطن عزیز کی خدمت پر کمربستہ ہے محمود پاشا کی خلوص قلب سے تائید کرے گا"

شہزادہ مصطفیٰ فاضل پاشا کی طرح داماد محمود پاشا نے بھی ۲۱ جنوری ۱۹۰۰ء کو سلطان عبدالحمید کے نام ایک "کھلا خط" بھیجا۔ اس میں سلطان اور عمال حکومت پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور ان کی برائیاں بیان کی گئیں۔ انھوں نے سلطان عبدالحمید کی ذات پر بھی شدید حملے کیے۔ داماد محمود پاشا نے لکھا "حضور والا، حقیقت یہ ہے کہ آپ کا طریقہ حکومت ایک نیک اور منصف خلیفہ کے نظام و انصرام سے مختلف ہے اور نہ ہی وہ والیان یورپ کے نظام سے مطابقت رکھتا ہے۔ آپ کا نظام حکومت ہزاروں سال قبل کے ظالم و جابر حکمرانوں سے ملتا جلتا ہے۔۔۔ عوام الناس کی فلاح و بہبود سے آپ کو چنداں دلچسپی اور سروکار نہیں ہے۔ آپ ہمارے ملک کی تباہی و بربادی اور دوسرے بہت سے جرائم کے ذمہ دار ہیں۔ آپ نے جو خون بہایا ہے، جو خاندان تباہ کیے ہیں۔۔۔ میں نے یہ تمام خیالات متعدد بار آپ کے گوش گزار کیے لیکن آپ نے نہ تو میری نیک نیتی کو سراہا اور نہ میرے خلوص کو سمجھا۔" یہ امر قابل ذکر ہے کہ گو داماد محمود پاشا اصلاحات کے حامی تھے مگر انقلابی تحریک میں ان کا کوئی خاص مقام نہ تھا اور ان کا یہ فعل اغلباً محض ذاتی پرخاش پر مبنی تھا۔ چونکہ وہ سلطان عبدالحمید سے بہت قربت رکھتے تھے اور شاہی خاندان کے معزز فرد تھے لہذا سلطان عبدالحمید کو بدنام اور مطعون کرنے کی مہم میں ان کی شرکت، یورپی سازشیوں کے لیے بہت کارآمد تھی۔

داماد محمود پاشا کے فرار کے چند ماہ بعد سلطان کے مقربین خاص میں سے اسمٰعیل کمال بے بھی فرار ہوگئے۔ اسمٰعیل کمال بے البانیہ کے باشندہ تھے اور سلطنت میں متعدد اہم عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ کمال بے نے ایک برطانوی جہاز پر پناہ لی اور یکم مئی ۱۹۰۰ء کو یونان روانہ ہوگئے۔ اسمٰعیل کمال بے نے پہلے ہی سے برطانوی سفیر نکولس اوکانر NICHOLAS OCONNAR سے ساز باز کر رکھی تھی۔ بعد کے واقعات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے انگریزوں سے مشتبہ تعلقات تھے۔ اسمٰعیل کمال بے نے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے کہ ان کی انقلابی اور اصلاحی کاموں میں دلچسپی نے سلطان کو ان کی طرف سے بدظن اور مشتبہ کر دیا تھا اور جب ان کو طرابلس کا والی مقرر کیا گیا تو انھوں نے فرار ہی کا منصوبہ بنایا۔ یونان سے کمال بے مغربی یورپ پہنچے اور برسلز میں رہائش اختیار کی۔ برسلز میں ایک البانوی فائق بے ۱۸۹۷ء سے ایک رسالہ "البانیہ" نکالتا تھا۔ اسمٰعیل کمال بے نے اس کا انتظام سنبھال لیا مگر جلد ہی دونوں میں اختلاف رائے ہوگیا اور اسمٰعیل کمال بے نے اپنا اخبار LA SALUT DE L' A B ANIE جاری کیا جو البانوی ترکی اور یونانی زبانوں میں چھپتا تھا۔ جب دستور منیر بے نے مصالحت کی کوشش کی اور کمال بے کو سلطان کی طرف سے سفیر جہاں گرد کے عہدے کی پیشکش کی تاکہ "وہ یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کرکے وہاں کے سیاسی اور سماجی اداروں کا معائنہ کریں اور اپنی سفارشات سلطان کو بھیجیں تاکہ ان کی بنیاد پر ترکی میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔" اسمٰعیل کمال بے نے اس پیشکش کو نامنظور کر دیا۔

ان دو واقعات نے یورپ میں مقیم "جوانان ترک" میں پھر ایک تازہ لہر دوڑا دی اور ۱۸۹۷ء میں مراد بے کے فیصلے کے بعد سے جو مایوسی اور جمود طاری تھا وہ کسی حد تک کم ہوگیا لیکن اندرون سلطنت انقلابی تحریکوں اور کارروائیوں میں کوئی قابل ذکر تجدید نہیں ہوئی۔

"جوانان ترک" کے علاوہ سلطنت عثمانیہ کے اقلیتی گروہوں کے نمائندے یورپ میں بیٹھ کر اصلاحات اور قومی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پیرس، جنیوا، برسلز اور لندن ان کی سیاسی سرگرمیوں کے مراکز تھے۔ ان اقلیتوں میں آرمینی سب سے زیادہ منظم اور شور و غوغا کر رہے تھے۔ بعض مورخین کی رائے ہے کہ یہودیوں کا بین الاقوامی ادارہ[1] ان تحریکوں اور کارروائیوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی

[1] GRAND ORIENT

کر رہا تھا۔[۱]

۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۵ء میں سلطنت کے آرمینی باشندوں نے بغاوت اور شورش کی جس کو سختی سے کچل دیا گیا۔ ان شورشوں میں ترکوں اور آرمینیوں دونوں نے صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا بہرکیف یہ ایک اندرونی معاملہ تھا اور حکومت بغاوت کچلنے میں حق بجانب تھی۔ دنیا کی کوئی حکومت ملک کی سالمیت کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی ہے۔ لیکن یورپ کے عیسائیوں میں ہمدردی اور غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں اور بدخواہوں نے ان واقعات کو بڑھا چڑھا کر مشہور کیا۔ یورپ میں آرمینیا کے انقلابی گروہ متعدد جرائد اور رسالے بھی شائع کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۰۰ء میں چند فرانسیسیوں نے جن میں کلیمنسو اور اناطول فرانس ANATOLE FRANCE، شامل تھے ایک پندرہ روزہ اخبار PRO ARMENIA ان کی حمایت میں جاری کیا۔

دوسرے اقلیتی گروہ البانوی، کرد اور عرب تھے۔ البانوی سلطنت کے دائرے میں رہ کر خود مختاری کا مطالبہ کر رہے تھے۔ فائق بے، جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، جوانان ترک کے مخالف اور سلطان عبدالحمید کے حامیوں میں سے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ سلطان کی خوشنودی حاصل کر کے قومی اغراض و مقاصد پورے ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ فائق بے کے چند رفقا اس نظریے سے متفق نہیں تھے اور انھوں نے روم سے اپنا علیحدہ اخبار شائع کرنا شروع کر دیا۔ غالباً یہی نظریہ فائق بے اور اسمٰعیل کمال بے کے درمیان اختلاف کا موجب ہوا۔ فائق بے نے

---

[۱] "گرینڈ اورینٹ" یہودیوں کی ایک خفیہ تنظیم تھی جس کا تعلق فری میسنری کی تحریک سے تھا۔ ۱۹۳۰ء تک اس "لاج" کا فرانس کی سیاسی زندگی پر بڑا اثر و رسوخ تھا "حریت، مساوات اور اخوت" LIBERTY, EQUALITY, FRATERNITY انھیں کا مقولہ تھا۔ ۱۸۷۱ء میں گرینڈ اورینٹ لاج نے ممبر بننے کے لیے خدا پر یقین رکھنے کی شرط ختم کر دی جس کی بنا پر دنیا کے متعدد فری میسن اداروں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ لیکن پھر بھی فرانس اٹلی اور اسپین میں اس کا بڑا اثر تھا اور یہ بات قابل غور ہے کہ ابراہیم تیمو اٹلی ہی سے اپنی خفیہ تنظیم کے قواعد و ضوابط لے کر آئے تھے۔ گرینڈ اورینٹ آج بھی موجود ہے اور اس کے اثر و رسوخ کے متعلق کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا لائحہ عمل فرسودہ خیال کیا جاتا ہے اور اس کے بہت سے پیرو اشتراکیت کے زیر اثر آ گئے ہیں۔

"جوانان ترک" پر رکیک حملے کیے اور سلطنت کی خرابیوں کے لیے عوام کو ذمہ دار اور سلطان عبدالحمید کو بری الذمہ قرار دیا۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے یہ تک لکھ دیا۔

"میں یہ بات حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک مجھے ایک بھی ترک ایسا نہیں ملا ہے جس نے صدق دل سے آرمینیا کے قتل عام کی مذمت کی ہو۔"

کرد گروہ عبدالرحمٰن بیدر سہان کی قیادت میں کام کر رہا تھا۔ یہ لندن سے اخبار "کردستان" شائع کرتے تھے اور "عثمانلی" کی معاونت بھی کر رہے تھے۔ اسحٰق سکوتی اور عبداللہ جودت بھی کُرد تھے مگر انھوں نے کرد قومیت کے مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں لی کیونکہ وہ اپنے کو ترک اور عثمانی کہتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی زمانے میں عبدالرحمٰن کے لڑکے عثمان پاشا افواج عثمانیہ کی طرف سے مہمات میں شرکت کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کرد قوم پرستوں کی تحریک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس قسم کی انجمنوں کا قیام یورپی سازشوں کا نتیجہ تھا جن کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یورپ کی رائے عامہ کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف ابھارا جائے اور سلطان عبدالحمید کو ظالم و جابر ثابت کیا جائے۔

عرب اقلیتی گروہ نے انقلابی تحریک میں کوئی قابل ذکر کردار نہیں ادا کیا۔ یہ لوگ سلطنت میں اصلاحات کے حامی تھے اور یہ چاہتے تھے کہ ان کو سلطنت میں مزید مراعات حاصل ہوں اس میں شک نہیں کہ اس دور میں عربوں میں جداگانہ قومیت کا تصور پیدا ہو چلا تھا اور یورپی کارندے علمی تحقیق و تفتیش اور مشنری کاموں کے لبادے میں قوم پرستی کے نظریات پھیلا رہے تھے۔ یورپ میں کوئی عرب تنظیم سرگرم عمل نہیں تھی۔ اس وقت سب سے مشہور عرب خلیل غنیم تھے جو کہ احمد رضا کے رفیق اور "جوانان ترک" کے سرگرم رکن تھے۔

الغرض یہ کہ اس صدی کے اوائل میں یورپ میں بے شمار اخبار و جرائد اور تنظیمات، ادارے اور انجمنیں سلطان عبدالحمید کے خلاف کام کر رہی تھیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کو کسی نہ کسی یورپی حکومت کی سرپرستی اور پشت پناہی حاصل تھی۔ سلطنت عثمانیہ کے سوال پر روس، برطانیہ اور فرانس کی رقابت اور چشمک عروج پر تھی۔ سوائے ترکوں (یعنی مسلمانوں) کے ہر اقلیتی گروہ کا کوئی نہ کوئی سرپرست موجود تھا۔ احمد رضا نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تلخ آواز میں یوں گلہ کیا۔

سفارتی دفاتر، بیرونی اسکول، منزلوں کے مکانات، جو سب مراعات خصوصی کے تحت محفوظ ہیں۔ ترکوں کو، آرمینی اور بلغاری شورش پسندوں کی طرح نہ تو پناہ دیتے ہیں، نہ اسلحہ جات مہیا کرتے ہیں اور نہ پروپگنڈا کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ اگر ترک باشندے گرفتار کرکے دار پر چڑھا دیے جائیں تو زاران کی طرف سے مداخلت نہیں کریں گے اور نہ ہی "عثمانیہ بینک" لوٹنے[1] پر روسی سفارت خانہ ان کو حفاظت سے جہاز پر سوار کرا دے گا۔" احمد رضا کی یہ شکایت بالکل حق بہ جانب تھی کیوں کہ واقعتاً سلطنت میں ترکوں کی حالت سب سے بدتر تھی۔[2]

داماد محمود پاشا کے یورپ پہنچنے کے بعد تمام تر "جوانان ترک" ان کے گرد اکٹھے ہونے لگے مگر محمود پاشا کی صحت گر رہی تھی چنانچہ قیادت کا بار ان کے بیٹوں صباح الدین اور لطف اللہ کے کاندھوں پر پڑا۔ ان دونوں نے پہلا منصوبہ یہ بنایا کہ تمام انقلابی گروہوں، جماعتوں اور انجمنوں کو یکجا کر کے ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے چنانچہ صباح الدین اور لطف اللہ نے "عثمانی آزاد خیالوں" کی ایک کانگرس منعقد کرنے کی اپیل کی جس کا منشا و مقصد یہ تھا کہ سلطنت میں آزادی و انصاف قائم کرنے کے مسئلے پر غور و خوض کیا جائے۔ یہ کانگرس ۴-۹ فروری ۱۹۰۲ء کو پیرس میں منعقد ہوئی۔ سلطان عبدالحمید کی درخواست پر حکومت فرانس نے اس کانگرس کے انعقاد کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مگر بعد ازاں یہ پابندی ہٹالی گئی۔ پابندی کی وجہ سے شہزادہ صباح الدین کی صدارت میں پہلا اجلاس ایک نجی گھر پر منعقد کیا گیا۔[3] دوسرے اجلاس صباح الدین کی اقامت گاہ میں منعقد ہوئے۔ اس کانگرس میں تقریباً پچاس ترک آرمینی، البانوی، کرد، عرب، یہودی اور یونانی نمائندوں نے شرکت کی۔ صباح الدین نے افتتاحی تقریر میں سلطان اور ان کی حکومت پر تنقید کی اور اقلیتوں کے ساتھ بدسلوکی کا الزام لگایا۔ انھوں نے ترک عوام کو حکومت کی بدعنوانیوں سے خبردار کرتے ہوئے کہا، "ترک عوام جو سلطنت میں اکثریت رکھتے ہیں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے مقابلے میں خصوصی حقوق

---

[1] اگست ۱۸۹۶ء میں آرمینیا کی انقلابی فیڈریشن نے استنبول میں "عثمانیہ بنک" پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

[2] بحوالہ سر ہیری لیوک THE MAKING OF MODERN TURKEY (مطبوعہ لندن ۱۹۳۶ء) صفحہ ۵۸ - ۵۹

[3] YOUNG TURKS by RAMSAUR صفحہ ۲۲

حاصل کرنے کے خواہاں نہیں ہیں . . . . ہم جو اصلاحات نافذ کرانا چاہتے ہیں اور جن کے لیے ہم سرگرداں ہیں وہ ہم کسی ایک ملت و مذہب، فرقہ یا طبقہ کے لیے طلب نہیں کر رہے ہیں۔ ہم یہ اصلاحات بلا تخصیص، تمام عثمانیوں کے لیے طلب کر رہے ہیں" صباح الدین کو یہ خوش فہمی تھی کہ کانگرس کے مندوبین کسی مشترک ملی یا قومی جذبے کے تحت کام کر رہے ہیں جب کہ حقیقت یہ تھی کہ ان تمام مندوبین اور گروہوں کے درمیان سلطان عبدالحمید اور ان کی حکومت کی طرف سے بداطمینانی ہی ایک واحد اور مشترکہ جذبہ اور نظریہ تھا۔ بعض انقلابی گروہ تو شاہی خاندان کا نام و نشان مٹانے پر تلے ہوئے تھے ان کے نزدیک فقط سلطان عبدالحمید کی معزولی کافی نہ تھی "بادشاہت" کے سوال پر خود ترک جماعتوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس کے برعکس اقلیتی گروہوں نے متحدہ محاذ قائم رکھا اور کسی قسم کے نفاق کا اظہار نہیں کیا۔ مندوبین کی ایک خاص کمیٹی نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد حسب ذیل قراردادیں تیار کیں۔

(۱) ہم عثمانی عوام موجودہ حکومت سے، جو سلطنت کی بدعنوانیوں اور عوام پر ظلم کی ذمہ دار ہے کسی قسم کے تعاون اور معاہدے کے روادار نہیں ہیں۔

(۲) ہم تہیہ کرتے ہیں کہ بلا تفریق مذہب و ملت سلطنت کے مختلف عوام اور اقوام کے درمیان ایک عہد نامہ قائم کیا جائے جو ان تمام حقوق کی ضمانت دے گا جو شاہی خطوط کے ذریعہ عطا کیے گئے تھے اور جن کی بین الاقوامی عہد ناموں کے ذریعہ توثیق کی گئی۔ عوام کو وہ تمام ذرائع اور سہولتیں مہیا کی جائیں جن کے ذریعے یہ مقامی نظم و نسق میں اپنی جائز خواہشات اور آرزوؤں کو پورا کر سکیں۔ تمام باشندوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے تاکہ وہ اپنے فرائض کی بجا آوری کر سکیں۔ اور ان میں تخت شاہی اور آل عثمان کے لیے وفاداری کے جذبات پیدا ہوں تاکہ ان میں اتفاق پیدا ہو۔

(۳) ہم ہر ممکن حالات میں عثمانی عوام اور محب وطن افراد کی کوششوں کو مذکورہ تین مقاصد حاصل کرنے میں ہر ممکن مدد بہم پہنچائیں گے۔

(ا) سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کا تحفظ۔

(ب) ترقی و خوشحالی کے لیے ملک میں صلح و آشتی اور امن و امان کا قیام۔

(ج) سلطنت کے بنیادی اصولوں کی عزت و توقیر اور آئین ۱۸۷۶ء کا نفاذ جو کہ اصلاحات، سیاسی آزادی و حقوق کا اہم ضامن ہے۔

(۴) ہم بین الاقوامی عہد ناموں خصوصاً "صلح نامہ برلن" اور اس میں سلطنت عثمانیہ کے اندرونی نظام سے متعلق ضابطوں کو سلطنت کے دوسرے صوبوں پر مطلق کرنے کے سلسلے میں عمل درآمد کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔

اس کانگرس میں "انجمن اتحاد و ترقی" کے چند ارکان بھی شریک ہوئے۔ اولاً ان پرانے "جوانان ترک" اور نئے گروہوں میں چند بنیادی اختلافات تھے اور "اتحاد و ترقی" کانگرس کے "عثمانی" کردار سے مطمئن نہیں تھی مگر مندرجہ بالا قرارداد پیش ہونے کے بعد ان سب گروہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن یہ اطمینان زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ جب یہ قرارداد کانگرس کے پورے اجلاس میں توثیق کے لیے پیش کی گئی تو ایک نمائندے نے تجویز پیش کی کہ اس میں "سلطنت عثمانیہ" کے مظلوم عوام کی طرف سے یورپی طاقتوں سے مداخلت کی درخواست کا اضافہ کیا جائے۔ احمد رضا نے اس تجویز پر سخت احتجاج کیا اور ہر ممکن مخالفت کی مگر یہ تجویز منظور کر لی گئی اور قرارداد کے آخر میں حسب ذیل اضافہ کیا گیا۔

"کانگرس ایک مستقل کمیٹی مقرر کرے گی جو ان اصولوں کے نفاذ کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی اور ۱۸۵۶ء کے عہد نامہ پیرس اور ۱۸۷۸ء کے عہد نامہ برلن کے دستخط کنندگان سے مناسب رابطہ قائم کرکے اُن بین الاقوامی معاہدوں کے نفاذ کے لیے، جن کا مقصد ترکی کے اندرونی حالات میں نظم و ضبط قائم کرنا ہے، ان کی اخلاقی حوصلہ افزائی اور عملی تعاون حاصل کرے۔ علاوہ ازیں ان معاہدوں کی رو سے بین الاقوامی ذمہ داریوں اور سلطنت کے مختلف ولایتوں میں۔ ان ضابطوں کے اطلاق کا، جن سے ہر ملت کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے بندوبست کرے۔"[۱]

احمد رضا نے اکثریت کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مندوبین نے ان پر ہٹ دھرمی اور عدم تعاون کا الزام لگایا مگر اس کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر اڑے رہے اور بالآخر ان کے اصرار پر کانگرس کی روئیداد میں اس امر کو تسلیم کر لیا گیا کہ بیرونی مداخلت سلطنت عثمانیہ کے حق آزادی کے منافی ہے اور سلطنت کے مفاد کے لیے مضر ہے کیونکہ بیرونی طاقتوں کے اقدام ان کی خود غرض مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس اعلان میں اس امر پر بھی افسوس ظاہر کیا گیا کہ "کانگرس مختلف عثمانی عناصر میں یک جہتی

---

[۱] YOUNG TURKE by RAMSAUR ۔ ص ۶۶

اور ہم آہنگی پیدا نہ کرسکی اور حسب توقع اتحاد و اتفاق کے ذریعے منفعت بخش نتائج برآمد نہ ہوسکے۔ بیرونی مداخلت کے سوال پر صرف آرمینی نمائندوں نے احمد رضا کی حمایت کی۔ اس کی بڑی وجہ ان کی اپنی مفاد پرستی تھی۔ آرمینی گروہ بہت منظم تھا اور اس کو یورپی حکومتوں کی سرپرستی حاصل تھی اور انھوں نے اس کانگرس میں اپنے مفاد کو فروغ دینے کے لیے شرکت کی تھی۔ آرمینی نمائندوں نے کانگرس میں صاف صاف کہہ دیا کہ سلطنت کی جن ولایتوں میں آرمینی باشندوں کی اکثریت ہے وہاں خصوصی مراعات وحقوق کی حصولیابی ان کا اولین اور آخری مقصد ہے۔ انھوں نے اس امر کی صاف وضاحت کردی کہ ان کی کارروائیوں کا مقصد سلطنت کی سالمیت کو خطرے میں ڈالنا نہیں ہے۔ ان کا جھگڑا صرف موجودہ حکومت سے ہے اور اس حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے وہ آزاد خیال عثمانیوں سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔

کانگرس نے اختتام پر منظور شدہ قرارداد کی توثیق کی اور ایک بار پھر یہ اعلان کیا کہ اس کانگرس کا مقصد موجودہ نظام حکومت کو ختم کر کے ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو آئین آزادی اور انصاف پر مبنی ہو۔ کانگرس نے انسانیت کے نام پر یورپی طاقتوں سے درخواست کی کہ سلطنت کی بھلائی کے لیے وہ اُن معاہدوں کو نافذ کرائیں جو ان کے اور درسعادت کے درمیان قائم ہوئے ہیں۔ آرمینی گروہ سے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے اعلان میں یقین دلایا گیا کہ ان اختلافات کے باوجود کانگرس آرمینی باشندوں کے حقوق اور فلاح وبہبودی کے لیے کام کرتی رہے گی۔

اس کانگرس کی کارروائیوں، قرارداد اور اعلانات کو دیکھنے سے ان میں شریک مختلف عناصر کے مابین اختلافات بخوبی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف صباح الدین سلطان کے زیر سایہ "وفاق عثمان" کے منصوبے بنا رہے تھے جس کے اندر مختلف اقلیتوں کو بڑی حد تک خود مختاری حاصل ہوتی۔ دوسری طرف احمد رضا ترک قوم پرستی کا پرچار کر رہے تھے اور سلطان عبدالحمید کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھتے تھے۔ ان کی رائے میں سلطان کی معزولی اور آئین ۱۸۷۶ء کا نفاذ، تمام مشکلات اور خرابیوں کا حل تھا۔ احمد رضا کی رائے یہ بھی تھی، جو بڑی درست تھی کہ سلطنت کے ابتر حالات کی ذمہ دار یورپی طاقتیں تھیں۔ ان کی سازشوں، رقابتوں اور خود غرض مقاصد نے سلطنت میں انتشار و افراتفری پیدا کردی تھی، بلند نصب العین اور نیک جذبات

کے باوجود صباح الدین مسائل کی تہہ تک نہ پہنچ سکے اور نہ ہی وہ ان مسائل کی پیچیدگیوں کو سمجھ پائے سب سے سنگین اختلاف بیرونی مداخلت کے سوال پر پیدا ہوا اور کانگرس میں نفاق کا بڑا سبب ثابت ہوا۔ صباح الدین مختلف عناصر کے جذبات و خیالات کا تجزیہ کرنے میں قطعی ناکام رہے۔ احمد رضا ہمیشہ سے مداخلت کے مخالف تھے اور دوسرے گروہوں کے خیالات بھی پوشیدہ نہ تھے بہرکیف کانگرس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ صباح الدین اور احمد رضا کے درمیان اختلافات قائم ہو گئے۔ اور یورپ کے "جوان ترک" دو گروہ میں بٹ گئے۔

احمد رضا نے چند رفقا کی مدد سے "انجمن اتحاد و ترقی" کے نام پر ایک نیا اخبار "شورائے امت" جاری کیا اور اپنے نظریات و خیالات کی تبلیغ میں ایک بار پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ صباح الدین نے اسمٰعیل کمال بے کی اعانت سے طرابلس میں متعین ترکی سپہ سالار اعلیٰ مارشل رجب پاشا سے جو البانوی تھے، مل کے سازش کی کہ سالونیکا پہنچ کے وہاں سے درۂ دانیال پر قبضہ کر لیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ اہل یورپ کو سلطنت کے معاملات کی طرف توجہ دلائی جائے اور سلطان عبدالحمید پر دباؤ ڈالا جائے۔ رجب پاشا کی منظوری حاصل کرنے کے بعد اسمٰعیل کمال بے نے برطانوی سفیر متعینہ پیرس کو اس سازش سے آگاہ کیا اور اُن سے برطانوی وزیر خارجہ لارڈ لنیڈوں (LORD LANDS DOWN کے نام خط حاصل کر کے لندن روانہ ہو گئے۔ کمال بے کا مقصد یہ تھا کہ حکومت برطانیہ سے مدد اور تعاون حاصل کیا جائے اور روسی مداخلت کے خدشے کا سدباب کیا جا سکے لندن سے کمال بے قاہرہ گئے جہاں انھوں نے لارڈ کرومر سے گفت و شنید کی۔ صباح الدین اور اسمٰعیل کمال بے کی کوشش کے باوجود یہ سازش ناکام ہوئی کیونکہ رجب پاشا کی فوج کو طرابلس سے سالونیکا لانے کے لیے جہازوں کا بندوبست نہ ہو سکا۔ اس سازش کے سلسلے میں تمام اخراجات صباح الدین نے اٹھائے اور یہ امر قابل غور ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے لندن کے متعدد سفر کیے۔ اسی دوران ۱۸ جنوری ۱۹۰۳ء کو داماد محمود پاشا کا برسلز میں انتقال ہو گیا اور ان کو پیرس کے مسلم قبرستان میں دفن کیا گیا۔

بعض مورخین کی رائے میں اسمٰعیل کمال بے برطانیہ اور یونان کے تنخواہ دار تھے اور ان کا مقصد صرف روپیہ کمانا تھا۔ کمال بے پارلیمنٹ میں البانوی نمائندہ تھے۔ ذہانت اور پراثر شخصیت

کے باوجود وہ مالی لین دین میں غیر محتاط اور غیر معتبر انسان تھے۔ اس واقعے سے یہ ظاہر ہے کہ حکومت برطانیہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف ہر طرح کی سازشوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی اور سلطنت عثمانیہ کی قانونی اور جائز حکومت کا تختہ الٹنے کے درپے تھی۔

اس تمام دوران سلطان عبد الحمید نے داماد محمود پاشا اور صباح الدین سے سمجھوتہ کی کوششیں کیں مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ سلطان کی طرف سے اس بات کی بھی کوشش کی گئی تھی کہ داماد محمود پاشا اپنی بیماری کے آخری ایام میں وطن لوٹ آئیں مگر صباح الدین راضی نہ ہوئے۔ سلطان عبد الحمید کا مقصد و منشا یہ تھا کہ سلطنت میں انتشار کو پھیلنے سے روکا جائے اور یورپی طاقتوں کے سامنے ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے وہ ان تمام عناصر کو جو کوتاہ نظری میں یورپی سازشوں کا آلۂ کار بنے ہوئے تھے اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ سلطنت نرغے میں تھی اور یہ اشد ضروری تھا کہ سلطنت اور حکومت کے نظم و نسق کو مضبوط و مستحکم بنایا جائے اور انقلابیوں اور سازشیوں کو نفاق و انتشار نہ پھیلانے دیا جائے۔

۱۹۰۲ء کی کانگرس اور اپنے والد کے انتقال کے بعد سے صباح الدین زیادہ وقت عمرانی اور سیاسی کتب و مضامین کے مطالعے میں صرف کرنے لگے۔ ان پر فرانسیسی مفکرین خصوصاً ایڈمنڈ ڈیمولنس EDMOND DEMOLINS کا بہت اثر پڑا اور انھوں نے ان کے فلسفے سے متاثر ہو کر ایک نئی تنظیم " تشبو شخصی و عدمی مرکزیت " (یعنی شخصی اختراع و عدم مرکزیت) قائم کی۔ اس تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت کی بنیادی خرابیوں کو دور کیا جائے۔ صباح الدین کا کہنا تھا کہ سلطنت کی زبوں حالی کی ذمہ داری تنہا سلطان پر عائد نہیں ہوتی ہے بلکہ عوام کی بے حسی بھی اس کی ذمہ دار ہے۔ اور اس صورت حال کا گہرا مطالعہ کیے بغیر بنیادی نقائص و کمزوری کی وجوہات معلوم نہیں ہو سکتی ہیں۔ صباح الدین کی رائے میں ناقص نظام تعلیم کی وجہ سے لوگوں میں اختراع و جدت کا مادہ ختم ہو چکا تھا۔ مفلوک الحال طلبے میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اپنی حالت کو بہتر بنا سکیں اور متوسط طبقہ سرکاری ملازمتوں اور حصول اقتدار کی جدوجہد میں پھنس کر بد نیت اور ناقص و ناکارہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے نظم و نسق میں بدنظمی پھیل گئی تھی۔ ان حالات کو درست کرنے کے لیے صباح الدین نے مغرب میں تعلیم یافتہ ترک نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ آزاد اور کارآمد

ذرائع معاش اختیار کریں۔ اپنے نظریات کی تشہیر کے لیے ۱۹۰۶ء میں صباح الدین نے اپنے رضاعی بھائی احمد فاضل بے کی ادارت میں ایک رسالہ "ترقی" جاری کیا۔

صباح الدین کی نیک نیتی اور خلوص پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے عزائم و مقاصد نیک و پاک تھے۔ وہ سلطنت کے مسائل کا حل سنجیدگی سے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان مسائل کے بارے میں ان کی معلومات بہت ہی ناقص تھیں۔ ڈیمولنس کا فلسفہ، جس کی بنیاد پر صباح الدین مسائل کا حل ڈھونڈھ رہے تھے، ایک ایسی سلطنت اور ایک ایسی تہذیب سے متعلق تھا جس کے حالات و ماحول سلطنت عثمانیہ سے بالکل مختلف تھے۔ صباح الدین نے سلطنت کے مسائل میں اسلام کے زبردست اثرات کو قطعاً خاطر میں نہیں لیا اور نہ ہی قومیت کے ابھرتے ہوئے ہنگامہ خیز محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی حالانکہ ۱۹۰۲ء کی کانگرس میں آرمینی گروہ کے رویے سے ان کی آنکھیں کھل جانی چاہیئے تھیں۔ دراصل انھوں نے عمر کا زیادہ حصہ ترکی سے باہر گزارا تھا اور ان کو ترکی کے مسائل کا کامل علم نہیں تھا۔ ذہنی و روحانی طور پر وہ اپنے ترک بھائیوں سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ترکی میں ان کی مختصر زندگی محدود دائرہ میں بسر ہوئی تھی اور ان کی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشوونما یورپ میں ہوئی تھی۔ ان کی کوششوں کا قابل تعریف پہلو صرف یہی تھا کہ وہ سلطنت عثمانیہ کی تمام ملتوں کو متحد کر کے مساوی درجہ دینا چاہتے تھے۔ "عدم مرکزیت" کی شاخیں تمام سلطنت میں قائم کی گئیں مگر تنظیم نے کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا اور "جوانان ترک" کی قیادت احمد رضا کے ہاتھوں ہی میں رہی۔ صباح الدین پر فرانسیسی اثر بہت غالب تھا۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ فرانسیسیوں نے ان کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔ اس دور میں ہم بارہا دیکھ چکے ہیں کہ حکومت فرانس ہر اُس فرد اور عنصر کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی جو سلطان عبدالحمید کے خلاف، جو اپنی فہم و فراست سے سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے زہر اور انتشار پھیلا سکے اور سلطان کے لیے تکلیف کا موجب بنے۔

صباح الدین سے فرانسیسیوں کو دو توقعات تھیں، اول یہ کہ سلطان عبدالحمید کے بعد عین ممکن تھا کہ صباح الدین کو حکومت میں اہمیت حاصل ہو جائے اور دوئم یہ کہ اگر صباح الدین کی تجاویز مقبول و منظور ہو گئیں تو شام اور لبنان میں فرانسیسی اثر و رسوخ مستحکم ہو سکے گا۔ صباح الدین کے چھوٹے بھائی لطف اللہ اپنے والد کی وفات کے بعد استنبول واپس آ گئے تھے اور سلطان عبدالحمید نے ان کو معاف کر دیا۔ ۱۹۰۶ء میں سلطان

کے ایما پر لطف اللہ پیرس گئے تاکہ صباح الدین کو سلطان سے مصالحت پر آمادہ کر سکیں مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ بہرکیف ترکی کی انقلابی تحریک میں صباح الدین کا کوئی ٹھوس اور عملی حصہ نہیں ہے۔

اس تمام دوران احمد رضا نے سلطان کے خلاف جدوجہد کو جاری رکھا۔ "مشورت" حسب دستور سلطنت میں چوری چھپے آتا تھا جس میں سلطنت کی سالمیت اور "عثمانیت" کی وکالت ہوتی۔ احمد رضا کو کٹر مسلمان کہنا مشکل ہے، سچ تو یہ ہے کہ بظاہر ان کو اسلام سے کم ہی دلچسپی تھی مگر انھوں نے اسلام کی ہر طرح سے حمایت کی اور اسلام کے خلاف تنقیدوں کے زوردار مدلل جوابات لکھے۔ یہ احمد رضا ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس پر آشوب دور میں انجمن " اتحاد و ترقی" کا نام زندہ اور باقی رہا۔ حتیٰ کہ ابراہیم تیمو نے بھی ان کی قیادت کو تسلیم کر لیا تھا۔ الغرض یہ کہ ۱۹۰۶ء کے اوائل میں "جوانان ترک" دو گروہوں میں بٹ چکے تھے اور احمد رضا کی قیادت مسلّم ہو چکی تھی۔ اسی زمانے میں فوجی افسروں کے ایک گروہ نے سالونیکا میں ایک تنظیم قائم کی جس سے رابطہ قائم ہو جانے سے احمد رضا کو مزید تقویت حاصل ہو گئی، قوم پرستی کے جذبات عروج پر تھے، احمد رضا اور ان کے رفقا زمانے کے رخ کو دیکھ رہے تھے اور صباح الدین کے عکس حقیقت پسندی سے کام لے کر سلطنت میں پیدا ہونے والے نئے حالات کو جانچ رہے تھے۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے اور انقلاب کا سیل رواں بہہ نکلنے کو تھا۔

قصر یلدیز میں گوشہ نشین سلطان اپنی ذکاوت و فراست کے باوجود آنے والے واقعات کو روکنے سے مجبور تھا۔ سلطنت کے یورپی ساحلوں سے وہ آندھی اٹھنے والی تھی جس نے بالآخر آل عثمان کا پرچم سرنگوں کر دیا۔

یورپ اور سلطنت عثمانیہ

سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تاریخ میں یورپ کے ممالک کا بھی بڑا اہم حصہ ہے۔ علاقائی حرص، تجارتی اغراض اور نظریاتی تصورات، ان سب نے سلطنت میں انقلابی رجحانات اور تحریکوں کو پیدا کرنے اور چلانے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے یورپی ممالک نے ریشہ دوانیوں، سازشوں اور سیاسی چالبازیوں کا جال پھیلا دیا۔ ۱۴ویں صدی سے لے کر پہلی جنگ عظیم تک سلطنت عثمانیہ ایک عظیم فوجی قوت اور تمدنی طاقت اور اسلام کی علم بردار تھی لہٰذا یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقت اور مسیحی تہذیب سے ٹکراؤ ایک لازمی امر تھا۔ اہلِ یورپ صلیبی جنگوں کی ہزیمت کو نہیں بھلا سکتے تھے اور آج بھی اسلام دشمنی ان کی سیاسی پالیسی کا ایک بنیادی اصول ہے۔ ۱۸ویں صدی میں سلطنت کی فوجی طاقت میں قابلِ فکر انحطاط آگیا اور اسی دور سے یورپ کی جارحانہ کارروائیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ ان یورپی طاقتوں میں روس، فرانس، برطانیہ اور جرمنی قابلِ ذکر ہیں[۱]۔ ان ممالک کے بہت سے مفاد سلطنت عثمانیہ کے ساتھ وابستہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرق میں بھی مغربی شہنشاہیت کی راہ میں سلطنت عثمانیہ ہی ایک مشکل رکاوٹ تھی اور اس لیے ان یورپی ممالک نے ہر ممکن ذرائع سے سلطنت میں انتشار اور افراتفری پھیلانے کی کوشش کی۔ ان ممالک اور سلطنت کے تعلقات کی داستان ایک افسوس ناک باب ہے جس میں سازشوں، جعل سازیوں اور مکر و فریب کے علاوہ کچھ نہیں ملتا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تاریخ اور "جوانانِ ترک" کی کہانی اس وقت تک مکمل اور قابلِ فہم نہ ہوگی جب تک کہ ان تعلقات کا جائزہ نہ لیا جائے۔

۱۶ویں صدی میں فرانس پہلا یورپی ملک تھا جس نے سلطنت عثمانیہ سے دوستانہ تعلقات قائم کیے اور مراعات خصوصی حاصل کیں۔ یہ تعلقات اتنے خوشگوار تھے کہ سلطان نے شاہ فرانس کو "بادشاہ"

---

[۱] آسٹریا، ہنگری مملکت کو قصداً چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ ۱۸ویں صدی میں یہ کمزور ہو چکی تھی اور سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں قابل اثر اندازی نہ رہی تھی۔

کے لقب سے نوازا جو کہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ سلطنت عثمانیہ اور آسٹرو۔ ہنگری کی باہمی کشمکش اور فرانس و اسپین کی رقابت اس دوستی کی بڑی محرک تھی۔ سلیمان قانونی کے جانشینوں نے ان خوشگوار تعلقات کو استوار کیا اور سلطنت میں فرانسیسی سفارت قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ فرانس میں رومن کیتھولک مذہب کا دور تھا اور شاہ فرانس تمام کیتھولکوں کی سرپرستی کا دعوی دار تھا لہذا فرانسیسی سفارت میں بشپ اور ایبٹ بھی شامل تھے۔ سلطان نے ان کو حدود سلطنت میں خانقاہیں قائم کرنے کی اجازت بھی دی اور تجارتی مراعات کے ساتھ ساتھ مذہبی امور میں بھی خصوصی سلوک روا رکھا۔ یہ امتیازی سلوک اتنا بڑھ گیا تھا کہ درسعادت کی اکثر خفیہ مشاورتوں میں فرانسیسی نمائندوں کو بھی شامل کیا جاتا تھا (اغلباً یہ مشاورتیں یورپی معاملات و حالات سے متعلق ہوتی ہوں گی)۔ سلطنت عثمانیہ کی اس خوش سگالی کے باوجود اولین دور سے ہی مذہب کی آڑ میں فرانسیسی اسقف اعظم نے سیاسی چالبازیوں، ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ مشنریوں کے روپ میں سینکڑوں سازشی سلطنت میں پھیل گئے اور عوام کو فتنہ و فساد کی ترغیب دلانے لگے۔ ۱۶ ویں صدی میں استنبول کے جوسٹ JESUIT راہبوں کی ایک شرانگیز سازش پکڑی گئی اور ان کو جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۷ ویں صدی میں درسعادت اور حکومت فرانس کے درمیان بحری قزاقوں کی کارروائیوں پر ناچاقی ہو گئی کیونکہ ان "فرینک" قزاقوں کو، جو بحیرہ روم میں لوٹ مار کرتے تھے، فرانسیسیوں کی سرپرستی حاصل تھی اور فرانس کے سفارتی گماشتے ان کو چھپانے اور قزاقی میں مدد کرتے تھے۔ الغرض یہ کہ ۱۷ ویں صدی کے اواخر میں مسیحی مبلغین کی حرکتوں اور بحری قزاقوں کی کارروائیوں نے ترکوں کو اہل فرانس سے بدظن کر دیا تھا اور تعلقات میں کسی حد تک کشیدگی آ گئی تھی۔

۱۸ ویں صدی کے اوائل میں لبنان، شام اور فلسطین کے علاقوں میں مبلغ کے روپ میں سیاسی کارروائیاں بہت بڑھ گئیں اور فرانسیسیوں نے مذہب کی آڑ میں اپنا سیاسی اثر و رسوخ بڑھانا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ فرانسیسیوں نے کمال ہوشیاری سے تجارت پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا اور فرانسیسی مال کثیر مقدار میں برآمد ہونے لگا۔ صرف ملک شام میں ۲۵ لاکھ پاؤنڈ سالانہ کی مالیت کا مال جس میں کپڑا، صابن، کافی اور شکر وغیرہ شامل تھی، برآمد ہوتا تھا۔

اس دور میں سلطنت عثمانیہ کی دوستی اور اس کی ہر ممکن مدد و اعانت اور سلطنت کے دشمنوں کی پرزور مخالفت، فرانس کی سیاست کا بنیادی اصول تھا۔ اس حکمت عملی کی وجہ سے فرانس کو سلطنت میں تجارتی اجارہ داری حاصل ہو گئی تھی۔ اور عوام الناس میں مقبولیت بڑھ گئی دراصل فرانس کی نظریں مشرق وسطیٰ پر لگی ہوئی تھیں اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ سلطنت پر روس یا آسٹریا کا دباؤ اور اقتدار قائم ہو جائے اور یہ دو حکومتیں سلطنت عثمانیہ کو آپس میں تقسیم کر لیں چنانچہ اس کی کوشش یہ تھی کہ ان دو یورپی طاقتوں کے عزائم کو محدود کیا جائے۔ اسی حکمت عملی کے تحت ۱۷۳۹ء میں فرانس نے روس، آسٹریا اور ترکی کی جنگ کو ختم اور صلح کروانے میں ممتاز کردار ادا کیا۔ اسی صدی میں فرانسیسیوں نے افواج عثمانیہ کی تنظیم نو میں حصہ لینا شروع کیا۔ ایک فرانسیسی سفارتی نمائندہ ایم۔ ڈی۔ ٹوٹ M DE TOTT نے جس نے قبول اسلام کر لیا تھا، سلطنت میں ملازمت قبول کی اور فوجی انجینئروں کا اسکول قائم کیا۔ اس کے علاوہ اس افسر نے درہ دانیال کے شکستہ قلعوں کی نئی تعمیر اور وہاں کے دفاعی انتظامات کی از سر نو تنظیم کی۔

سلطنت عثمانیہ اور فرانس کی یہ دو سو سالہ دوستی بین الاقوامی تعلقات میں ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ اس خوش سگالی اور دوستی میں پہلا بال اس وقت پڑا جب ۱۷۹۸ء میں نپولین نے مصر پر حملہ کیا ۱۸۰۲ء میں انخلا مصر کے بعد فرانسیسیوں نے پھر دوستی اور اتحاد کے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے ۱۸۰۵ء میں نپولین کے سفیر جنرل سباشیانی GENERAL SEBASTIANI نے فرانسیسی افسروں اور توپچیوں کی مدد سے روسیوں کے خلاف استنبول کے دفاع کی تنظیم کی۔ مگر نپولین نے ایک بار پھر مسلم دشمنی کا مظاہرہ کیا اور ۱۸۰۷ء کے عہد نامہ ٹلسٹ TILSIT کے نتیجے میں نپولین نے زار کو یورپی علاقوں کو سلطان کی حکمرانی سے آزاد کرانے میں امداد کا یقین دلایا۔

بقول زار روس نپولین نے کہا " یورپ میں ترکوں کی موجودگی کو قبول کرنا اب برداشت سے باہر ہے۔ آپ کو اس بات کی اجازت ہے کہ ان کو ایشیا میں دھکیل دیں لیکن یہ خیال رہے کہ استنبول پر کسی دوسری یورپی طاقت کا قبضہ نہ ہونے پائے[1]۔ نپولین کے اس رویئے کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت عثمانیہ اور فرانس کی وہ دیرینہ دوستی جس کی بنا ۱۵۳۶ء میں پڑی تھی ختم ہو گئی۔ اور ترکی کو مجبوراً زار سے

[1] PRINCE HARDENBERG'S MEMOIRS صفحہ ۳۳۲

صلح کرنی پڑی اور سلطنت کی نظروں میں فرانس بھی اُس گروہ میں شامل ہو گیا جو للچائی نظروں سے اس کو دیکھ رہے تھے. فرانس کو مصر و شام کے علاقوں سے دلچسپی تھی اور وہاں سلطنت کے وقار کو زک پہنچانے اور اپنا اقتدار بڑھانے کے لیے یروشلم میں راہبوں کو سازشیں پھیلانے کے لیے استعمال کیا گیا. سنہ ۱۷۲۰ء کے لگ بھگ فرانس کی وزارت خارجہ نے مصر پر قبضہ کرنے کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا جس پر حکومت نے سنجیدگی سے غور کیا مگر یورپ کی اندرونی سیاست اور باہمی رقابتوں کی وجہ سے اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ ۱۸۳۰ — ۱۸۲۷ء کے درمیان یونان کے مسئلہ آزادی کے سلسلے میں فرانس نے جو کردار ادا کیا اُس نے ترکوں کو مزید بدظن کر دیا اور تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے اس کے فوراً ہی بعد حکومت فرانس نے مصر کے محمد علی پاشا کی حمایت کی اور ان کو ورغلانے میں نمایاں حصہ لیا اور بالآخر الجیریا پر اپنی حاکمیت بھی قائم کر لی گویا اب فرانسیسیوں نے علی الاعلان اپنے اغراض و مقاصد کا اظہار کر دیا اور صدیوں پرانی دوستی کو بھلا بیٹھے۔ بدخلوصی اور بدنیتی کی اس سے بدتر مثال ملنی مشکل ہے. انقلاب فرانس کے بعد سے مذہب کو سرکاری سرپرستی حاصل نہ رہی تھی مگر جہاں تک سلطنت عثمانیہ کا تعلق تھا حکومت فرانس بلاتفریق ملت رومن کیتھولک فرقے کے حق سرپرستی پر اصرار کرتی رہی اور ۱۸۶۰ء میں اس سرپرستی و تحفظ کے بہانے لبنان کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔

۱۸۷۰ء میں فرانس کو جرمنی کے ہاتھوں سخت شکست اٹھانی پڑی، نتیجۃً حکومت فرانس نے روس سے پینگیں بڑھانی شروع کر دیں۔ اور ۱۸۷۷ء کی ترکی۔روس جنگ میں درسعادت میں متعین فرانسیسی نمائندہ نے روسی سفیر کو اہم اطلاعات بہم پہنچائیں۔ یہی نہیں بلکہ حکومت کے مخالف ترک عناصر کی حوصلہ افزائی کی گئی اور "جدید عثمانیوں" کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ انقلابی خیالات رکھنے والے نوجوانوں کو پیرس میں خوش آمدید کہا گیا اور بیشتر سہولتیں فراہم کی گئیں۔ شہزادہ مصطفیٰ فاضل پاشا کو ان سازشوں میں آلۂ کار بنایا گیا اور ان کے ذریعے سلطنت میں انتشار پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ اغلباً ان انقلابی نوجوانوں کو مالی اعانت بھی دی گئی تاکہ وہ اخبارات اور رسائل نکال سکیں۔ مصطفیٰ فاضل پاشا کے اعلیٰ فرانسیسی حکام اور ممتاز سیاست دانوں سے گہرے تعلقات تھے اور انھوں نے اپنے اکثر رفقا کو فرانس کی وزارت خارجہ کے اعلیٰ حکام سے متعارف بھی کرایا۔

۱۸۸۱ء میں حکومت فرانس نے عہد نامہ پیرس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، جس میں سلطنت کی سالمیت کی ضمانت دی گئی تھی، تیونس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹ویں نصف صدی کے اس دور میں فرانس اور برطانیہ کی رقابت عروج پر تھی اور فرانس نے روس کی اعانت سے مشرقی بحیرہ روم میں اپنا سیاسی اور تجارتی اثر و رسوخ پھیلانا شروع کر دیا۔ اس اعانت کے بدلے فرانس نے روس کی ہر ممکن طریقے سے مدد کی۔

فرانس، روس اور برطانیہ میں باہمی رقابت اور چشمک پہلی جنگ عظیم تک جاری رہی اور ۱۹ویں صدی کے آخر میں ہر طاقت کی کوشش یہ تھی کہ وہ سلطنت میں انتشار کو ہوا دے اور اس کی کمزوری اور اختلاط سے فائدہ اٹھا کے اپنی سیاسی، علاقائی اور تجارتی حرص و ہوس کو پورا کر سکے۔ یہ سازشیں اور ریشہ دوانیاں بالآخر پہلی جنگ عظیم کے بعد ختم ہوئیں۔ فرانسیسیوں نے اپنے دیرینہ تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی خیالات و نظریات کو پھیلایا اور انقلابی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی۔ انقلابی مواد فرانسیسی صحافیوں، گماشتوں اور ڈاک خانوں کے ذریعے سلطنت میں پھیلایا گیا اور سلطان عبدالحمید کے عہد حکومت میں پیرس "جوانان ترک" کا مرکز بن گیا۔

۳ مئی ۱۵۸۳ء کو سلطان نے پہلے انگریز سفیر کو شرف باریابی بخشا اور ان سفارتی تعلقات کی بنا پر برطانیہ کی "لیونٹ کمپنی" (LEVANT COMPANY) کو تجارتی مراعات دی گئیں۔ اس صدی تک سلطنت میں جزائر برطانیہ کے متعلق عوام کی معلومات بہت ہی محدود تھیں اور عام طور پر برطانیہ کو سلطنت فرانس کا ایک صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ مشرق کی تاریخ میں فرانس اور برطانیہ کی باہمی رقابت کی داستان ایک طویل باب ہے۔ سلطنت عثمانیہ سے انگریزوں کے تعلقات کی ابتدا اسی رقابت کا نتیجہ تھی۔

۱۵۵۷ء میں ملکہ ایلزبتھ نے اسپین کے خلاف خوشامد، چاپلوسی اور بخشش[1] کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کی حمایت حاصل کرنے کی بے سود کوشش کی۔ اسپین کی اسلام دشمنی اور سمندروں پر بحری اقتدار کے حصول کی وجہ سے سلطنت اور اسپین کے تعلقات عرصے سے کشیدہ تھے چنانچہ انگریزوں نے

[1] سلطان، وزرا، امرا اور عمال کو نذرانہ پیش کرنے کو بخشش کہا جاتا تھا۔ اس کا مقصد قیمتی تحائف سے کر خوشنودی حاصل کرنا تھا۔

عناد کی اس آگ کو مزید بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انگریزوں نے سلطنت کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں بھی پھیلائیں۔ سلطنت اور ایران کے درمیان شیعہ، سنی عقائد کی مخاصمت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ ایران کی حمایت و حوصلہ افزائی کی۔ ۱۶۰۰ء میں ایک انگریز سر انتھونی شرلے (SIR ANTHONY SHIRLY) نے یورپی ممالک کا دورہ کر کے سلطنت عثمانیہ کے خلاف محاذ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس منصوبے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ سلطنت عثمانیہ اپنے پورے عروج پر تھی اور کوئی بھی یورپی طاقت اس کی دشمنی مول لینے کو تیار نہ تھی۔ یہ امر قابل غور ہے کہ انگریزوں نے ابتدا ہی سے سلطنت کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں۔ فرانسیسیوں کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لیے انگریزوں نے چاپلوسی، بخشش اور دوسرے ہر ممکن ذرائع استعمال کیے لیکن ان کوششوں کے باوجود اٹھارویں صدی تک انگریزوں کو اہمیت نہ حاصل ہو سکی اور وہ سلطنت کے معاملات میں موثر مداخلت نہ کر سکے۔

اٹھارویں صدی میں انگریزوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ سلطنت اور روس کے درمیان توازن کو برقرار رکھا جائے اور روس کو کھلے سمندروں میں پہنچنے کا موقع نہ دیا جائے۔ برصغیر ہند و پاک پر تسلط قائم ہو جانے کے بعد حکومت برطانیہ نے بحیرہ روم کے ان عثمانی صوبہ جات کو جو ان کی مشرقی سلطنت کی حفاظت کے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے، للچائی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ۱۷۹۰ء میں وزیر اعظم پٹ نے روسیوں کے خلاف ترکوں کی حمایت کی تاکہ روسی اقتدار انگریزوں کے لیے خطرے کا سبب نہ بن جائے۔ ۱۸۰۱ء میں انگریزی بحری بیڑے اور فوج کی مدد سے سلطان نے مصر اور شام پر دوبارہ قبضہ کیا تو سلطنت میں برطانیہ کی طرف سے خوش سگالی اور دوستی کے جذبات بہت بڑھ گئے۔ اس کے برعکس نپولین کی مہم مصر کی وجہ سے فرانسیسی غیر مقبول ہو رہے تھے لیکن یونان کی جنگ آزادی میں حکومت برطانیہ نے یونانیوں کی مدد اور حمایت کی جس کی وجہ سے ان تعلقات میں تلخی اور بدمزگی پیدا ہو گئی اور سلطنت عثمانیہ کو انگریزوں کی نیت اور خلوص پر شبہ ہونے لگا۔

انیسویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کی دوستی، خوش سگالی اور اس کی علاقائی سالمیت کی برقراری انگریزی حکمت عملی کا ضروری جزبن گئی۔ مشرقی بحیرہ روم، خلیج فارس اور برصغیر ہند و پاکستان میں انگریزی مفادات کے تحفظ کے لیے روسی عزائم کا سدباب کرنا لازمی امر تھا۔ حکومت برطانیہ کو قطعاً

منظور نہیں تھا کہ سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کے روس اپنی سلطنت کو مشرق میں پھیلائے اور انگریزی اقتدار واثر ورسوخ کو خدشے میں ڈالے۔ ١٨٢٧ء میں جب انگریزی بیڑے نے یونانیوں کی حمایت میں، جنگ نوارینو میں عثمانی بیڑے کو شکست دی تھی، اب ١٨٤٩ء میں یہی بیڑہ روس کے خلاف سلطان کی اعانت کے لیے درۂ دانیال پہنچ گیا۔ انگریزوں کی سیاسی چالبازیوں اور مفاد پرستی کی یہ ایک واضح مثال ہے۔ اس دور میں برطانوی سفیر اسٹریٹفورڈ کینگ (STARTFOR CANNING) کا سلطان عبد المجید اور صدر اعظم رشید پاشا پر بڑا اثر ورسوخ تھا۔ یہ مراسم اس قدر گہرے تھے کہ سلطان عبد المجید کینگ کو "بڑا ایلچی" کہا کرتے تھے۔ جنگ کریمیا میں برطانوی مداخلت انگریزی سفیر کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ کینگ کی تمام تر کوششوں کا مقصد یہ تھا کہ روس کی پھیلتی ہوئی طاقت کا سد باب کیا جائے اور سلطنت پر ان کا اثر ورسوخ اور اقتدار قائم نہ ہونے پائے۔ بعد ازاں سلطان عبد العزیز کے دور حکومت میں مدحت پاشا پر انگریزی سفیر سر ہنری ایلیٹ کا بڑا اثر رہا چونکہ سلطنت کا نظام حکومت شخصی تھا لہٰذا یورپی سفیروں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ سلطان یا صدر اعظم سے گہرے مراسم اور تعلقات رکھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دار الحکومت میں طرح طرح کی چالبازیوں اور سازشوں سے کام لیا جاتا تھا۔ سلطان عبد العزیز کے دور میں روسی سفیر اگنے ٹیف اور سر ہنری ایلیٹ کی باہمی رقابت اور چشمک کی وجہ سے جو سازشیں اور ریشہ دوانیاں ہوئیں انھوں نے سلطنت کے سیاسی اور انتظامی معاملات کو اور بھی ابتر بنا دیا۔ تین سال میں چھ صدر اعظم نامزد اور معطل ہوئے[۱]

١٨٥٦ء میں برطانوی وزیر اعظم گلیڈسٹون (GLADSTONE) نے ترکوں کی دوستی اور اعانت کا اعلان کیا اور سلطنت عثمانیہ کی علاقائی سالمیت کے تحفظ کا علی الاعلان یقین دلایا مگر ١٨٧٨ء کی ترکی۔ روس جنگ میں ان کا موقف بدل گیا۔ اور حزب اختلاف کی طرف سے انھوں نے ترکوں کی حمایت کی پرزور مخالفت کی۔ اس ریاکاری اور دوغلی حکمت عملی کی مثال صرف انگریزی سیاست میں ہی مل سکتی ہے۔ اجتماع برلن میں معاہدہ سان اسٹیفانو کو ختم کر دیا گیا اور حکومت برطانیہ نے حیل اور مکر سے ترکوں سے قبرص کا جزیرہ حاصل کر لیا۔ اس حیلہ سازی نے بالآخر انگریزوں کا بھرم کھول دیا اور یہ بات

---

[۱] ملاحظہ ہو صفحہ ٣٦ حاشیہ ٢

عیاں ہو گئی کہ وہ بھی عثمانی مقبوضہ جات پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔ مصر پہ برطانوی حاکمیت قائم ہو جانے سے حکومت فرانس غیر مطمئن تھی لہٰذا وزیر اعظم برطانیہ لارڈ سالسبری نے فرانسیسیوں کو تیونس پر قبضہ کر لینے کی منظوری دے دی حالانکہ اجتماع برلن کی رو سے تیونس کو سلطنت عثمانیہ کا جزو قرار دیا جا چکا تھا۔ جب سلطان عبد الحمید نے انگریزی سفیر کو طلب کر کے مسئلہ تیونس پر برطانوی رویہ کی وضاحت طلب کی تو سفیر نے جواب دیا کہ وہ اپنی حکومت کی حکمت عملی اور نظریے سے ناواقف اور بے خبر تھا۔

۱۸۸۱ء میں سلطنت اور یونان کے درمیان تھسلی (THESSALY) اور ایپورس EPIRUS کے متعلق قضیہ میں بھی حکومت برطانیہ نے اسی قسم کی ریاکاری کا اظہار کیا' اور انگریزی سفیر گوسچن GOSCHEN نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ ان صوبوں کو یونان کے حوالے کر دیں۔ الغرض یہ کہ انگریزوں کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں رہ گیا تھا۔ نہ صرف وہ سلطنت عثمانیہ کے صوبوں کو ہڑپ کر لینا چاہتے تھے بلکہ وہ مسلمانوں کی اس عظیم سلطنت کو ختم کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ پس پردہ اسلام دشمنی کار فرما تھی۔ ۱۸۸۵ء میں جب بلغاریہ نے علم بغاوت بلند کیا تو حکومت برطانیہ نے معاہدہ برلن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کی مدد کی اور اس طرح سلطنت کے اندرونی مسئلے میں مداخلت بیجا کے مرتکب ہوئے' دراصل انگریز اس ہمدردانہ مداخلت کی آڑ میں بلغاریہ میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ روس کے خلاف حصار قائم کیا جا سکے۔ انیسویں صدی کے اس آخری دور میں روس اور برطانیہ کی رقابت عروج پر تھی اور برطانوی حکمت عملی کا بنیادی اصول روسی اقتدار کو زک پہنچانا تھا۔ ۹۶-۱۸۹۴ء میں حکومت برطانیہ نے یورپی طاقتوں کو مسئلہ آرمینیا میں مداخلت نہیں کرنے دی کیونکہ اس کو خدشہ تھا کہ روس اس مسئلہ کی آڑ میں ایشیائے کوچک میں اپنا اقتدار اور اثر پھیلائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انگریز ہر ممکن ذرائع سے اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے۔ ۱۸۹۹ء میں حکومت برطانیہ کی حوصلہ افزائی اور ایما پر کویت نے سلطان کی اطاعت سے انکار کر کے برطانوی سرپرستی قبول کر لی۔

سلطان عبد الحمید یورپی سیاست کی پیچیدگیوں اور گہرائیوں کو بخوبی سمجھتے تھے اور انگریزوں کے عزائم سے کماحقہ واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے برطانیہ اور روس کی باہمی رقابت سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور ان کی یہ حکمت عملی بڑی کامیاب بھی رہی لیکن ۱۹۰۲ء میں لارڈ سالسبری کی وزارت کے خاتمے کے بعد حکومت برطانیہ کی حکمت عملی میں زبردست تبدیلی آگئی' اور روس اور فرانس

کی مخالفت ترک کردی گئی۔ جرمنی کی بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی نے انگریزوں کو خائف کردیا۔ اور اب جرمنی کو زک دینے کے لیے زار کی دوستی لازمی ہوگئی۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں اینگلو، فرینچ اور ۱۹۰۷ء میں اینگلو۔ روسی اتحاد قائم ہوا۔ روس کی دوستی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کو سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں مکمل آزادی دے دی گئی اور جلد ہی "جوانان ترک" کو جو سلطنت کی اصلاح میں مصروف تھے، انگریزوں کی اس عیارانہ، خود غرض اور حیرت انگیز حکمت کا تلخ تجربہ اٹھانا پڑا۔

ترکوں اور روسیوں کی باہمی دشمنی صدیوں پرانی ہے جس کی تہہ میں نسلی تعصب اور علاقائی رقابت کا بڑا ہاتھ ہے۔ پندرھویں صدی تک ترک روس کے وسیع خطوں پر حکمرانی کرتے آئے تھے اور سلافی قوم سے کہیں زیادہ مہذب و متمدن تھے۔ سلطنت عثمانیہ اور روس کی تاریخ اسی طویل رقابت اور دشمنی کی داستان ہے۔ اس جذباتی تصادم کے علاوہ سلطنت روس بحیرۂ اسود کے ذریعہ درہ دانیال سے گزر کے بحیرۂ روم پر اقتدار کے لیے کوشاں تھی۔ اس منصوبے میں سلطنت عثمانیہ ایک بڑی اور مضبوط رکاوٹ تھی۔ جب سلطنت کی فوجی قوت میں انحطاط آیا تو روس کو اپنے دیرینہ منصوبوں کی بارآوری کی امید نظر آنے لگی اور اس نے ہر ممکن طریقہ سے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ جنگوں، سازشوں اور سیاسی گٹھ جوڑ کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کو ختم کرنے کی ہر کوشش کی جانے لگی۔

روسیوں نے سلطنت کی ان تمام ولایتوں میں جہاں عیسائی آباد تھے خفیہ سازشوں کے ذریعے سلطان کے اقتدار و انصرام کو زک پہنچانے کے منصوبے بنائے۔ عیسائی باشندوں کو بغاوت پر اکسایا اور سفارتی نمائندوں نے خفیہ انجمنیں اور جماعتیں قائم کیں جن کا مقصد انتشار اور بدعنوانی پھیلانا تھا۔ حکومت روس نے سلطنت کے اصلاحی کاموں اور کارروائیوں میں رخنہ ڈالنے کی ہر کوشش کی۔ حکومت روس کو خدشہ تھا کہ اگر اصلاحات قبول اور کامیاب ہوگئیں تو غیر مسلم رعایا مطمئن ہو جائے گی۔ اور سلطنت میں انتشار پسند عناصر کا کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ عہدنامہ کوچک کینرجی کی رو سے روسیوں نے استنبول میں ایک چرچ قائم کرنے اور عیسائیوں کے تحفظ کا حق حاصل کرلیا۔ بظاہر یہ ایک عام اور معمولی رعایت تھی مگر اس کے نتائج بہت ہی سنگین اور دور رس ثابت ہوئے ان حقوق کی آڑ میں حکومت روس نے سلطنت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنی شروع کردی اور سازشوں کا ایک ایسا تانا بانا بنا جس نے بالآخر سلطنت کے یورپی علاقوں میں بغاوت کے شعلے

بھڑکا دیے۔

۱۸۵۳ء میں زار روس نے علی الاعلان سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی تجویز پیش کی مگر برطانیہ نے اس کی مخالفت کی اور اس کا نتیجہ جنگ کریمیا کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ایک دفعہ پھر روس کے منصوبے پورے نہ ہوسکے۔ اب حکومت روس نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف عالمی رائے عامہ کو بھڑکانے کی مہم شروع کی اور مذہب کے نام پر سلطان اور حکومت کے خلاف جھوٹا اور زہریلا پروپگنڈا شروع کیا گیا۔ متعدد یورپی اخبارات کو رشوت دے کر اس کام کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس پروپگنڈے کا مقصد یہ تھا کہ مسیحیت اور سلافی قومیت کے نام پر سلطان کی غیر مسلم رعایا کو بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔ یہ ان کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۷۵ء میں بوسنیا BOSNIA ہرزگوینا HERZEGOVINA سرویا SERVIA مونٹینگرو MONTENEGRO اور بلغاریہ نے بغاوت کر دی۔ ان سازشوں اور بغاوتوں میں روسی سفیر اگنے ٹیف نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اگنے ٹیف کی شروع ہی سے یہ کوشش تھی کہ سلطنت میں کسی قسم کی اصلاحات یا کسی ایسی حکمت عملی کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے جس سے سلطنت میں اطمینان، خوشحالی اور استحکام کا دور دورہ ہو۔ بدقسمتی سے سلطان عبدالعزیز اور صدر اعظم ندیم پاشا پر اگنے ٹیف کا گہرا اثر تھا اور یہ دونوں اس کو سلطنت کا بے غرض اور خیر خواہ دوست سمجھتے تھے اس دور میں سلطنت عثمانیہ پر روسی اقتدار اپنے عروج پر تھا۔ اگنے ٹیف نے سلطان اور صدر اعظم کو یہ سبق پڑھایا کہ اتحاد سلافی، اتحاد اسلامی کا فطری حلیف ہے۔

سلطان عبدالعزیز کو روسی سفیر پر اس حد تک اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ اگنے ٹیف کو اپنا سب سے سچا اور صادق دوست کہتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں یہ بیرونی سازشوں کا بدترین دور تھا۔ روسی سفیر کے روز افزوں اثرات نے برطانیہ اور فرانس کو خائف کر دیا اور ان دو طاقتوں نے روس کے اثر کو ختم کرنے کے لیے سازشیں اور ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ سلطنت میں انحطاط آچکا تھا اور اخلاقی اقدار دم توڑ رہی تھیں۔ سلطنت کے حکام اور معزز شخصیتوں کو رشوت اور بخشش کے ذریعے خرید لینا عام بات تھی۔ اس صورت حال نے ایک پراگندہ ماحول پیدا کر دیا۔ انگریزوں کی سرپرستی میں مدحت پاشا کے تحت وہ سازش برپا ہوئی

جس میں سلطان عبدالعزیز کو معزول کیا گیا۔

اگنے ٹیف نے بلقان کی بغاوتوں میں ترکوں کی کارروائیوں کو انتہائی بھیانک انداز میں تشہیر کیا اور عیسائی باغیوں کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ یورپ کی جاہل اور زود فہم رائے عامہ پر اس پروپگنڈے کا بڑا اثر ہوا اور امریکہ تک میں ترکوں کے خلاف غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ۱۸۷۷ء میں روس نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ اس کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان عبدالحمید نے پارلیمنٹ کو معطل کر دیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں 'معاہدہ سان اسٹیفانو' اور بعد ازاں صلح نامہ برلن کے باوجود سلطنت عثمانیہ کے تمام تر یورپی مقبوضہ جات سلطان کے اقتدار سے نکل گئے اور روس کے عزائم جزوی طور پر کامیاب ہو گئے۔

حکومت روس ابھی بھی مطمئن نہیں تھی کیونکہ اس کا اصل مقصد یعنی بحیرۂ اسود اور درۂ دانیال پر قبضہ، پورا نہ ہو سکا چنانچہ اب مقدونیہ میں بے چینی اور بغاوت پھیلانے کی سازشیں شروع ہوئیں اور مقدونیہ کی انقلابی اور دہشت پسند تنظیموں کی ہر ممکن ذرائع سے حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ اپنی کارروائیاں تیز تر کر دیں۔ ان انقلابی گروہوں نے تشدد اور دھمکیوں کے ذریعے جا بجا صلح پسند کسانوں کو بغاوت پر مجبور کرنا شروع کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سالونیکا میں بلغاری دہشت پسندوں نے متعدد مواقع پر بم پھینکے۔ روس نے ان جرائم اور دہشت پسند کارروائیوں کی قطعاً کوئی مذمت نہیں کی بلکہ دہشت پسندوں کی سرپرستی کرتے ہوئے ان کو سفارت خانے میں پناہ دی۔ ان لاقانون دہشت پسندوں کے خلاف تادیبی کارروائیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور یورپ اور امریکہ کی رائے عامہ کو سلطنت کے خلاف اکسایا گیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی دور اور بالکل اسی زمانے میں خود روس میں روزانہ سینکڑوں افراد بلا تحقیق و تفتیش اور بغیر عدالتی کارروائی کے سائبیریا جلاوطن کیے جا رہے تھے یا پھانسیوں پر چڑھائے جا رہے تھے۔ ان بے گناہوں کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ زار کی آمریت سے آزادی چاہتے تھے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اگر مقدونیہ کے ترکی حکام کسی غیر مسلم کو، جو دہشت گردی یا بغاوت کا مجرم ہوتا، جلاوطن بھی کرتے تو روسی سفیر اور حکومت روس احتجاج اور ہنگامہ بپا کر دیتے۔

اٹھارویں صدی کے اوائل سے انیسویں صدی کے آخر تک ترکی اور روس کے

درمیان آٹھ جنگیں ہوئیں[1]۔ ان جنگوں میں سلطنت عثمانیہ کو بھاری جانی و مالی نقصانات اٹھانے پڑے جن کی وجہ سے سلطنت کی زبوں حالی میں مزید اضافہ ہوا۔ روس کی جارحانہ حکمت عملی سے سلطنت کو یقینی نقصان پہنچا لیکن سلطان عبدالحمید کی مدبرانہ پالیسی کی وجہ سے بحیرۂ روم پر روسی اقتدار کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ بلاشبہ روس کی ترک دشمنی نے سلطنت کو آرام وچین نہ لینے دیا اور اس کی اقتصادی حالت بالکل تباہ ہوگئی۔

یورپی طاقتوں میں صرف جرمنی ہی کو سلطنت عثمانیہ کا دوست کہا جاسکتا ہے۔ کم از کم جرمنی نے سلطنت کی علاقائی سالمیت پر حرص وہوس کی نگاہ نہیں ڈالی۔ ۴۲-۱۷۴۱ء میں فریڈرک نے آسٹریا کو شکست دی اور اپنی اس فتح کو پائیدار بنانے اور آسٹریا کے خلاف توازن قائم رکھنے کے لیے سلطنت عثمانیہ سے دوستی کا منصوبہ بنایا۔ ۱۷۴۴ء میں پہلا جرمن نمائندہ دوستی اور خوش سگالی کا معاہدہ کرنے استنبول پہنچا۔ اس سے قبل ترکوں نے جرمنی کے معاملات میں کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اکثریت جرمنی کے نام سے بھی واقف نہ تھی۔ ۱۷۶۴ء میں پہلا جرمن سفیر درسعادت میں مقرر ہوا۔

فریڈرک کی حکمت عملی یہ تھی کہ روس اور آسٹریا کی طاقت کو پھیلنے سے روکا جائے اور توازن اقتدار قائم رکھنے کے لیے سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کو برقرار رکھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مشرق میں امن وامان کا قیام لازمی امر تھا۔ اس حکمت عملی کے تحت ۱۷۶۸ء میں فریڈرک نے ترکی اور روس کی جنگ کو روکنے کی بے سود کوششیں کیں۔ بالآخر ۱۷۷۰ء ترکوں نے فریڈرک سے ثالثی کی درخواست کی اور فریڈرک نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کی ہر ممکن طریق سے مدد و اعانت کی بلکہ کوشش کی کہ صلح کی شرائط سہل اور معقول ہوں۔ پندرہ سال بعد ۱۷۸۹ء میں جرمنی نے دوبارہ سلطنت کی اعانت کی اور ترکوں نے جرمنوں کی اس مدد اور خلوص کو بہت سراہا لیکن بدقسمتی سے کچھ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ یہ نوزائیدہ دوستانہ تعلقات آئندہ سو سالوں تک مزید پروان نہ چڑھ سکے۔ نپولین کے عروج نے جرمنی کو کمزور بنادیا اور اس کی مغربی سرحدوں پر فرانس کی دشمنی اور خطرے نے جرمنی کو روس کی طرف مائل ہونے پر مجبور کردیا۔

بسمارک کو سلطنت سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی اور وہ روسیوں کی دوستی اور خوشنودی

---

[1] ۱۱-۱۷۰۹ء، ۳۹-۱۷۳۶ء، ۷۴-۱۷۶۸ء، ۹۲-۱۷۸۸ء، ۱۲-۱۸۰۶ء، ۲۹-۱۸۲۸ء، ۵۶-۱۸۵۳ء، ۷۸-۱۸۷۷ء

حاصل کرنے کے لیے ترکوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار تھا۔ اس دور میں جرمنوں نے ہر سیاسی کانفرنس میں روسیوں کی حمایت کی اور جرمن نمائندے روسی اشاروں پہ ناچتے تھے۔ جب مدحت پاشا کے آئین کے مطابق پارلیمنٹ قائم ہوئی اور افتتاحی اجلاس میں تمام سفیروں کو مدعو کیا گیا تو جرمن سفیر نے روسی سفیر کی نقل میں اس "مضحکہ خیز تماشہ" میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ مختصر یہ کہ روس کی دوستی حاصل کرنے کے لیے بسمارک نے سلطنت عثمانیہ سے دشمنی کی پالیسی اختیار کی۔

۱۸۷۹ء میں روس کی جارحانہ پالیسی سے خائف ہو کر بسمارک نے روس کے خلاف آسٹریا سے معاہدہ کیا۔ اس معاہدے سے سلطان کو بہت خوشی ہوئی کیوں کہ اس طرح روسی عزائم کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم ہو گیا لیکن اس کے باوجود سلطنت کی طرف بسمارک کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور ۱۸۸۰ء میں بسمارک نے ترکی کے خلاف یونان کو مدد و اعانت کی پیشکش کی بسمارک کی پالیسی سلطنت عثمانیہ کے تحفظ و بقاء سے متعلق نہ تھی اور بلاشبہ وہ ترک دشمن تھا۔[1] بسمارک روس سے از حد خائف تھا اور اس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ روس سے تعلقات استوار رکھے جائیں مگر جب روس نے فرانس سے دوستی بڑھانی شروع کی تو جرمنی کو مجبوراً سلطنت عثمانیہ سے خوش سگالی اور دوستی کے تعلقات قائم کرنے پڑے۔ جرمنی کو فریڈرک کی پرانی حکمت عملی اختیار کرنی پڑی اور سلطنت سے دیرپا دوستی کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔

۱۸۸۲ء میں ایک ذہین اور مشہور فوجی مارشل گولٹز (GOLTZ) کے تحت ایک جرمن فوجی مشن ترکی بھیجا گیا تاکہ افواج عثمانیہ کی تنظیم و تربیت اور سلطنت کے دفاعی انتظامات کو درست بنایا جائے اس کے ساتھ ہی ساتھ سلطنت کے ایشیائی صوبوں میں ایک ریلوے لائن بچھانے کا جامع منصوبہ بھی برلن میں تیار کر کے سلطان کو پیش کیا گیا جو بہت مقبول ہوا۔ اس منصوبے یعنی حجاز ریلوے پر عمل درآمد ہونے سے برلن سے مکہ تک ریلوے کا سلسلہ قائم ہو جاتا۔ اس ریلوے لائن کے قیام سے نہ صرف تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کو سہولت و ترقی ہوتی بلکہ فوجوں کی نقل و حرکت بھی تیز اور آسان ہو جاتی۔ سلطان عبدالحمید نے اس منصوبے

---

[1] اسلام دشمن بھی کہا جا سکتا ہے۔

میں ذاتی دلچسپی لی اور خزانہ خاص سے بھاری رقم صرف کی۔[۵۰] برطانیہ، فرانس اور روس کو اس منصوبے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی۔ استنبول اور بحیرۂ روم کے علاقوں کے درمیان سفر اور فوجی آمد و رفت کی سہولت سے سب سے زیادہ خدشہ برطانیہ کو پیدا ہوا۔ فوجی مشن کی موجودگی اور اس منصوبے کی مقبولیت اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ سلطنت میں جرمنی کا اثر روز افزوں تھا اور اس امر نے برطانیہ اور جرمنی کی بڑھتی ہوئی رقابت کو مزید ہوا دی۔

۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۸ء میں قیصر ولیم سوم نے ترکی کے دورے کیے جن کا مقصد بڑھتی ہوئی دوستی کو مزید پختہ کرنا تھا۔ قیصر کے ان دوروں اور کوششوں کا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان نے جرمنی کو بہت سی تجارتی مراعات بخشیں۔ ۱۸۹۴ء میں آرمینیا کی شورش اور ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۷ء میں یونانی ابناوتوں میں جرمنی نے سلطنت کی مدد و حمایت کر کے اپنی دوستی اور خوش سگالی کا ثبوت دیا اور اس کے بدلے میں سلطان عبدالحمید نے مشرق کے کیتھولک عیسائیوں کے تحفظ کا حق جرمنی کو تفویض کر دیا۔ جرمنی کے لیے یہ ایک بہت بڑی سیاسی فتح تھی۔ جرمنی کے رویے کا ایک اہم اور دور رس نتیجہ یہ نکلا کہ عوام الناس میں جرمنی کی طرف دوستی اور خوش سگالی کے جذبات کی ایسی پائیدار بنا پڑی جو آج تک قائم ہے۔

یورپی طاقتوں میں صرف جرمنی ہی ایسا ملک تھا جس نے کسی مرحلے پر بھی اندرونی سازشوں میں حصہ نہیں لیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جرمنی کو سلطنت عثمانیہ کے مقبوضہ جات سے کسی قسم کی غرض نہیں تھی۔ جرمنی کی پالیسی یہ تھی کہ مشرق میں روس اور مغرب میں فرانس کے خطرے کو روکنے کے لیے سلطنت عثمانیہ کی مدد سے توانا اقتدار کو قائم رکھا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ "جوانان ترک" کے عہد میں سلطنت میں جرمنی کا اثر اور اقتدار عروج پر پہنچ گیا تھا مگر اس وقت تک ترکوں کو روس، فرانس اور برطانیہ کی مکاری، ریاکاری، فریب اور سازشوں کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ دراصل سلطان عبدالحمید نے اپنی بین الاقوامی پالیسی کی بنیاد ہی جرمنی سے دوستی پر رکھی تھی۔ اس پالیسی کی صحت و درستگی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

---

[۵۰] یہ ریلوے لائن ۱۹۰۰ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۰۸ء میں مدینہ پہنچ گئی۔

سلطان عبدالحمید

یورپی ممالک، جو تاریخ میں دولِ عظمیٰ کے نام سے مشہور ہیں، اور سلطنت عثمانیہ کے تعلقات کا طائرانہ جائزہ لینے کے بعد سلطنت کی اندرونی اور بین الاقوامی سیاست کا خاکہ واضح نظر آنے لگتا ہے اور سلطنت جن مصائب، خطرات اور مشکلات میں گھری ہوئی تھی ان کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

مغرب کی مادی اقدار نے ایک ایسی سامراجیت کو جنم دیا تھا جس سے کسی قسم کی ہمدردی یا نیک نیتی کی امید بے معنی تھی۔ انیسویں صدی میں جنگل کا قانون عروج پر تھا اور یورپی ممالک اپنے اغراض و مقاصد کی حصولیابی کے لیے ہر ہتھیار استعمال کرنے پر آمادہ تھے۔ تہذیب و تمدن اور اصول و اخلاق کی اقدار صرف فوجی اور معاشی قوت و صلاحیت پر منحصر تھیں۔ چنانچہ ایسے دور میں سلطنت کا معاشی اور عسکری انحطاط اس کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ معاشی بدحالی نے اندرون سلطنت انقلابی نظریات و رجحانات کو جنم دیا۔ جہالت، مفلسی بیماری اور بیروزگاری کسی بھی معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہیں اور ایسے حالات میں ایک محدود و مخصوص متوسط طبقے میں حب الوطنی کے جذبات ایک ردعمل پیدا کرتے ہیں۔[1] قیادت و سیادت پر منحصر و مبنی یہ ردعمل ایک انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو پرانی بنیادوں کو ہلا کر پھینک دیتا ہے۔ اس نئے گروہ میں، جو نئی اقدار کا علمبردار ہوتا ہے اور انحطاط پذیر قدامت پسند طبقے میں تصادم اور کشمکش ایک لازمی امر ہے۔ یہ جدید و قدیم کی ازلی جنگ ہے۔ اس خانہ جنگی سے ملک و ملت کی بنیادیں مزید خم کھاتی ہیں اور یہ وہ لمحہ ہوتا ہے، جب کہ بیرونی اور مفاد پرست قوتیں ملک و ملت کی سالمیت و یکجہتی کا شکار کھیلتی ہیں۔ اور

---

[1] معاشرے میں متوسط طبقے کے کردار کے ایک پہلو کا ذکر کیا گیا ہے اور اس پر مکمل سیر حاصل بحث سے گریز کیا گیا ہے

جب تک ایک فریق، اپنے نظریات و خیالات اور قیادت کی برتری کی بنا پر دوسرے پر غالب نہ آجائے یہ خدشہ مسلط رہتا ہے۔ یہی صورت حال سلطنت عثمانیہ میں پیدا ہو چکی تھی۔ نوجوان اور انقلابی طبقہ قدیم نظام کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا تھا اور برسوں کا کام دنوں میں انجام دینا چاہتا تھا۔ یہ انقلابی جن کی نگاہیں مغرب کی مادی تہذیب و عروج سے خیرہ تھیں، قدیم روایات واقدار کو سلطنت کی زبوں حالی کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جمہوریت اور آئین اس کمزوری، خامی اور انحطاط کا حل تھے۔ اس طبقے کے خلوص، نیک نیتی اور حب الوطنی پر شبہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ "جوانان ترک" ناتجربہ کار اور مغربی سیاست کے دام و فریب سے ناواقف تھے اور نہ ہی ان میں اتنی قوت و صلاحیت تھی کہ وہ قائم شدہ نظام کا تختہ الٹ سکتے۔ دوسری طرف قدما کا گروہ تھا جو ہر جدت اور ہر تبدیلی کا مخالف تھا، اور "جوانانِ ترک" کو ملک و ملت کا دشمن سمجھتا تھا۔ یہ قدما بدلتے ہوئے حالات کو تسلیم کرنے سے گریز کر رہے تھے اور معاشرے میں پھیلی ہوئی بے چینی اور ہیجان کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان میں اتنی قوت و ہمت اور جدت نہ تھی کہ سلطنت کے انحطاط و زوال کو روکنے کی سعی کرتے۔ الغرض یہ کہ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں سلطنت عثمانیہ مغربی طاقتوں کے رحم و کرم پر تھی اور محض ان سامراجی طاقتوں کی باہمی رقابت اور کشمکش نے سلطنت کو محفوظ رکھا۔ تاریخ عثمانیہ کے اس نازک مرحلے پر حالات و واقعات نے ایک نئے کردار کو منظر عام پر لا کھڑا کیا جس نے تاریخ انقلاب میں ایک نئے اور اہم باب کا اضافہ کیا۔

سلطنت عثمانیہ کی تاریخ انقلاب میں سلطان عبدالحمید خان ثانی کو ممتاز اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے ایسے پر آشوب دور میں عنان حکومت سنبھالی جب کہ سلطنت کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور یورپی طاقتیں سلطنت عثمانیہ کو نرغے میں لے چکی تھیں۔ ان کو ورثے میں ایک کمزور، ناقص اور انحطاط پذیر سلطنت ملی جس میں ہر سمت سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ اس ضمن میں سلطان عبدالحمید کو اورنگ زیب سے مطابقت دی جاسکتی ہے۔ ان کو بھی ان غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا جن کی ابتدا سلیمان قانونی کے عہد میں ہو چکی تھی۔ سلطان عبدالحمید کو نہ صرف سلطنت عثمانیہ اور ترک قوم کی سالمیت و بقا کی حفاظت کا بار اٹھانا پڑا بلکہ اسلام کے خلاف مسیحی یورپ کی یلغار کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ سلطنت عثمانیہ اسلام کا آخری حصار تھی اور یورپ کے صلیبی نئے روپ میں نمودار

ہو کر عالم اسلامی کو نیست و نابود کرنے پر آمادہ و تیار تھے۔ اندرون سلطنت معاشی بدحالی،
نظم و نسق میں ابتری اور یورپی سازشوں نے مفلسی، بے چینی، اضطراب اور انتشار کی کیفیت
پیدا کر دی تھی۔ اس کیفیت نے اضطراری اور انقلابی رجحانات کو جنم دیا۔ گویا ایک آتش فشاں اندر
ہی اندر سلگ رہا تھا۔ سلطان عبدالحمید نے ان حالات سے نمٹنے کے لیے جس فہم و فراست اور تدبر
و سیاست کا اظہار کیا وہ ان کی عظمت کا ثبوت ہے۔ بلاشبہ وہ سلاطین عثمانیہ کے عظیم تاجداروں
میں سے تھے اور عثمان، محمد ثانی اور سلیمان قانونی کے صحیح اور قابل فخر جانشین ثابت ہوئے۔

تخت نشینی کے وقت عبدالحمید کی عمر چونتیس سال تھی۔ عبدالحمید خاں ثانی ۲۲ ستمبر ۱۸۴۲ء
کو پیدا ہوئے۔ وہ سلطان عبدالمجید کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ ان کی والدہ قرمز گویان ایک
سرکیشین خاتون تھیں جو عبدالحمید کی پیدائش کے تھوڑے ہی دنوں بعد فوت ہو گئی تھیں۔ سلطان
کی تعلیم و تربیت سلطان عبدالمجید کی دوسری حرم 'جولا ولد تھیں' کے سپرد کی گئی۔ وہ بڑی دانا
اور نیکوکار خاتون تھیں، عبدالحمید کے پہلے اتالیق درباری ملا مصطفےٰ آفندی تھے اور پھر کمال
آفندی ان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ انھوں نے بہت کم عمر میں عربی اور فارسی پر عبور حاصل
کر لیا لیکن یورپی زبانوں میں انھوں نے بہت کم ترقی کی۔ بچپن ہی سے سلطان بہت نحیف المزاج،
کم گو اور شرمیلے تھے لیکن ان کی طبیعت میں فہم و فراست اور ذہانت و ذکاوت کوٹ کوٹ کر بھری
تھی۔ جوانی میں بھی وہ کسی قسم کے لہو لعب میں شریک نہیں ہوئے۔ ۱۸۶۸ء میں وہ اپنے چچا
سلطان عبدالعزیز کے ہمراہ یورپ کی سیر کو گئے اور بقول خود ان کے اس سفر نے ان کے
خیالات کو وسیع کرنے اور علمی لیاقت کو بڑھانے میں بڑی مدد دی۔ اپنی کم گوئی اور سادگی کی
وجہ سے اس شاہی دورے میں ان کی شخصیت بالکل پس پردہ رہی اور یورپ میں کسی کو یہ خیال
تک نہ ہوا کہ یہ نحیف اور کم سخن شاہزادہ ایک دن ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جائے گا
عنان سلطنت ہاتھ میں لیتے ہی متین، کم گو اور عزلت نشین شہزادے نے وہ مستعدی چستی اور لیاقت
خداداد ظاہر کی کہ ہر شخص حیران و ششدر رہ گیا۔ ان کی تخت نشینی پر سلطنت میں خوشی اور امید کی
لہر دوڑ گئی کیونکہ سلطان کی روشن خیالی اور اصلاحی رجحانات عام مشہور تھے۔ سلطان عبدالحمید ذہین
اور با اثر شخصیت کے مالک تھے اور ان کو سلطنت کی زبوں حالی کا پورا پورا علم تھا۔ ذہنی طور پر وہ

ان حالات سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ حالات کا صحیح تجزیہ کرنے کے باوجود ان کو اپنے مقاصد میں ناکامی ہوئی۔ ان کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ صرف مطلق العنانی اور مرکزی نظام حکومت کے ذریعے ہی سلطنت کے بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالا جا سکتا ہے لیکن فہم و فراست کے باوجود سلطان عبدالحمید حالات کا رخ نہ موڑ سکے۔ ان کی شخصی حکومت مطلق العنانی میں تبدیل ہو کر رہ گئی اور ان کی آمریت جو بلاشبہ وقت اور حالات کے لیے موزوں و مناسب تھی، جور و استبداد کی داستان بن گئی۔ فکری و عملی آزادی سلب ہو گئی اور ظلم و ناانصافی کا دور دورہ ہو گیا۔

سلطان عبدالحمید ایک ماہر و شاطر سیاست داں تھے اور سیاسی چالبازیوں اور سازبازمیں یورپی سیاست داں ان سے مات کھاتے تھے۔ لیکن سلطان کی تمام تر کوششیں اور سیاسی چالیں تنکے کا سہارا تھیں اور وہ ایک مات کھائے ہوئے کھلاڑی کی طرح قدم بقدم پسپا ہو رہے تھے۔ ان کی تدبیر اور فہم و فراست محض ایک مہلت تھی۔ سلطان عبدالحمید کی سیاست شمع کی آخری لو تھی۔ سلطنت کے یورپی مقبوضہ جات ہاتھ سے نکل چکے تھے مصر اور ٹیونس سے عثمانی اقتدار مٹ چکا تھا۔ فرانسیسی مراکو میں قدم جما رہے تھے، آسٹریا بلقان کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اور روس کا زبردست دباؤ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ بالآخر مسرور و شاداں دنیائے مسیحیت عالم اسلامی پر غالب آ رہی تھی۔

انسان کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو وہ وقت اور زمانے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاریخ کا سیلاب انسانی کوششوں سے نہیں رک سکتا۔ ہر وہ انسان جو زمانے کا مقابلہ کرتا ہے ناکامی کا منہ دیکھتا ہے اور اس کی ہر خوبی برائی بن جاتی ہے۔ سلطان عبدالحمید تاریخ کے اس موڑ پر کھڑے تھے جہاں واقعات و حالات کا سیلاب گراں بہہ نکلا تھا۔ وہ اپنے ملک کو بچانا چاہتے تھے مگر تاریخ انسانی کا ایک نیا دھارا پھوٹ پڑا تھا۔ ناکامی و بدنامی ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ سلطان عبدالحمید کو غالباً خود بھی اپنی ناکامی کا احساس تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کی تمام کوششیں رائیگاں ہوں گی اور وہ نئے نظریات و خیالات کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ غالباً اس احساس ناکامی ہی نے ان کو انتہائی شکی مزاج بنا دیا تھا، اور ان کو اپنے مشیروں اور حکام پر اعتماد قائم نہ رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ہر شعبے پر اپنا ذاتی اقتدار بڑھاتے گئے۔ خیالات و نظریات کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ان کو خوفزدہ کر دیا۔ دور حکومت کے آخری سالوں میں اس خدشے اور سراسیمگی نے ان کی فراست، دانشمندی، قوت ارادی اور

انتھک قوت کارکردگی پر برا اثر ڈالا۔

قوم پروری کا نظریہ مغرب سے پھیلا تھا اور ایک ایسی سلطنت جس میں مختلف النوع اقوام ایک آمری نظام کے تحت متحد تھیں، یہ نظریہ سم قاتل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر ایک دفعہ قوم پرست نظریات قدم جما لیتے تو سلطنت کا شیرازہ بکھر جانا لازمی امر تھا۔ درحقیقت سلطنت عثمانیہ کا یہی حشر ہوا۔ لہٰذا سلطان عبدالحمید نے جس شد و مد اور سختی سے قوم پرستی کی مخالفت کی وہ قابل فہم ہے انھوں نے اسی لیے ہر اس تحریک اور کارروائی کو کچلنے کی کوشش کی جس سے قوم پروری کے نظریات کو تقویت پہنچنے کے امکانات تھے۔ "جوانان ترک" کی مخالفت اور "وطن" جیسے الفاظ کے ذکر پر پابندی کی یہی بڑی وجہ تھی۔ اسلام کا سیاسی نظام عالمگیر اخوت پر مبنی ہے اور وہ قوم پرستی اور جغرافیائی حدود کا قائل نہیں، عالمگیر اخوت کی بجائے قوم پرستی کے نظریے کو تسلیم کر لیا جائے تو اسلام کا نظریہ حیات اور سیاسی نظام بے معنی ہو جاتا ہے۔ مغرب کی قوم پرستی کے خلاف سلطان عبدالحمید نے اسلام کی اخوت کو استعمال کرنا چاہا اور دم توڑتے ہوئے نظریات و تصورات میں از سر نو زندگی ڈالنے کی کوشش کی۔

پرانی اور سسکتی ہوئی اقدار کو سنبھالنے اور جلا دینے کی کوششوں میں سلطان عبدالحمید ضروری اور اہم امور پر توجہ نہ کر سکے۔ فوری اصلاحات جو وقت و حالات کا مناسب و معقول تقاضہ تھیں جاری نہ کی جا سکیں۔ حالات نے بھلائیوں کو برائیوں میں بدل دیا۔ اسکولوں میں جدید سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی مگر اب نئے نظریات کچل دیئے گئے۔ فوجی اصلاحات شروع ہو چکی تھیں، مگر بیرونی معلمین کا کام روک دیا گیا۔ جو ترک افسر بیرونی ممالک سے تربیت حاصل کر کے آئے تھے ان کو دور دراز علاقوں میں متعین کیا گیا۔ بحری بیڑہ آبنائے فاسفورس میں لنگر انداز کر دیا گیا، جہاں وہ کھڑے کھڑے زنگ آلود ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ یورپی خیالات نہ پھیل سکیں اور عوام الناس ان سے ناواقف رہیں۔ سلطان عبدالحمید نے ہر اس گوشے، ہر اس شگاف کو سربمہر کرنے کی کوشش کی جہاں سے مغربی افکار و نظریات کی روشنی سلطنت میں آ سکتی تھی۔

تنہا، سراسیمہ، مایوس اور دل برداشتہ سلطان نے اپنے کو قصر یلدیز میں محصور کر لیا۔ ان کو کسی پر اعتماد و بھروسہ باقی نہ رہا تھا۔ ہر سو ان کی مخالفت بڑھ رہی تھی اور ان کی جان

خطرے میں تھی۔[1] لیکن جوں جوں مخالفت بڑھتی گئی سلطان اتنی ہی ضد، مستقل مزاجی اور شدت سے اپنے معین کردہ راستے پر گامزن رہے۔

سلطان عبدالحمید کی حکمت عملی اور سیاست، مطلق العنانی (استبداد) اور اتحاد اسلامی کے اصولوں پر مبنی تھی۔

سلطان عبدالحمید سے قبل حالانکہ عثمانی سلطانوں کے اقتدار و اختیارات پر کسی قسم کی پابندی یا رکاوٹ نہ تھی لیکن ان کے پیش رو سلاطین حکومت کے کاروبار میں کم ہی مداخلت کرتے تھے۔ سلطنت کا نظم ونسق اور کاروبارِ حکومت صدرِ اعظم کے ذمے تھا جو وکیل مطلق سمجھا جاتا تھا۔ سلطان عبدالمجید اور عبدالعزیز کے عہد حکومت میں تمام تر قوت و اقتدار درسعادت کے ہاتھوں میں آچکا تھا حتیٰ کہ قصر شاہی پر بھی صدر اعظم کا حکم چلتا تھا۔

سلطنت کی سیاسی، معاشی اور فوجی بدحالی اور انحطاط نے درسعادت کے اقتدار کو بھی زک پہنچائی۔ یورپی نمونے پر قائم کردہ آئین اور پارلیمنٹ کے قیام کے باوجود مدحت پاشا اور ان کے رفقا کی کوششیں چند روزہ عارضی تدبیریں ثابت ہوئیں جن کی آڑ میں سلطان عبدالحمید نے اپنے عزائم کو پروان چڑھایا۔ سلطان درسعادت کی قوت کو توڑ کر اپنا ذاتی اقتدار اور تسلط قائم کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے قصر شاہی کو فوقیت اور برتری دینی شروع کی۔ اپنے مقصد کی حصولیابی کے لیے انھوں نے جس سخت قوت ارادی، الوالعزمی اور رغائت ملکداری کا ثبوت دیا وہ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بہترین مثال ہے۔ کئی صدر اعظم اور کئی وزارتیں آئیں اور چلی گئیں اور درسعادت کے اختیارات سلطان کے ہاتھوں سلب ہوتے چلے گئے۔ بالآخر سلطنت کے فوجی اور شہری نظم ونسق کے مکمل اختیارات قصر یلدز میں گوشہ نشیں سلطان کے ہاتھوں میں آگئے۔ سلطنت کے گوشے گوشے میں سلطان کے جاسوس اور مخبر پھیل گئے۔ تحریر و تقریر پر بھی پابندیاں لگادی گئیں۔

مکمل مطلق العنانی کا حصول اور قیام سلطان عبدالحمید کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔ اس

---

[1] ۲۱ جولائی ۱۹۰۵ء بروز جمعہ جب سلطان نماز جمعہ پڑھ کر مسجد سے نکلے تو ان پر بم پھینکا گیا جس کے نتیجے میں ۱۷ افراد ہلاک ہوئے یہ مقدونیہ کے آرمینوں کی سازش تھی۔

Vol. 48 1972 No. 1-2

THE QUARTERLY

Urdu

A JOURNAL DEVOTED TO URDU LANGUAGE, LITERATURE, CRITICISM AND RESEARCH

Published By

THE ANJUMAN TARAQQI-E-URDU

BABA-E-URDU ROAD, KARACHI-1

(PAKISTAN)

Rs. 4.00 Per Copy